مسیحی مسائل

از

پادری ولیم میچین، ایم۔ اے

ایس۔ پی۔ سی۔ کے
سنہ ۱۹۵۵ء

فہرست

تمہید

جب کوئی شخص علم الٰہی پر ایسی کتاب لکھنا چاہتا ہے جس میں یا تو مفصل یا مختصر طور پر تمام مذہبی مسائل بیان کئے جائیں تو یہ مشکل درپیش ہوتی ہے کہ کتاب کس ترتیب سے لکھی جائے۔ خادم کا یقین ہے کہ مسیحی تعلیم یہ نہیں کہ انسان غور و فکر کرنے سے معلوم کر سکتا ہے کہ خدا کون اور کیسا ہے۔ اور پھر مسیحی دین اس کے خیالات کو روشن کرتا ہے۔ اور بعض کو صحیح اور بعض کو غلط ثابت کرتا ہے۔ برعکس اس کے خداوند یسوع مسیح کے سوا اور کسی نے خدا کو ٹھیک طور پر ظاہر نہیں کیا۔ "فضل کا کلمہ خداوند یسوع مسیح کا فضل۔ خدا کی محبت اور روح القدس کی شراکت" اس بات کی طرف صاف اشارہ کرتا ہے۔ کیونکہ ہم خدا کی محبت اور روح القدس کی رفاقت خداوند یسوع مسیح کے فضل ہی سے معلوم کرتے ہیں۔

بہرحال مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علم الٰہی کے رسالہ کا آغاز خدا سے ہو اگرچہ شروع میں ایسی ایسی باتیں بتائی جائیں گی جن کی بنیاد اور دلائل بعد کے حصوں میں لکھی جائیں گی۔ تو بھی چونکہ خدا کا علم کتاب مقدس سے حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے شروع میں الہام اور پاک بائبل پر غور کرنا پڑے گا۔

اس کے بعد انسان اور اس کی ضرورتوں کا ذکر کیا جائے گا۔ پھر خدا کی بادشاہی، مسئلہ تجسم اور نجات۔ پاک روح اور ثالوث۔ کلیسیا۔ فضل کے وسیلے اور آخر میں موت۔ عدالت اور آنے والے جہان کا بیان کیا جائے گا۔ خادم کوشش کرے گا کہ بائبل کے حوالے بھی پیش کرے تاکہ ظاہر کرے کہ وہ محض اپنے خیالات نہیں بلکہ کتاب مقدس کی تعلیم پیش کرتا ہے۔

خادم کے معزز دوست جناب پادری عمانوئیل صادق صاحب نے اس کتاب کا مضمون تجویز کیا اور آپ کی مدد کے بغیر یہ کبھی اچھی طرح سے تمام نہ ہو سکتی تھی۔

باب اوّل

خُدا

دیباچہ۔ کیا خدا ہے؟ پہلی نظر میں ایسا معلوم نہیں ہوتا۔ "خدا کو کسی نے کبھی نہیں دیکھا۔" (یوحنا ۱: ۱۸۔ ۱ یوحنا ۴: ۱۲) + بہرحال زیادہ تر انسان خُدا کی ہستی کے قائل ہیں اور اسے کسی نہ کسی طور پر مانتے ہیں + اس باب میں مختصراً یہ بتایا جائے گا کہ خدا کی بابت مسیحی دین کی تعلیم کیا ہے۔

فصل اوّل

کتاب مقدّس (بائبل) الہام

دین پر غور کرتے وقت ایک عام غلطی یہ ہوتی ہے کہ لوگ پہلے اپنی معلومات کی بنیاد پر اور اپنی عقل کے زور سے فیصلہ کرتے ہیں کہ کیا ہونا چاہیئے۔ پھر وہ اپنا خیالی معیار بنا کر دین اور اس کے مسئلے جانچتے ہیں۔ ایسا کرنا غلط تعلیم اور بدعت کا باعث ہوتا ہے۔ اس کے برعکس سب — پہلے ہم کو معلوم کرنا چاہیئے۔ کہ حقیقت

کیا ہے۔ اور اسی پر اپنے خیالات اور اپنا ایمان قائم کرنا چاہیئے۔

الہام اور بائبل کے حق میں بہت سے لوگوں نے پہلے سے فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر الہامی کتاب ہے تو یوں یوں ہوگی اور پھر یا تو بائبل کو ایسا ہی سمجھا۔ یا جب معلوم کیا ہے کہ بائبل ان کے خیال کے مطابق نہیں تو اسے رد کیا ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ اس قسم کا خیال کرنے والا خدا کی جگہ ہو کر فیصلہ کرتا ہے کہ الہام اس طرح دیا جائے۔ مگر یہ وہم کفر سے دور نہیں۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم کو معلوم کرنا چاہیئے کہ ہماری مقدس کتاب خود کیا دعویٰ کرتی ہے اور حقیقت میں کس کی کتاب ہے۔ پیشتر سے یہ فیصلہ کر دینا کہ بائبل الہامی کتاب ہے تو ہر طرح کے علم کا مخزن ہوگی یا اس کی ہر ایک بات (نہ صرف اس کی تعلیم بلکہ اس کے الفاظ بھی) خدا نے بطور املا لکھوائی ہوگی۔ یہاں تک کہ جس شخص پر الہام آیا وہ گویا روح القدس کا قلم یا ٹائپ رائیٹر ہوگا غلطی ہے +

بائبل اپنے بارے میں کیا دعویٰ کرتی ہے؟ "ہر ایک صحیفہ جو خدا کے الہام سے ہے تعلیم اور الزام اور اصلاح اور راستبازی میں تربیت کرنے کے لئے فائدہ مند بھی ہے تاکہ مرد خدا کامل بنے اور ہر نیک کام کے لئے بالکل تیار ہو جائے" (۲ تم ۳: ۱۹) + اسی باب کی پندرھویں آیت میں یہ مرقوم ہو چکا ہے کہ" تو اُن پاک نوشتوں سے واقف ہے جو تجھے مسیح یسوع پر ایمان لانے سے نجات حاصل کرنے کے لئے دانائی بخش سکتے ہیں"۔ خود ہمارے خداوند نے یہودیوں سے فرمایا: "تم کتاب مقدس میں ڈھونڈتے ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور یہ وہ ہے جو میری گواہی دیتی ہے"۔ (یوحنا ۵: ۳۹) + ان آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ پرانا عہدنامہ روحانی

اور اخلاقی تعلیم کے لئے مفید ہے اور نیز خداوند یسوع مسیح کا گواہ بھی ہے۔
پرانے عہدنامے کی حقیقت یہی ہے۔ اس سے تجاوز کرنا بڑی غلطی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ خداوند یسوع مسیح نے نہ صرف شریعت کے حکموں کی تکمیل کی اور ان کا روحانی مطلب ظاہر کیا۔ بلکہ اس کی ترمیم بھی کی۔ "تم سن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا تھا .... لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں۔"
(متی ۵: ۲۱ سے ۴۸ تک)۔

عہدنامۂ عتیق اس لئے نہیں لکھا گیا اور خدا نے اُسے اس لئے محفوظ نہیں رکھا کہ اس سے تواریخ اور سائنس کے علوم سے واقفیت ہو بلکہ اس لئے کہ عبرانیوں کو روحانی اور اخلاقی تعلیم حاصل ہو اور وہ مسیح کی آمد کے لئے تیار کئے جائیں۔
اس کے پڑھنے سے ہم معلوم کرتے ہیں کہ عبرانی لوگ دنیا کی پیدائش اور خدا کے بارے میں اور اپنی پرانی تاریخ کی بابت کیا مانتے ہیں اور ہم یہ بھی سیکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے اس قوم کے ساتھ کیا برتاؤ کیا۔ کس طرح اس نے ان کے جدِ امجد ابرہام کو اُور اور حاران سے بلایا اور بہت برسوں کے بعد کس طرح بنی اسرائیل کو قوی بازو اور بڑھائے ہوئے ہاتھ سے موسیٰ کے وسیلہ سے مصر سے نکالا۔ ان کو شریعت بخشی۔ ان کو کنعان میں بسایا۔ ان کے پاس نبی بھیجے جنہوں نے اس قوم کو جو بت پرستی اور شرک کی طرف مائل تھی وحدت کا سبق سکھایا اور کس طرح خدا نے اسرائیلیوں کو ایسی تادیب اور تربیت کی کہ وہ پھر کبھی بت پرستی کی طرف راغب نہ ہوئے۔

علاوہ بریں پرانے عہدنامے کے پڑھنے سے ہمیں یہ فوائد حاصل ہوتے ہیں:۔

۱۔ ہم اس میں مسیح موعود کے آنے اور دکھ سہنے کی پیشین گوئیاں جو نبیوں کے ذریعہ کی گئیں پاتے ہیں (یسعیاہ ۵۳)

۲۔ اس میں ہم کو عمدہ اور اعلیٰ پیمانہ کی اخلاقی اور روحانی تعلیم ملتی ہے جس کو نئے عہدنامہ میں دہرانے کی ضرورت نہ تھی۔

۳۔ نئے عہدنامہ میں جہاں کہیں قربانی اور کفّارہ کی تعلیم پائی جاتی ہے۔ وہ پرانے عہدنامہ کی روشنی میں اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے۔

۴۔ دعا۔ مناجات۔ عبادت اور الہٰی حمد و تمجید کے اصول زبوروں میں ملتے ہیں۔

پرانا عہدنامہ خدا کے بارے میں کیا تعلیم دیتا ہے؟ یہ سوال نہایت اہم ہے۔ جب مسیحی دین ایشیا رکوچک شام اور یوروپ میں پھیل گیا تو اس کا سابقہ یونانی فلسفہ سے ہوا اور بہت سے یونانی مسیحی دین میں داخل ہوئے۔ نیز اس زمانہ میں بحر روم کے کنارے کے اکثر ملکوں میں پڑھے لکھے لوگ یونانی بولتے اور پڑھتے تھے اور یونانی علوم و فنون کی تعلیم پاتے تھے۔ لہٰذا خدا کے بارے میں یونانی فلسفہ کی تعلیم جو بہت سی باتوں میں ہندو مت کی تعلیم کی مانند تھی مسیحی خیالوں پر اثر ڈالنے لگی۔ یونانیوں کا گمان تھا کہ خدا کی اعلیٰ صفات حکمت (علم) ہیں۔ وہ تمام تغیّرات سے بری ہے۔ وہ خیال کرتے تھے کہ خدا کسی قسم کے واقعہ سے اثر پذیر نہیں ہوسکتا بعض مسیحی عالموں نے جو یونانی تھے، مسیح کی اذیّت کو حقیقی مانا۔ ہر زمانہ میں نہ صرف ہندوستان میں بلکہ اور ملکوں میں بھی اس بات کا اندیشہ رہتا ہے کہ مسیحی اس قسم کے غلط خیالوں میں پھنس جائیں۔ وہ پیشتر سے از روئے فلسفہ فیصلہ کرتے

ہیں کہ خدا یوں یوں ہے۔ اور پھر بائبل کی تعلیم کو توڑ موڑ کر اپنے خیالات کے موافق سمجھتے اور سمجھاتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ جب تک خدا اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرتا انسان اس کی نسبت کوئی صحیح خیال پیدا نہیں کرسکتا۔ اور یہ بھی فراموش کرتے ہیں کہ ہمیں خدا کے مکاشفہ کے مطابق اپنے خیالات کو درست کرنا ہے۔

عبرانیوں نے پرانے عہدنامہ میں خدا کی ہدایت سے یہ سیکھا کہ خدا ایک زندہ خدا ہے یعنی وہ صاحب ارادہ اور صاحب عمل ہے۔ نیز وہ سارے جہان کا خالق ہے۔ وہ پاک یعنی ساری بُرائی نقص اور کمی سے دور ہے۔ وہ راست اور محبت کرنے والا ہے۔ وہ غفور تو ہے پر منصف بھی ہے۔ اور گنہگار کو ہرگز بے گناہ نہ ٹھہراتا ہے۔ وہ قہر کرنے میں دھیما تو ہے پر قہر کرتا ہے۔ اگرچہ وہ انسان سے حد درجہ بڑا ہے اور لامحدود ہے۔ تو بھی اس نے انسان میں اپنی روحانی مشابہت پیدا کی ہے۔ (عہدنامہ جدید ان باتوں کی تصدیق کرتا ہے)

(دیکھو پیدائش ۱: ۲۶ اور ۵: ۱، خروج ۲۰: ۵ اور ۳۴: ۵ سے ۷ تک گنتی ۲۳: ۱۹، استثنا ۴: ۲۴، یرمیاہ ۱۰: ۱۰، زبور ۴۲: ۲، یسعیاہ ۴۵: ۸، پیدائش ۱: ۱، یسعیاہ ۴۰: ۲۶، زبور ۱۰۲: ۲۵، یسعیاہ ۴۵: ۹ اور ۱۲، احبار ۱۹: ۲، یسعیاہ ۶: ۳، زبور ۸۹: ۱۸ زبور ۹۹: ۹ اور ۷۶) زبور ۱۱۹: ۱۳۷ زبور ۹۶: ۶ زبور ۱۷: ۱۵ اور ۱۹ یسعیاہ ۳۰: ۱۸ یسعیاہ ۱۱: ۴) یرمیاہ ۳۱: ۳ استثنا ۱۰: ۱۸ زبور ۱۰۳: ۸ زبور ۶۹: ۱۶ یرمیاہ ۹: ۲۴ زبور ۹۹: ۱۳، زبور ۹۸: ۹ زبور ۸۹: ۱۴ استثنا ۲۹: ۲۳) استثنا

۶ و ۱۵ ۔ یسعیاہ ۴۵: ۳ ، یرمیاہ ۳۲: ۳ یسعیاہ ۱۳: ۹ ملاکی ۳: ۱۱ سے ۳ تک زبور ۹۲: ۱۱ اور ۱۲)

(ہدایت :۔ ناظرین حوالہ دار بائبل کا استعمال کریں اور حاشیہ میں دیئے ہوئے حوالوں کو دیکھیں ۔]

بعض لوگ اس بات سے گھبرا جاتے ہیں کہ پیدائش کی کتاب کے شروع کے بابوں میں جو تخلیق کی تفصیل دی گئی ہے وہ موجودہ سائنس کے مطابق نہیں معلوم ہوتی ۔ یاد رہے کہ :۔

۱ ۔ یہ باتیں سائنس سکھانے کو نہیں بلکہ کم علم لوگوں کو یہ سکھانے کے لئے لکھی گئیں کہ خدا خالق ہے اور انسان گنہگار ہے ۔ اگر وہ تفصیل موجودہ علم کے مطابق لکھی گئی ہوتی تو ابتدائی زمانہ کے لوگوں کی سمجھ میں ہرگز نہ آتی ۔

۲ ۔ دورِ حاضرہ کی سائنس میں علم اور بے علمی سچائی اور غلط فہمی ملی ہوئی ہیں ۔ یہ دعویٰ کرنا کہ الہامی کتاب مروّج خیال کے مطابق ہونا چاہیئے محض نادانی ہے ۔

۳ ۔ اگر بفرضِ محال پیدائش حقیقت کے مطابق جیسا خدا تعالیٰ اُسے جانتا ہے لکھی جاتی تو یقیناً کوئی انسان اس کو کبھی نہ سمجھتا ۔

دورِ حاضرہ میں علما نے عہد نامہ عتیق کی کتابوں کی بابت بہت کچھ نئے نئے خیالات نکالے ہیں اور نیا علم حاصل کیا ہے ۔ مثلاً بائبل کی پہلی پانچ کتابیں موسیٰ کی کہلاتی ہیں مگر یہ بائبل میں کہیں نہیں لکھا ہے کہ موسیٰ نے ان کو لکھا ۔ اور چند مضامین سے ثابت ہوتا ہے ۔ مثلاً استثنا ۳۴: ۱ سے ۷ تک جہاں موسیٰ کی موت کا ذکر ہے ۔ اس جدید تنقید سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے ۔

نئے عہدنامہ اور پرانے عہدنامہ میں یہ رشتہ ہے کہ پرانے عہدنامہ کے اقتباسات اور اس کے سلسلۂ بیان کی تکمیل مسیح کی آمد اور اس کے کام سے ہوتی ہے یعنی پرانا عہدنامہ نئے عہدنامہ کی تیاری ہے۔

نئے عہدنامہ میں خداوند یسوع مسیح کی پیدائش تعلیم۔ زندگی۔ موت قیامت اور صعود کا بیان ہے۔ اور نیز اس میں وہ مکتوبات شامل ہیں جن میں حواریوں نے مسیح کی تعلیم کی تصریح کی اور مسیح کے کاموں کا مطلب بتایا۔ نیز رسولوں کے اعمال کی کتاب میں قدیم کلیسیا کے شروع اور روح القدس کے کاموں کا ذکر ہے۔ عہدنامۂ عتیق آدمیوں کو خداوند یسوع مسیح تک پہنچاتا ہے۔ پر عہدنامۂ جدید انھیں مسیح سے ملاتا ہے۔ پرانے عہدنامہ میں جو تواریخی بیان ہے اگر اس میں کہیں کہیں غلطی ہو تو فکر کی بات نہیں۔ کیونکہ یہ عبرانیوں کے خیالات ہیں۔ اگر نئے عہدنامہ کے تواریخی بیان میں بڑی غلطیاں ہوتیں یہاں تک کہ ہم ان پر بھروسہ نہ کرسکتے تو دین عیسوی کی بنیاد اکھڑ جاتی۔ کیونکہ مسیحی دین کا دارومدار مسیح کے کاموں۔ زندگی۔ موت۔ جی اٹھنے اور آسمان پر چڑھ جانے پر ہے۔

خدا کا شکر ہو کہ نئے عہدنامہ کے متعلق ایسی شہادتیں موجود ہیں جو قدیم تاریخ کے کسی واقعہ کے متعلق نہیں ملتیں۔ روایت ہے کہ یوحنا کی انجیل جو سب کے بعد یوحنا کے بڑھاپے میں لکھی گئی۔ تقریباً ۹۵ء میں لکھی گئی حال میں اس کا ایک نسخہ مصر میں برآمد ہوا جو دوسری صدی کے پہلے حصہ میں لکھا گیا تھا۔ وہ نامکمل ہے مگر یوحنا کی انجیل کا اتنا حصہ موجود ہے جس سے معلوم ہوا کہ وہ انجیل اس وقت موجود تھی۔ اور اس میں وہی بیانات تھے جو اور نسخوں میں پائے جاتے

ہیں۔اس بنا پر ہم نئے عہدنامہ کے بیانات پر بھروسہ رکھ سکتے ہیں۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ پہلی تین اناجیل چوتھی انجیل سے پیشتر لکھی گئیں۔اور خطوط خاص کر پولوس کے خطوط انجیلوں سے پیشتر لکھے گئے۔صرف ایک کتاب ہے جس کو شروع سے بہت سے علماء مشکوک سمجھتے ہیں یعنی جو پطرس کا دوسرا خط کہلاتا ہے۔

عہدنامۂ جدید کی تاریخی صحت پر کیوں اس قدر زور دیا گیا ہے؟ بعض لوگ جو اپنے آپ کو مسیحی مانتے ہیں۔کہتے ہیں کہ اگرچہ انجیل جلیل کے بیانات تواریخی نہیں تو بھی کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ اس سے دین عیسوی کی تعلیم میں کوئی فرق نہیں آتا۔بعض ہندو جو مسیح کی عزت کرتے ہیں۔اس طرح کی باتیں کرتے ہیں مگر یہ ٹھیک نہیں ہے۔اول مسیحی عقائد ناموں پر غور کریں۔مثلاً رسولوں کا عقیدہ۔اس میں زیادہ تر واقعات (یعنی خدا کے کاموں) کا بیان ہے "میں ایمان رکھتا ہوں .... خداوند یسوع مسیح پر ...... جو کنواری مریم سے پیدا ہوا۔پنطیس پلاطوس کے عہد میں دکھ اٹھایا مصلوب ہوا۔مرگیا۔دفن ہوا۔عالم ارواح میں اتر گیا۔تیسرے دن مردوں میں سے جی اٹھا۔آسمان پر چڑھ گیا۔اور خدا باپ کے دہنے بیٹھا ہے۔وہاں سے وہ زندوں اور مردوں کی عدالت کو آئے گا"۔ اس میں اور نیز نکائیہ کے عقائد نامہ میں ایسی ایسی باتیں پائی جاتی ہیں جو واقعہ ہو چکیں یا وقوع میں آنے والی ہیں۔اگر نئے عہدنامہ کی تواریخ ایسی نہیں جیسی کہ بیان کی گئی ہے "تو مسیح نہیں جی اٹھا۔اور اگر مسیح نہیں جی اٹھا تو تمھارا ایمان بے فائدہ ہے۔تم اب تک اپنے گناہوں میں گرفتار رہے...... اگر ہم ایسی زندگی میں مسیح میں امید رکھتے ہیں تو سب آدمیوں سے زیادہ بد نصیب ہیں (۱کرنتھیوں ۱۵باب ۱۴ اور ۱۷ اور ۱۹ آیات)

نئے عہدنامہ پر مسلمانوں کا یہ اعتراض کہ مسیحیوں نے اس کے الفاظ بدل ڈالے ہیں بالکل خام ہے کیونکہ محمد صاحب کی پیدائش کے سینکڑوں برس پہلے کے نسخے موجود ہیں جن کا مقابلہ کرنے سے متن کی صحت ثابت ہوتی ہے لیکن کسی مقام پر کوئی ایسی غلطی یا سہو نہیں ملتی جس سے کسی مسئلے یا کسی اہم واقعہ کی بابت کچھ شک پیدا ہو۔ مسلمان یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن نے انجیل اور دیگر الہامی کتابوں کو منسوخ کر دیا جیسا کہ وہ مانتے ہیں کہ قرآن کی بعض آیتیں منسوخ ہوئیں۔ پھر اگرچہ عہدنامۂ جدید نے عہدنامۂ عتیق کے کئی مضمونوں کو بدل ڈالا تو بھی اس طور پر بدل دیا۔ کہ ان کی روحانی تعلیم کی تکمیل کر دی (دیکھو متی ۵: ۱۷ سے آخر تک) اور ان مضمونوں کو منسوخ نہ کیا۔ خدا انسان نہیں کہ اپنی مرضی بدلے یا کبھی کچھ تعلیم دے کبھی کچھ۔ لیکن خدا نے جس قدر آدمی کو زیادہ اچھی اور روحانی تعلیم سمجھنے اور قبول کرنے کے لائق بنایا۔ اسی قدر اپنے پاک نبیوں کی زبانی ان کو زیادہ تعلیم دی۔ جب طالب علم اونچے درجوں میں پہنچ جاتا ہے تو الف بے اور پہاڑا ہرگز نہیں پڑھتا لیکن الف بے اور پہاڑا منسوخ نہیں ہوتے کیونکہ وہ اس کی تعلیم کی بنیاد ہیں۔ شریعت اور انبیاء کے صحیفے منسوخ نہیں ہوئے۔ کیونکہ پرانے عہدنامے کی تعلیم نئے عہدنامے کی بنیاد ہے۔

خدا کی بابت عہدنامۂ جدید کیا سکھاتا ہے۔؟ جو تعلیم پرانے عہدنامہ میں ملتی ہے وہ نئے عہدنامہ میں بھی ملتی ہے۔ مگر بعض اُن باتوں پر زور دیا جاتا ہے جن کا ذکر پرانے عہدنامہ میں کم ملتا ہے۔ پرانے عہدنامہ میں خدا صرف چھ سات دفعہ باپ کہلاتا ہے۔ اور جب باپ کہا جاتا ہے تو اسرائیل پر زور دیا جاتا ہے۔ مثلاً یرمیاہ ۳۱: ۹ "میں اسرائیل کا باپ ہوں" یا یسعیاہ ۶۳: ۱۶ "یقیناً تو ہمارا باپ ہے اگرچہ ابراہام سے

ناواقف ہو اور اسرائیل ہم کو نہ پہچانے " لیکن نئے عہدنامہ میں خدا ہمارا باپ یعنی مردِ انسان کا باپ بار بار کہلاتا ہے۔ نہ صرف ہمارے خداوند نے اپنے شاگردوں کو سکھایا کہ خدا کو اپنا باپ کہیں (وہ یہودی تھے) بلکہ خطوط میں بھی خدا باپ کہا جاتا ہے۔ اور ان میں سے اکثر ایسے ایسے لوگوں کو لکھے گئے جن میں غیر یہودی تھے یا وہ سب غیر یہودی تھے۔ حوالے دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ اتنے زیادہ ہیں۔ پھر خدا کی محبت پر زور دیا جاتا ہے۔ توریت۔ زبور اور انبیا کے صحیفوں میں جب خدا کی محبت کا ذکر آتا ہے تو اکثر قرینہ سے ظاہر ہے کہ خدا بنی اسرائیل سے یا نیکوکاروں سے محبت رکھتا ہے۔ بلکہ کئی جگہوں میں بتایا گیا ہے کہ وہ بُرے لوگوں سے نفرت رکھتا ہے۔ نئے عہدنامہ میں بھی غضب الٰہی کا ذکر ہے۔ مثلاً متی ۳: ۷ (پھر یوحنا بپتسمہ دینے والا ایک معنی میں پرانے عہدنامہ کے نبیوں کا خاتمہ تھا) یوحنا ۳: ۳۶، رومیوں ۱: ۱۸؛ افسیوں ۵: ۶ اس کے ساتھ یہ خوشخبری دی گئی کہ خدا گنہگاروں سے محبت رکھتا۔ اسے بچانے کے لئے اسے ڈھونڈتا ہے۔ بلکہ خدا کی ذات محبت ہے (کھوئے ہوئے سکے، بھیڑ اور بیٹے کی تمثیلیں (۱۔ یوحنا ۴: ۸) علاوہ اس کے خداوند یسوع مسیح نے جو باپ کے ساتھ ایک ہے اپنی تعلیم زندگی، موت اور قیامت سے خدا کی محبت دکھائی۔ (یوحنا ۱۴: ۹؛ ۱۱: ۱۷؛ رومیوں ۵: ۸ وغیرہ) ان سب باتوں کی مفصل تشریح کی جائے گی۔

مسلمان علماء کے نزدیک خدا اپنا کلام بذریعہ وحی نازل کرتا ہے۔ یعنی اس کا ہر ہر لفظ خدا کی طرف سے نازل ہوتا ہے۔ اس کا دوسرا نام الہام باللفظ ہے۔ کیا مسیحیوں کو لازم ہے کہ بائبل کے حق میں ایسا ہی خیال کریں؟ بے شک

ایک زمانہ تھا کہ تقریباً سب مسیحی علماء کا یہ اعتقاد تھا لیکن مسیحی کلیسیا کے ابتدائی زمانہ میں ایسا نہ تھا۔ اس وقت یہ خیال تھا کہ کتب مقدسہ کے مضامین خدا کے الہام سے لکھے گئے پر جہاں تک معلوم ہو سکتا ہے یہ خیال نہ تھا کہ ہر لفظ کو روح القدس نے لکھایا۔

اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم سمجھیں کہ درحقیقت بائبل میں کس کا الہام پایا جاتا ہے بعض کا یہ گمان ہے کہ بائبل میں مسیحی دین کے تمام مسائل یا وہ مسائل جن پر عقیدے موقوف ہیں صاف جملوں میں لکھے گئے۔ اور ایسے جملے ملتے بھی ہیں۔ مثلاً "خدا محبت ہے" لیکن جس وقت رسولوں کا عقائدنامہ لکھا گیا یہ خیال نہ تھا۔ رنہ اس میں مسیحی تعلیم کا جو خلاصہ ہے۔ اس میں اس قسم کے جملے مندرج کئے جاتے مگر اس کا آدھا حصہ واقعات کا بیان ہے (جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے)۔

مسیحی عقیدہ یہ ہے کہ خدا ارادہ کرتا ہے۔ کام کرتا ہے۔ وہ سنتا ہے محبت رکھتا ہے + وہ "زندہ خدا" ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ بائبل کی تعلیم یہ ہے کہ خدا شخصی خدا ہے۔ پر شخصی خدا کا اظہار شخصوں پر ہوگا۔ کامل شخص اس دنیا میں ایک ہی آیا۔ یعنی خداوند یسوع مسیح۔ اس کی آمد سے پیشتر خدا کا اظہار غیر مکمل تھا۔ مسیح کے آنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ "خدا کو کسی نے کبھی نہیں دیکھا۔ اکلوتا بیٹا جو باپ کی گود میں ہے اسی نے ظاہر کیا" (یوحنا ۱: ۱۸) "اگلے زمانہ میں خدا نے باپ دادا سے حصہ بہ حصہ اور طرح بہ طرح نبیوں کی معرفت کلام کر کے اس زمانہ کے آخر میں ہم سے بیٹے کی معرفت کلام کیا . . . . وہ اس کے جلال کا پرتو اور اس کی ذات کا نقش

ہے" (عبرانیوں ۱: ۱-۳)۔ بائبل خود خدا کا مکاشفہ نہیں بلکہ اس کے مکاشفہ کا بیان ہے یعنی ایسے آدمیوں نے جن کی عقلوں کو خدا نے منور کیا ایسے واقعات کا مطلب سمجھ لیا جو خدا کی مرضی اور اس کی صفات کو ظاہر کرتے تھے مثلاً سموایل اور سلاطین کی کتابوں میں کسی گمنام نبی نے دکھایا کہ اسرائیلیوں اور ان کے پیشواؤں اور بادشاہوں کی تواریخ کس طرح سے خدا کی راستی اور اس کا انصاف ظاہر کرتی ہیں۔ بائبل کا ایک بڑا حصہ خدا کے کاموں کے بیانات سے معمور ہے۔ توریت کا بھی یہی حال ہے۔ اگر کسی شخص کو جو بائبل سے ناواقف ہو یہ بتایا جائے کہ بائبل کی پہلی پانچ کتابوں میں شریعت ہے تو ان کے دیکھنے سے متعجب ہوگا۔ کیونکہ تقریباً آدھا بیان تواریخی ہے۔ ایسی کتاب کی بابت یہ گمان کرنا کہ وحی سے لکھی گئی یا مسائل سے بھری ہے محض غلط ہے۔

درحقیقت چونکہ بائبل کی یہ تعلیم ہے کہ خدا شخصوں کی شخصیت کی قدر کرتا ہے اس لئے یہ خیال کہ خدا انسان کو مجبور کر کے اس کو قلم یا ٹائپ رائٹر کی طرح استعمال کرے گا ساری کتب مقدسہ کے مطلب کے خلاف ہے۔ (دیکھو مرقس ۱۲ باب ۲۷ آیت جس کا یہ مطلب ہے کہ خدا افراد کا خدا ہے۔ خروج ۳۳: ۱۱؛ یوحنا ۸: ۳۲ اور ۳۶؛ ۱ پطرس ۲: ۱۶)۔

بے شک پہلی نظر میں ہر مسلم سمجھیگا کہ وحی الہام سے بڑھ کر ہے مگر یہ خیال غلط ہے۔ اسلام کی تعلیم میں انسان بالکل آزاد نہیں۔ خداوند یسوع مسیح آدمیوں کو آزادی بخشنے کے لئے آیا۔ بہرکیف ہم یہ خیال نہ کریں کہ انسان خدا کی مدد کے بغیر اس کی معرفت حاصل کر سکتا ہے۔ انسان خدا کے بارے میں صرف اتنا ہی علم حاصل کر سکتا

ہے جتنا کہ وہ ظاہر کرنا چاہے۔ اس حد سے انسان تجاوز نہیں کر سکتا لیکن خدا کا جو مکاشفہ ہوا ہے اور ہوتا ہے وہ ایسا ہے جو شخصوں کے قبول کرنے کے لائق ہے۔ (یوحنا ۱:۱۸، ۲:۲۳ اور ۳:۳۴؛ گلتیوں ۲)۔

یہ خیال کرنا کہ بائبل کے سوا یا ان اشخاص کے سوا جن کا بائبل میں بیان ہے خدا اور کسی طرح ظاہر نہیں ہوا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ بیشک یہ کہنا کہ انسان اپنی عقل اور حکمت سے نظام قدرت سے خدا کو معلوم کر سکتا ہے ایک معنی میں درست ہے (جب ہم کو یاد رہتا ہے کہ انسان خدا کو اس لئے پا سکتا ہے کہ خدا نے ایسا انتظام کیا ہے کہ انسان اُسے معلوم کرے ورنہ خدا پوشیدہ رہتا)۔ بہر کیف یہ سچ ہے کہ خلقت کسی قدر مکاشفہ کا ذریعہ ہے۔ اور اگر خدا کا یہ عام مکاشفہ نہ ہوتا تو غالباً خاص مکاشفہ اور الہام ممکن نہ ہوتا۔ پولوس نے ہم کو بتایا کہ خلقت میں خدا نے اپنے آپ کو ظاہر فرمایا ہے۔ (رومیوں ۱: ۲۰)۔ اگر وجود مطلق میں کوئی شخصیت نہ ہوتی تو وہ شخصوں پر ظاہر نہ ہو سکتا۔ اور خاص مکاشفہ اور الہام کا امکان نہ ہوتا۔ الہام کے بارے میں اگلا سوال لازم آتا ہے کہ کیا الہام پہچاننے میں غلطی اور غلط فہمی کا امکان ہے؟ بیشک ممکن ہے۔ کوئی چیز کوئی خیال۔ کوئی طاقت ایسی اچھی نہیں کہ نادان اور گنہگار لوگ اس کو غلط طور پر استعمال نہ کر سکیں۔ انسان ناقص ہیں اور گنہگار اپنے گناہوں اور اپنی خودغرضی اور گھمنڈ کے سبب سے خدا کے اظہار کو غلط طور پر سمجھتے ہیں۔ پر جو کوئی عاجزی اور دعا کے ساتھ بائبل پر غور کرتا ہے، اُمید رکھ سکتا ہے کہ اس سے خدا کی مرضی معلوم کرے گا۔ فروتنی کی سخت ضرورت ہے اور چاہیئے کہ ہر شخص اپنے شخصی خیالات کو کلیسیا سے جانچ

کی تعلیم کے ماتحت رکھے۔ ورنہ خدا کا مکاشفہ اُسے نہیں ملے گا۔ نیک نیتی کی ضرورت بھی ہے۔ کیونکہ یوں لکھا ہے "اگر کوئی اس کی (یعنی خدا کی) مرضی پر چلنا چاہے تو وہ اس تعلیم کی بابت جان جائے گا۔ کہ خدا کی طرف سے ہے یا میں اپنی طرف سے کہتا ہوں۔" (یوحنا ۷: ۱۷) ۔ جو شخص اپنی ہی عقل پر بھروسہ رکھ کر اور مسیحیوں کے عام تجربہ اور کلیسیائے جامع کی تعلیم کو نظر انداز کرتا ہے اس کے گمراہ ہونے کا بڑا خطرہ ہے۔

جب علما پرانے اور نئے عہد ناموں کی جانچ اور چھان بین کرنے لگے تو بہتیرے مسیحی گھبرا گئے۔ اور ان کے گھبرا جانے کے کچھ سبب بھی تھے۔ کیونکہ تفتیش کرنیوالوں میں بعض اس بنا پر تحقیقات کرتے تھے کہ معجزے نہیں ہو سکتے اور اکثر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ پاک نوشتے غلط ہیں یا کم سے کم غیر معتبر۔ بہر کیف ان تحقیقات کی اشد ضرورت تھی کیونکہ بائبل کے تمام نسخوں کا مقابلہ کئے بغیر یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ موجودہ متن صحیح ہے یا نہیں۔ پھر ہر کتاب کے لکھے جانے کا موقعہ، اس کی تاریخ، اس کے لکھنے والے کا حال، اور ماحول سب خوب غور سے دریافت کئے بغیر یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ کتابیں معتبر ہیں یا نہیں۔ یہ بھی مدِ نظر رہے کہ ان تحقیقات کا مقصد یہ نہ ہونا چاہیئے کہ کلیسیا کی روایتیں سچی ثابت ہوں کیونکہ جب تحقیقات کا نتیجہ پہلے سے مقرر کر لیا جائے تو در حقیقت تحقیقات بے معنی ہو جاتی ہے۔ بلکہ محقق کا مقصد یہ ہونا ضروری ہے کہ حقیقت معلوم ہو جائے چاہے اس کے اپنے عقائد بدلنا پڑے۔ پس سو برس کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہم پاک نوشتوں کی بابت اپنے باپ دادا سے بہت زیادہ علم رکھتے ہیں۔ اب ہم جانتے ہیں کہ پاک نوشتے خاص کر عہد جدید کی کتابیں معتبر ہیں۔ نئے عہد نامہ کی صرف ایک

کتاب مشکوک رہی ہے یعنی "پطرس کا دوسرا خط" اور یہ کتاب سینکڑوں برس تک مشکوک مانی جاتی تھی۔

اس فصل کو ختم کرنے سے پہلے چند جملے لکھنا خالی از فائدہ نہ ہوگا۔

۱۔ بائیبل میں الہام نہیں بلکہ الہام کا بیان پایا جاتا ہے۔ زندہ کلام قانونوں کا مجموعہ نہیں۔ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ بائیبل ایک قسم کا معمہ ہے جس کو حل کرنے سے ہم کو آئندہ واقعات کا علم ملے گا وہ بائیبل کی بے توقیری کرتے ہیں۔

۲۔ خداوند یسوع مسیح پر ایمان رکھنے والے بائیبل کو (جس کو کلیسیا کے بندگوں نے لکھا اور جس کی حفاظت یہودی اور مسیحی کلیسیا نے کی) اس لئے الہامی مانتے ہیں کہ اس میں انھوں نے مسیح کو پایا اور پاتے رہتے ہیں۔ بائیبل کے تمام مضامین کا معیار اور ان کی منزل مقصود مسیح ہے۔

۳۔ پروفیسر ڈاڈ صاحب کے ایک قول سے اس فصل کو ختم کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ترجمہ:۔ خدا پاک نوشتوں کی گواہی اور ہمارے باطن میں پاک روح کی گواہی سے اپنے آپ کو ازلی مجسم کلام یعنی اپنے بیٹے مسیح میں ہم پر ظاہر فرماتا ہے۔ ہم اس کے اس اظہار کو ایمان سے قبول کر لیتے ہیں اور یہ ایمان خدا کی بخشش ہے۔ ہم اس کو کلیسیا کی زندگی کے تربیۃ میں قبول کرتے ہیں۔ اور کلیسیا مسیح کا بدن۔ نوشتوں کا محافظ۔ روح القدس کا مسکن ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ ہم کلیسیا کی شراکت میں نوشتوں کی تلاوت کرتے۔ مسیح کی انجیل کا اعلان سنتے اور سکرامنٹوں خاص کر عشائے ربانی میں شریک ہوتے ہیں تو خدا ہم سے ملتا اور ہم پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ہمارا باپ۔ ہمارا نجات دہندہ

ہمارا رب ہے "

فصل دوم

تخلیق

بائبل شریف میں خدا بار بار خالق کہلاتا ہے۔ دونوں عہدنامے اس امر میں متفق ہیں۔ مسئلۂ تخلیق کے بارے میں سب سے پہلے ہم سوچیں کہ وہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ مسئلۂ تخلیق کے ہم یہ معنی نہیں سمجھتے کہ خلقت خدا سے صادر ہے۔ یعنی یہ کہ وہ یونہی خدا سے نکلی ہے۔ بعض لوگوں نے یہ بھی سوچا ہے کہ چونکہ خدا خالق ہے، لہذا وہ خلق کرنے پر مجبور ہے۔ مگر یہ حقیقت نہیں ہے۔ خلقت کا وجود میں آنا خدا کے ارادہ پر منحصر ہے۔ اگر وہ خلق کرنا نہ چاہتا تو خلقت وجود میں نہ آتی۔

۱۔ جو ہندو لوگ ادویت مت کو مانتے ہیں ان کے خیال میں عالم و مافیہا محض مایا یا دھوکا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جو لوگ مادی دنیا کو حقیقت سمجھتے ہیں وہ دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔ وہ مایا میں پھنس گئے ہیں۔ مسیحی مسئلۂ تخلیق اس کے عین خلاف ہے۔ البتہ مسیحی دین یہ نہیں سکھاتا کہ مادی دنیا ازلی اور ابدی ہے۔ کلامِ حق میں آیا ہے: "دیکھی ہوئی چیزیں چند روزہ ہیں" (۲ کرنتھیوں ۴: ۱۸) لیکن حالانکہ وہ ازلی اور ابدی نہیں۔ تو بھی اچھی ہے۔ کوئی دھوکا دینے والی چیز اچھی نہیں ہوسکتی (دیکھو پیدائش ۱: ۳۱۔ ۱ تموتھیس ۴: ۴) خلقت خدا کی پیدا کی ہوئی ہے۔ بذاتِ خود حقیقی نہیں۔ اس کی ساری حقیقت خدا کی طرف سے ہے جس نے اسے خلق کیا۔

۲- انسان کا دماغ مخلوقات میں سے ہے۔ اگر خلقت محدود ہی ہے تو انسان کوئی سچا علم حاصل نہ کرسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ہندو یہ نہیں مانتے کہ انسان خدا کی بابت سچا علم حاصل کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو مت میں اس کے بارے میں طرح طرح کی تعلیم اور طرح طرح کے خیالات پائے جاتے ہیں۔ مسیحی دین کی تعلیم یہ ہے کہ انسان خدا کے بارے میں سب کچھ نہیں معلوم کرسکتا۔ لیکن اگرچہ انسان کا علم نامکمل ہے وہ جھوٹا نہیں ہے۔ (دیکھو ا کرنتھیوں ۱۳: ۱۲؛ رومیوں ۱۱: ۳۳، ۳۴؛ استثنا ۲۹: ۲۹؛ ا کرنتھیوں ۲: ۱۶؛ ایوب ۳۸ سے ۴۱ تک)۔

۳- پھر بائبل کی تعلیم یہ نہیں کہ خلقت خدا میں شامل ہے یعنی وہ مسئلہ "ہمہ اوست" نہیں سکھاتی۔ "ہمہ اوست" سکھاتا ہے کہ جو کچھ ہے خواہ مادہ خواہ روح سب کچھ خدا ہی ہے۔ یہ خیال دنیا میں بہت پھیلا ہوا ہے۔ پرانے زمانہ میں یونان اور روم میں اور فی زمانہ ہندوستان اور کئی اور ملکوں میں یہ تعلیم پائی جاتی ہے۔ یہ درحقیقت خدا کی شان کے خلاف ہے کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان بھی خدا میں شامل ہے۔ نیکی و بدی میں کچھ فرق نہیں اور گنہگار اور راستباز۔ سچ اور جھوٹ سب خدا میں شامل ہیں۔ پھر کسی واقعہ یا کسی چیز کا سبب دریافت کرنا فضول ہے۔ اور انسان محض کاٹھ کی پتلی ہے۔ جو کچھ ہے وہ ہے۔ خدا ہے اور بس۔

۴- نیز تخلیق کا یہ مطلب نہیں کہ خدا نے موجودہ مادہ اور روحوں کو محض ترتیب دی ہے۔ آریہ سماج کی تعلیم تو یہی ہے پر بائبل کی تعلیم بالکل اس کے خلاف ہے۔ درحقیقت اگر مادہ اور ارواح ازلی ہیں تو ازروئے فلسفہ خدا کی ہستی غیر ضروری ہے۔ اگر مادہ اور اس کے صفات ازلی ہیں تو سب کچھ ارتقا سے پیدا

ہوا ہوگا ۔ اگر مادّہ ازلی نہیں تو اس کا کوئی نہ کوئی خالق ہوگا ۔ اور اس کو ترتیب دینے والا خدا نہیں ہوگا مگر اس سے ادنیٰ کوئی ہستی ۔

پر مادّہ ازلی نہیں ہے ۔ سائنس سے معلوم ہوا ہے کہ مادّہ جاتا رہتا ہے ۔ سورج کی روشنی اور تپش اس کے مادّہ کے برباد ہونے کا نتیجہ ہیں ۔ اور جو چیز فنا ہو سکتی ہے اور ہوتی بھی ہے ضرور ہے کہ وہ شروع بھی ہوئی ۔

۵ ۔ برعکس ان غلط خیالوں کے پاک کلام سکھاتا ہے کہ خدا نے دنیا اور سب کچھ جو اس میں ہے اس کو نیست سے ہست کیا ۔ "ایمان ہی سے ہم معلوم کرتے ہیں کہ عالم خدا کے کہنے سے بنے ہیں ۔ یہ نہیں کہ جو کچھ نظر آتا ہے ظاہری چیزوں سے بنا ہو ۔" (عبرانیوں ۱۱ : ۳ ؛ رومیوں ۴ : ۱۷ ؛ اکرنتھیوں ۱ : ۲۸) +

پیدائش کی کتاب کے پہلے باب میں بتایا جاتا ہے کہ خدا نے ابتدا میں آسمان و زمین کو پیدا کیا ۔ اس کے بعد زمین کے ترتیب پانے کا ایک بیان ہے ۔

تخلیق کے لئے خدا کی مرضی (جو خدا کا کلام بھی کہلاتی ہے) کافی ہے ۔ تمام ہستیاں خدا کی طرف سے ہیں ۔ خدا ساری ہستی کا مخرج ہے ۔ مادّہ اور ارواح سب اس کی طرف سے ہیں ۔ محض اس سے صادر نہیں بلکہ مخلوق ہیں ۔ جو کچھ حقیقت ہے وہ خدا کی پیدا کی ہوئی ہے ۔ صرف خدا بذاتِ خود حقیقی ہے ۔ اس سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ نظامِ قدرت اس کی خلقت ہے ۔ مادّہ اور تمام مادّی چیزوں کے صفات اس ہی کے مخلوق ہیں ۔

۶ ۔ نہ صرف خدا نے خلقت کو نیست سے ہست کیا بلکہ وہ ہر لمحہ اسے سنبھالتا بھی ہے ۔ اٹھارویں صدی میں بعض علما نے جو ڈی اسٹ (Deist)

کہلاتے ہیں یہ سکھایا کہ خدا نے دنیا کو خلق تو کیا لیکن خلق کرنے کے بعد اس کو چھوڑ دیا کہ خود بخود گھڑی کی مشین کی طرح چلتی رہے۔ مسیحی دین کی تعلیم یہ ہے کہ خدا تمام مخلوقات کو سنبھالتا رہتا ہے (دیکھو عبرانیوں ۱: ۳) وہ ہر لمحہ اس کو اپنی مرضی کے مطابق چلاتا ہے۔ وہ مخلوقات میں حاضر و ناظر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام قدرت یعنی قدرتی قواعد جو اس کی مرضی پر چلتے ہیں معتبر اور لاتغیر ہیں کیونکہ خدا کی مرضی اٹل اور لاتبدیل اور کامل طور پر اعتبار کے لائق ہے۔

۷۔ بائیبل یہ نہیں بتاتی کہ خدا نے کتنے عالم خلق کئے اور نہ یہ بتاتی ہے کہ اس نے صرف ایک ہی مرتبہ تخلیق کا کام کیا۔ ممکن ہے کہ خالق ازل سے طرح طرح کے عالمین اپنی مرضی کے مطابق خلق کرتا رہتا ہے۔ بعض فلسفی یہی خیال کرتے ہیں۔ یہ خیال خدا کی شان اور پاک کلام کی تعلیم کے خلاف نہیں ہے۔ مگر اس کے بارے میں قطعی فیصلہ کرنا اور ایسی بات کا ادراک کرنا انسانی طاقت کے باہر ہے اور ہم نہیں کہہ سکتے ہیں کہ اس کی بابت مسیحی دین کی کوئی متعین تعلیم ہے۔

۸۔ مذکورۂ بالا تعلیم میں کہ خدا نے اپنی خلقت کو الگ نہیں چھوڑا۔ بلکہ اس کا انتظام کرتا رہتا ہے۔ اور ہمہ اوست میں یہ خاص فرق ہے کہ اگر مخلوقات جاتے رہتے تو خدا میں کچھ کمی نہ ہوتی۔ اگر خدا اپنی خلقت کو نہ سنبھالتا تو خلقت فنا ہو جاتی کیونکہ اس کی حقیقت اور پائیداری پورے طور پر خالق کی مرضی پر موقوف ہے۔ لیکن خدا خلقت کا محتاج نہیں۔ اس نے اس کو اپنی آزاد مرضی سے پیدا کیا اور وہ خلقت سے کسی طرح محدود نہیں ہوتا۔

۹۔ یہ سوال لازم آتا ہے کہ پیدائش کی کتاب کے پہلے دو ابواب میں

جو بیان ہے اس کے بارے میں مسیحی کو کیا ماننا چاہیئے۔ انیسویں صدی میں
چارلس ڈاروِن اور الیفرڈ رسل والس (Charles Darwin)
اور (A. R Wallace) نے ارتقاء (Evolution) کی
تعلیم رائج کی۔ درحقیقت اس میں دونوں کا بڑا حصہ تھا۔ اور بعض سمجھتے ہیں
کہ والس کا حصہ زیادہ تھا۔ پر عموماً جو لوگ سائینس سے کم واقف ہیں وہ صرف
ڈارون کا نام جانتے ہیں۔ غالباً جس صورت میں ڈارون نے مسئلۂ ارتقاء
پیش کیا اب سائینس کے زیادہ علماء نہیں مانتے۔ والس کا خیال تھا کہ ارتقاء
خدا کی ہدایت سے ہوئی۔

ارتقاء کا یہ مطلب ہے کہ موجودہ حیوانات اور نباتات رفتہ رفتہ نہایت
سادہ جانداروں سے لاکھوں برس میں اپنی موجودہ صورت کو پہنچے ہیں۔ اور
خدا نے ہر قسم کے جاندار کو الگ الگ ایک ہی وقت نہیں پیدا کیا۔ شروع شروع میں
بہت سے مسیحی یہ گمان کرتے تھے کہ ارتقاء کی تعلیم کلام الٰہی کے خلاف ہے کیونکہ
وہ دو باتیں مانتے تھے۔ اوّل یہ کہ پیدائش کا بیان سائنس سکھانے کے لئے آیا۔
دوم یہ کہ پیدائش کے پہلے باب میں لفظ دن سے چوبیس ۲۴ گھنٹے مراد ہیں +

اوّل جیسا پہلی فصل میں لکھا گیا پاک کلام روحانی تعلیم دینے کے لئے ہے
نہ کہ سائنیس کی تعلیم دینے کے لئے۔ اور اگر اُن کم علم لوگوں کو جن کے لئے وہ لکھا
گیا، سائینس سکھانے کی کوشش کی جاتی تو وہ کچھ بھی نہ سمجھتے۔ نیز فی زمانہ
سائینس میں بھی انسان کی استعداد اور علم ناقص اور نامکمل ہے۔ اور اگر پیدائش
حقیقت کے مطابق ہوتی تو غالباً دورِ حاضرہ کے لوگ بھی اس کو نہ سمجھتے۔ دوم

بہت دن سے یہ بات مانی جاتی ہے کہ خدا کے نزدیک جو قدیم الایام ازلی اور ابدی ہے وقت کوئی بڑی چیز نہیں۔ (۲ پطرس ۳: ۸) اور لفظ دن سے ایک زمانہ سمجھنا چاہیئے۔

دراصل ارتقار اور تخلیق میں تضاد نہیں۔ یوں سمجھنا چاہیئے کہ خدا نے ارتقا کا طریقہ اختیار کر کے حیوانات اور نباتات کو پیدا کیا۔ بعضوں کا یہ خیال ہے کہ شروع ہی میں خدا نے سب سے پہلے جانداروں میں یا شاید مادّہ میں یہ طاقت ڈالی کہ تمام حیوانات و نباتات پیدا ہوں کسی صورت میں موجودہ جاندار خدا کے خلق کئے ہوئے ہیں۔

یا تو مادّہ میں زندگی اور تمام نباتات اور حیوانات کی صفات کے کافی اسباب ہیں یا خالق نے بذاتِ خود یا درمیانی کے ذریعہ سے ان کو رفتہ رفتہ پیدا کیا۔ اگر ہم مانیں کہ مادّہ میں موجودہ نباتات اور حیوانات کے اسباب ہیں تو یہ سوال لازم آتا ہے کہ کس نے غیر ازلی مادّہ میں (مذکورہ بالا مضمون کو دیکھو) یہ اسباب پیدا کئے۔ اس کا جواب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ خالق نے۔)

والس صاحب کا خیال تھا کہ خدا نے ارتقار کی ہدایت فرشتوں کے سپرد کی۔ لیکن جو کوئی مانتا ہے کہ خدا ہمیشہ حاضر و ناظر ہے وہ ایسے درمیانی کی ضرورت محسوس نہیں کرے گا نیز پاک کلام کی یہ تعلیم ہے کہ یہ کام بیٹا یعنی اقنوم ثانی نے کیا۔ "ابتدا میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا۔ اور کلام خدا تھا سب چیزیں اس کے وسیلہ سے پیدا ہوئیں اور جو کچھ پیدا ہوا اس میں سے کوئی چیز بھی اس کے بغیر پیدا نہیں ہوئی۔" (یوحنا ۱: ۱ سے ۳ تک) "خدا نے ....

بیٹے کی معرفت کلام کیا۔ . . . جس کے وسیلہ سے اس نے عالم بھی پیدا کئے "
(عبرانیوں ۱: ۱ اور ۲) - (نیز دیکھو ۱ کرنتھیوں ۸: ۶؛ کلسیوں ۱: ۱۶؛ رومیوں ۱۱: ۳۶)-

سائنس کے علماء ارتقاء کی بابت طرح طرح کے خیال رکھتے ہیں اور اس کے طریقہ کی بابت متفق الرائے نہیں۔ مگر غالباً کسی نہ کسی طرح کا ارتقاء سچ مچ ہوا ہے۔ اس کے مفصلات معلوم کرنا سائنس کا کام ہے لیکن جو کچھ ہوا ارتقاء محض تخلیق کا طریقہ ہے۔

۱۰ اسا ایک زمانہ تھا کہ لوگ خیال کرتے تھے کہ ذرّات جن کا تمام مادّہ بنا ہے ایک دوسرے سے جداگانہ ہیں اور ان سے چھوٹی کوئی چیز نہیں۔ اس لئے ان کا نام ایٹم (atom) رکھا گیا۔ یعنی وہ چیز جو تقسیم نہ ہو سکے۔ پھر لارڈ ریلی (Raleigh) اور دیگر عالموں نے جن میں ٹامسن، رتھر فورڈ اور ساڈی (Thompson, Rutherford, Soddy) مشہور ہیں، یہ معلوم کیا کہ ذرّات بھی گویا مرکب اشیاء ہیں۔ جن کے اندر نہایت باریک برقی ذرات ہیں جن کو عموماً ایلکٹران (electron) کہتے ہیں۔ انیسویں صدی میں یہ سکھایا جاتا ہے کہ مادّہ غیر فانی ہے۔ یا کم از کم کوئی آدمی اس کو برباد نہیں کر سکتا۔ اب معلوم کیا گیا ہے کہ اگرچہ زیادہ تر ذرات بہت پائیدار ہیں۔ بہر حال بعض ذرات مثلاً ریڈیم اپنے آپ روشنی۔ بجلی۔ کرنیں۔ اور دیگر ذرّات میں تبدیل ہوتے ہیں۔ یہ یہاں تک سچ ہے کہ اس علم کی بنا پر ایٹم بم بنائے گئے۔ مادّہ فانی ہے۔ لہذا اس کا شروع ہوا۔ اور اس کا کوئی نہ کوئی بنانے والا ہوا جس کو ہم خالق کہتے ہیں۔ خلقت کی

موجودگی خالق کی ہستی کی ایک دلیل ہے۔

یہ مادّہ نہ صرف موجود ہے۔ اگر کہیں بے جان بے حرکت چیز ہو جو فانی ثابت ہو تو اس کا کوئی نہ کوئی سبب ڈھونڈنا پڑے گا۔ پر یہ حال نہیں۔ دنیا کوئی سادہ چیز نہیں۔ اس میں اتنی متفرق اشیاء اور جاندار ہیں جن کو ہم از روئے فلسفہ بے شمار تو نہیں کہہ سکتے پر جن کا شمار کرنا انسان کی طاقت سے بالکل باہر ہے۔ اور ان کی ساخت اور ترکیب نہایت عجیب ہے۔ اس کی مثالیں دینا شائد فضول ہے۔ پر جب ہم اپنے جسم پر غور کرتے ہیں یعنی اپنی پیدائش۔ آدمی کا رحم میں ترتیب پانا۔ اور بچپن میں نشو و نما حاصل کرنا۔ ہماری غذا کا جسم کے اندر ایسے تقسیم ہونا کہ کچھ گوشت بن جاتا ہے۔ کچھ ہڈی۔ کچھ خون۔ کچھ بال وغیرہ وغیرہ تو ہم دنگ ہوتے ہیں۔ بعض اب تک کہتے ہیں کہ یہ سب اتفاق سے ہوا اگر بہت سے بندر ٹائپ رائیٹروں پر انگلیاں مارا کریں تو ممکن ہے کہ آخرکار سینکڑوں کتابیں بن جائیں لیکن محض پاگل آدمی یہ سمجھے گا کہ کتابیں ایسے بنتی ہیں یا بن سکتی ہیں۔ یہ گمان کرنا کہ عالمین محض اتفاق سے پیدا ہوئے ہیں خادم کی سمجھ میں اس سے زیادہ دیوانگی کا ثبوت ہے۔

۱۱۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ عالم کی جتنی تحقیقات کی جاتی ہے اتنی ہی زیادہ وہ سمجھ میں آتا ہے۔ اور اتنی ہی زیادہ عالم پر انسان کی طاقت بڑھتی ہے۔ یہ اس بات کا نشان ہے کہ عالم عقل یا حکمت کا کام ہے۔ اگر کسی کمرہ میں طرح طرح کا اسباب یونہی بے ترتیب بے سوچے سمجھے ڈال دیا جائے تو اس کمرہ میں کتنی ہی تحقیقات کی جائے اسباب کی کوئی ترتیب سمجھ میں نہیں آئے گی۔ جو عقل دوڑانے سے سمجھ میں آتا ہے اس کے پیدا کرنے میں کسی نے عقل یا حکمت استعمال کی۔ یہی نہیں دنیا میں نہ صرف

ہوش دار حیوان ہیں بلکہ انسان جو رفتہ رفتہ زمین اور آسمان کو سمجھ لیتا ہے۔ اور اس کی طاقتوں کو کام میں لاتا اور ان پر اختیار حاصل کرتا ہے۔ دنیا میں عقل موجود ہے لہذا اس کے پیدا ہونے کے اسباب میں بھی عقل یا حکمت ہے۔ خالق حکیم ہے۔

۱۲۔ علیٰ ہذا القیاس انسان میں اخلاقی صفات۔ نیک و بد کی پہچان۔ ارادہ محبت۔ وغیرہ موجود ہیں۔ دنیا کے مخرج یا سبب یعنی خالق میں بھی یہ صفات یا اُسی قسم کی اعلیٰ صفات ضرور موجود ہیں۔ علّت معلول سے کم نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ اس سے بڑی ہو سکتی ہے۔

۱۳۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ نظام قدرت یعنی قدرت کے قواعد خدا کی لاتبدیل مرضی کو ظاہر کرتا ہے۔ جب ہم غور کرتے ہیں تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ اگر نظام قدرت تبدیل ہوتا تو انسان کی ترقی ممکن نہ ہوتی۔ علم اور اخلاق کے پیدا ہونے کے لئے یہ امر ضروری ہے کہ انسان کا مادّی ماحول معتبر ہو یعنی ایک ہی علت سے ایک ہی معلول پیدا ہو۔ اگر پتھر کبھی نیچے گرتا۔ کبھی ہوا میں اُڑتا۔ کبھی کافور ہو جاتا۔ وغیرہ وغیرہ تو نہ سائنس ممکن ہوتا، نہ اخلاق اور نہ تمدّن۔ ان سب کا انحصار اس بات پر ہے کہ نظامِ قدرت لاتبدیل ہے۔

۱۴۔ ہم کو چاہیئے کہ خدا کی خلقت سے خدا کو پہچانیں ؎

برگ درختاں سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

جب کسی واقع سے ہم خدا کی موجودگی۔ اس کی صفات اور اس کی مرضی زیادہ صفائی سے پہچانتے ہیں تو ہم اس کو معجزہ کہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایسا واقعہ

قدرت کے عام قواعد کے خلاف نظر آئے۔ پر یہ کوئی ثبوت نہیں ہے درحقیقت نظام قدرت معطل ہوا کیونکہ ہم خدا کے انتظام کے محض معمولی اظہار سے واقف ہیں خدا حاضر وناظر ہے۔اور اس لئے اس بات کی ضرورت نہیں کہ وہ گویا معمولی انتظام میں دخل دے۔ جو کچھ واقع ہوتا ہے چاہے وہ معمولی ہو چاہے غیر معمولی۔ سب کچھ ہمہ جا حاضر خدا کی مرضی کا نشان ہے۔ ہر انسان غیر معمولی واقعات سے دنگ ہو کر ان کو معجزات یا کرامات کہتا ہے۔ عہدنامہ جدید میں ایسے واقعے اکثر نشان کہلاتے ہیں۔ کیونکہ ان سے ہم خدا کی حضوری کو بخوبی پہچانتے ہیں۔ اگر خدا ہے تو یہ واقعات ضرور ممکن ہیں۔ انسان اپنے کاموں سے قدرتی اشیاء اور واقعات میں تغیر کرتا ہے اور یہ خیال کرنا کہ خدا نہیں کرسکتا عقل سے بعید ہے۔ یہ گمان کرنا کہ محض سائنس کی ترقی کے سبب سب معجزوں کا یقین کرنا ممکن نہیں غلط ہے۔ مثلاً یوسف مقدس کنواری مریم کا شوہر سائنس سے واقف نہ تھا۔ تو بھی اس نے مریم کا معجزانہ طور پر حاملہ ہونا مشکل سے مانا (متی ۱: ۱۸سے ۲۰ تک)۔ بہرحال ہر واقعہ کی بابت جو معجزانہ سمجھا جاتا ہے یہ دریافت کرنا ہے کہ اول اس کی شہادت کافی ہے یا نہیں یعنی سچ مچ وہ بات واقع ہوئی یا نہیں۔ دوم یہ واقعہ درحقیقت معمولی نظام قدرت کے موافق ہے یا نہیں۔ معجزوں کو آسانی سے ماننا ضعف الاعتقادی ہے ان کا بالکل نہ ماننا دہریہ کا کام ہے۔

۱۵۔ خدا نے عالمین کو کیوں پیدا کیا؟ بیشک خدا کی مرضی پورے طور پر انسان کی سمجھ میں نہیں آسکتی بلکہ بہت زیادہ انسان کے ادراک کے باہر ہے اور رہے گی۔ بہرکیف خدا نے پاک کلام میں اپنی مرضی کسی قدر ظاہر فرمائی ہے۔ پاک

کلام سے، اور خاص کر نئے عہد نامہ سے ہم سیکھتے ہیں کہ خدا نے چاہا کہ ایسی روحیں پیدا ہوں جو آزاد ہوں۔ اور پھر اپنی مرضی سے خدا کی عبادت کریں۔ اس کے حکموں کو مانیں۔ اس سے محبت رکھیں۔ اور اس کی نزدیکی اس جہان میں حاصل کریں۔ اور ابد تک قربت الٰہی میں رہیں +

انسان مخلوق ہے اور خدا خالق۔ اس لئے انسان کی مرضی۔ انسان کے خیالات اور انسان کا فائدہ اس دنیا کا معیار نہیں۔ اس دنیا اور انسان کے اخلاق کا معیار خدا کی مرضی ہے۔ آزاد روحیں خدا کی مرضی کے خلاف چل سکتی ہیں۔ اس کا نام گناہ ہے پر بائبل میں بتایا گیا ہے کہ خدا انسان کو اس کے گناہوں سے بچانا چاہتا ہے۔ حالانکہ وہ جبراً کسی کو نہیں بچاتا۔ پس ہم کو کہنا چاہیئے کہ خدا نے خلقت کو اپنی محبت سے خلق کیا۔

فصل سوم
خدا کے وجود کے دلائل

اگرچہ اس فصل کے لکھنے میں فصل دوم کا مضمون کسی قدر دہرانا پڑے گا تو بھی خادم کو معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ فصل کا مضمون ایک ہی جگہ اکٹھا کرے۔ تاکہ ناظرین ایک ہی نظر میں اس کو دیکھ لیں۔ سرنامہ میں لفظ "ثبوت" اس لئے نہیں لکھا گیا کہ،

(۱) وہ لفظ کسی قدر ریاضی اور منطق کی اصطلاح ہے۔ خدا کی ہستی کی دلائل

ایسی نہیں کہ خواہ مخواہ عقلمند دہریہ ان پر غور کر کے خدا کو مان لے۔ اگر کوئی شخص دعویٰ کرتا کہ اگرچہ ۲×۲=۴ (دو دونا چار) درست ہے تو بھی ۲×۴=۸ (چار دونا آٹھ) غلط ہے۔ تو ہم اس کو دیوانہ کہتے پر خدا کے وجود کی دلیلیں اس قسم کی نہیں۔

(۲) اگر ہم نے خدا کے وجود کی دلائل کا ذکر کیا ہے تو بھی جب کوئی شخص ان کو مانتا ہے تو جس معبود کو مانتا ہے تو اس کو مسیحی معنی میں خدا کہنا درست نہیں حالانکہ وہ واجب الوجود۔ خالق۔ مالک۔ حکیم وغیرہ مانا جائے تو بھی شاید وہ ہمارے خداوند یسوع مسیح کا باپ نہ مانا جائے۔ اس فصل میں جو دلائل مندرج ہیں ان کو اہل اسلام مان سکتا ہے اور اسلامی علما اکثر مانتے بھی ہیں۔ مگر خدا کی بابت ان کے خیالات مسیحی خیالات سے جداگانہ ہیں +

۱۔ خدا کا تصور اینسلم (Anselm) نے گیارہویں صدی میں یہ دلیل یوں پیش کی کہ انسانی خیالات میں کامل ہستی کا تصور شامل ہے جس سے زیادہ بڑا یا بہتر کا گمان نہیں کیا جا سکتا۔ مگر کامل ہستی واجب الوجود ہے کیونکہ اگر اس میں وجود نہیں تو وہ کامل نہیں۔ جب دلیل اس طور پر پیش کی جاتی ہے تو ناقص معلوم ہوتی ہے۔ اور درحقیقت ناقص ہے۔ کیونکہ وجود صفت نہیں۔ اور کامل ہستی کی صفات میں اس کا موجود ہونا ضروری نہیں۔ بہرکیف جب یہ دلیل یوں پیش کی جاتی ہے تو اس میں کچھ زور ہے۔ جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے اور نیچے پھر بیان کیا جائے گا۔ عالم ایسا ہے کہ جتنی زیادہ تفتیش اور تحقیقات کی جاتی ہے اتنا زیادہ وہ سمجھ میں آتا ہے۔ یعنی انسان کے خیالات حقیقت پر منحصر ہیں۔ لہذا کامل ہستی کا خیال جس کے بغیر عالم کا وجود اور اس کی ترتیب دونوں سمجھ میں

نہیں آتے حقیقت کے موافق ہے ۔ اگر سچ مچ ہم عالم کا علم حاصل کر سکتے ہیں۔ تو انسانی خیالات حقیقت کے موافق ہیں ۔ جھوٹے تصوروں کی غلطی عملی طور پر ثابت ہوتی ہے ۔ اگر میں چاند کی روشنی میں ایسا پانی جس پر کائی لگی ہے دیکھ کر اسے خشکی سمجھوں تو یہ غلط ثابت ہوگا جس وقت کہ میں اس پر چلنے کی کوشش کروں ۔

سائنس کی بنیاد بلکہ تمام علم کی بنیاد یہ ہے کہ حقیقت انسانی خیالات کے موافق ہے ۔ پس جو تصور خواہ مخواہ انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے ۔ وہ ضرور سچا ہے ۔ اگر کسی قسم کی بھی حقیقت ہے تو حقیقت مطلق ضرور ہے ۔

۲ ۔ عالم کی ہستی خالق کی ہستی کی ایک دلیل ہے ۔ جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے سائنس کے عالموں نے دکھا دیا ہے کہ مادہ فانی ہے ۔ یاد رہے کہ ایٹم بم (atom bomb) جس کی حقیقت اور جس کے زور میں کوئی شک نہیں اس کا بنانا اسی بات پر موقوف ہے کہ مادہ فانی ہے ۔ چند سال پہلے ممکن تھا کہ لوگ کہیں کہ مادہ کا فانی ہونا محض وہم ہے ۔ مگر شہر ہیروشیما کی بربادی کے بعد کوئی یہ خیال نہیں کر سکتا ۔ جو چیز فنا ہو سکتی ہے وہ واجب الوجود نہیں ۔ اور اس لئے کسی نہ کسی وقت شروع بھی ہوئی ۔ عالم کا کافی سبب ضرور ماننا پڑتا ہے فانی سے معلوم ہوتا ہے جس کی کافی علت ڈھونڈنا پڑتی ہے ۔

نیز یہ ظاہر ہے اور سائنس نے بخوبی ثابت بھی کیا ہے کہ رفتہ رفتہ تمام قدرتی طاقت کا زوال ہوتا ہے ۔ سورج بھی کسی وقت شاید کروڑوں برس کے بعد ٹھنڈا ہو جائے گا ۔ اس دنیا میں تمام زندگی ختم ہوگی اور اسی طرح سے تمام ستارے اور ان کی چاروں طرف گھومنے والے سیارے ٹھنڈے اور زندگی سے خالی

ہو جائیں گے پس نہ فقط مادہ کا فانی ہونا بلکہ عالم کی موجودہ حالت اور ترتیب دکھاتی ہیں کہ یہ ازلی نہیں ۔ عالم کا وجود اور اس کی موجودہ ترتیب سمجھنے کے لئے خالق کا تصور ضروری ہے۔ (بعض عالموں نے گمان کیا ہے کہ ریڈیم (radium) اور ایسے ایسے عناصر کی کثرت کے سبب سے آخر کار سورج پھٹ جائے گا اور زمین کو جلا دے گا ۔ مگر اس کی دلیلیں زبردست نہیں معلوم ہوتیں ۔)

۳ ۔ خدا خالق ہے جس نے عالمین کو نیست سے ہست کیا کم سے کم یہ مسیحی دین کی تعلیم ہے " ایمان سے ہم معلوم کرتے ہیں کہ عالم خدا کے کہنے سے بنا ہے ۔ یہ نہیں کہ جو کچھ نظر آتا ہے ظاہری چیزوں سے بنا ہو " (عبرانیوں ۱۱: ۳)۔ خدا کو محض ترتیب دینے والا نہیں خیال کرنا چاہیئے ۔ بہرحال اسی نے عالم کو ترتیب دیا ۔ عالم کی ترتیب ایسی عجیب ہے کہ اس کا ہر حصہ اور ہر ذرہ باترتیب ہے ۔ اور اس کے حصوں کا باہمی تعلق باترتیب ہے ۔ یہ اظہر من الشمس ہے ۔ اور اس کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ۔ اس ترتیب کا محض اتفاقیہ ہونا عقل کے خلاف ہے ۔ بیشک یہ کہا جاتا ہے کہ ارتقا کی رُو سے عالم ضرور باترتیب ہے ۔ کیونکہ تمام چیزیں ساتھ ساتھ پیدا ہوتی آئی ہیں اور خواہ مخواہ ان میں ضروری تعلقات پیدا ہوئے ۔ ورنہ وہ اشیاء پیدا نہ ہوسکتیں ۔ مگر یہ دعویٰ کمزور ہے ۔ بحث نہیں کہ حیوانات و نباتات رفتہ رفتہ باہم پیدا ہوئے جس سے ضرور باترتیب ہوئے ہیں ۔ درحقیقت ترتیب داری اتفاقی نہیں ہو سکتی ۔ اتفاق کے دو معنی ہیں ۔ ایک یہ کہ جب کسی انسان کے ارادہ کے بغیر اور شاید اس کی مرضی کے خلاف کوئی واقعہ ہوتا ہے تو ہم اس کو

اتفاق کہتے ہیں۔ لیکن ہمارا ہرگز یہ مطلب نہیں۔ کہ اس واقعہ کا کوئی کافی سبب نہیں۔ دوسرا مطلب ہے بے سبب۔ پر تمام سائینس بلکہ تمام علم کا انحصار اس بات پر ہے کہ کوئی واقعہ بے سبب نہیں۔ کیونکہ جو کچھ بے سبب ہے وہ کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتا +

پہلی فصل میں مرقوم ہے کہ ارتقا محض تخلیق کا طریقہ ہے۔ وہ حقیقت جس کے سبب سے ہم خالق کی حکمت پہچانتے ہیں یہ ہے کہ عالم و ما فیہا باترتیب ہے۔ اس کا یک لخت یا سات روز میں یا کروڑوں برس میں پیدا ہونا بحث کے دائرہ سے بالکل باہر ہے +

۴۔ پھر ہم دوبارہ اس بات پر غور کریں کہ عالم عقل کے موافق ہے یہاں تک کہ انسان اس کا علم حاصل کر سکتا ہے۔ جو کچھ عقل سمجھ سکتی ہے وہ عقل یا حکمت کا نتیجہ ہے (خدا کے لئے لفظ "عقل" استعمال کرنا غلط ہے کیونکہ عقل دوڑائی جاتی ہے اور انسان سعی و کوشش سے چیزوں اور باتوں کو سمجھ لیتا ہے۔ نیز وہ ایک ہی وقت صرف ایک یا سب سے زیادہ دو تین چیزوں کو سوچ سکتا ہے۔ پر خدا سب کچھ بغیر کوشش کے ہر وقت پورے طور پر جانتا اور سمجھتا ہے "اس سے مخلوقات کی کوئی چیز چھپی نہیں بلکہ جس سے ہم کو کام ہے اس کی نظروں میں سب چیزیں کھلی اور بے پردہ ہیں" (عبرانیوں ۴: ۱۳) + دیکھو زبور ۱۳۹۔ پس خدا کے لئے لفظ "حکمت" استعمال ہوتا ہے۔ انسانی عقل الہٰی حکمت کا گویا سایہ ہے)

چونکہ عالم کو انسان کی عقل سمجھ سکتی ہے لہٰذا اس کا خالق حکیم (صاحب حکمت) ہے۔ بے عقل علت سے ایک معنی میں حقیقی معلول پیدا ہو سکتا ہے۔ پر وہ علت

مسبب الاسباب نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ معقول عالم کا مسبب الاسباب بے عقل نہیں ہوسکتا۔ اس بات پر اکثر غور نہیں کیا جاتا کہ انسان کا عالم کو سمجھنا غور طلب بات ہے۔ جب ہم غیر زبان سنتے ہیں تو اس کو نہیں سمجھتے۔ جب ان پڑھ آدمی کتاب دیکھتا ہے تو یہ اس کے لئے محض کاغذ اور سیاہی ہے۔ اور جو حرف چھپے ہیں وہ اس کے لئے نشان نہیں بلکہ بے معنی داغ۔ جب اناڑی آدمی کسی کارخانہ کی کلوں کو دیکھتا ہے تو حالانکہ شاید اس کارخانہ کی ساخت کی چیزیں استعمال بھی کرتا ہو وہ نہیں سمجھ سکتا کہ کیا کیا کیا جاتا ہے۔ ہر آدمی نہیں مگر بنی آدم عالم کو بہت کچھ سمجھ سکتے اور سمجھتے بھی ہیں اور جتنی زیادہ تحقیقات اور کوشش کی جاتی ہے اتنا زیادہ انسان عالم و مافیہا کو سمجھتا ہے۔ اور اتنا زیادہ اس پر اختیار حاصل کرتا اور اس کی طاقتوں کو اپنے کام میں لاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ساری کائنات نہ صرف حکمت کا نتیجہ ہیں بلکہ انسان کی عقل کسی قدر اس بے پایاں حکمت سے موافقت رکھتی ہے۔

نیز دنیا میں ہوشیار اور عقل مند ہستیاں موجود ہیں۔ لہٰذا ضرور ہے کہ دنیا کا مخرج یا خالق صاحبِ حکمت ہو ورنہ عقل بے سبب وجود ہوتی اور یہ ممکن نہیں۔ یہ خیال کرنا کہ بے عقل مادّہ سے عقل پیدا ہوسکتی ہے درحقیقت یہ ہے کہ ہم گمان کریں کہ کوئی بے سبب نتیجہ یا بے علّت معلول ممکن ہے۔ ایسا گمان کرنے والا ذی عقل ہونے سے استعفےٰ دیتا ہے +

۵۔ انسان میں نیکی اور بدی کی پہچان ہے۔ اور آدمی نیکی اور بدی میں نہ صرف امتیاز کرسکتے ہیں بلکہ ان میں سے چن سکتے ہیں۔ کہ کس کو کریں۔ انسان کا ضمیر اُسے بتاتا ہے کہ نیکی کرنا چاہیئے اور بُرائی سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ یعنی ہم

جانتے ہیں کہ دنیا میں نیکی اچھی ہے اور سچائی پر چلنا فرض ہے۔ اس میں شک نہیں
کہ ضمیر ہم کو نہیں بتاتا کہ کون کون سے کام درست ہیں۔ یہ مذہبی تعلیم کا کام ہے ۔
لیکن ضمیر کیونکر پیدا ہوا ؟ بعض کہتے ہیں کہ جو کام عموماً کئے جاتے ہیں ہم ان کو عادت
سے اچھا کہتے ہیں یا از روئے ارتقار لوگ بتلاتے ہیں کہ جن کاموں سے خاندان یا
الگ الگ اشخاص فائدہ اٹھاتے ہیں یہاں تک کہ یہ کام نسل قائم کرنے اور زندگی
کی درازی کے لئے اچھے ہیں یہی نیکی میں داخل سمجھے گئے۔ ممکن ہے کہ اس دعویٰ میں
کسی قدر سچائی ہو۔ مگر یہ مشہور بات ہے کہ اخلاقی پیشواؤں نے اکثر نئی نئی باتیں
بتائیں جن سے لوگ ناواقف تھے اور اس لئے بار بار ایسے آدمیوں نے تکلیف
اٹھائی اور بعض قتل بھی ہوئے۔ محمد صاحب نے بت پرستی کو برا کہنے کے سبب سے
تکلیف اٹھائی ۔ سقراط مار ڈالے گئے ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ جب اخلاق کے بڑے بڑے
پیشوا اس قسم کا تجربہ کرتے ہیں تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ صرف وہی کام اچھے کہے جاتے
ہیں جو دستور کے موافق یا زندگی کے آرام اور اس کی درازی کے لئے مفید ہوں ۔

پھر اخلاق کہاں سے آئے ؟ جواب یہ ہے کہ خالق نے ان کو پیدا کیا اور ان
کا وجود اس بات کی دلیل ہے کہ خالق اخلاق میں دلچسپی لیتا ہے اور خود راست
اور نیک ہے ۔

چونکہ انسان میں قوتِ ارادہ ہے اس لئے ہم نتیجہ نکالتے ہیں کہ خدا ارادہ
کرنے والا ہے ۔ اور چونکہ اس دنیا میں سب سے اہم اور افضل چیز شخصیت
ہے اس لئے خدا " کم از کم شخص ہے " یعنی اگرچہ خدا شخصوں سے بڑھ کر ہے تو
بھی اُس میں شخصیت کی تمام فضیلتیں موجود ہیں یعنی سمجھ ، ارادہ ۔ اخلاق ۔ وغیرہ

اگر کوئی خدا نہ ہوتا یا خدا محض بے سمجھ قدرت کا نام ہوتا تو ہم یہ نہ سمجھ سکتے کہ دنیا میں اخلاق اور شخصیت کیونکر پیدا ہو سکتی -

۶ - جب ہم تانبے پر شورے کا تیزاب ڈالتے ہیں تو ایک لال بدبودار ہوا نکلتی ہے اور تیزاب ہرا ہو جاتا ہے - اس کے دو[۲] سبب ہیں - ایک قریبی یعنی ان دو[۲] اشیاء کا اکٹھا ہونا مگر یہ کافی سبب نہیں کیونکہ اب تک ہم کو معلوم نہیں کہ آیا تیزاب تانبے پر اتفاق سے گرا یا کسی نے گرا دیا - جب تک ہم کو اس گرانے والے کا مقصد نہیں معلوم ہو جاتا ہم پر ظاہر نہیں ہوتا کہ لال بدبودار ہوا کے نکلنے کی کیا وجہ یا سبب ہے جس کو ہم علّت غائی یا علّت تام کہہ سکتے ہیں - سائنس کا کام یہ ہے کہ ہر واقعہ کا قریبی سبب معلوم کرے - اس کو اس بات سے سروکار نہیں کہ آیا واقعات کسی مقصد سے وقوع میں آتے ہیں یا نہیں -

فرض کیجئے کہ کوئی شخص بجلی کی بتّی جلانے کے لئے اُٹھے تاکہ اس کا بٹن دبائے - جو اس کی کرسی سے کمرے کی دوسری طرف بارہ[۱۲] فٹ کے فاصلہ پر ہے - اس کے چلنے کا قریبی سبب یہ ہے کہ اس کی ٹانگیں حرکت کرتی ہیں اور اس حرکت کا بیان از روئے مادہ ہو سکتا ہے - پر علّت غائی یہ ہے کہ اُس شخص کو روشنی کی ضرورت محسوس ہوئی - اگر ایسا شخص بجلی لگانے سے پہلے دوسرا ارادہ کرتا ہے - مثلاً یہ سوچ کر کے برآمدہ میں اب تک روشنی ہے میں وہیں بیٹھوں گا تو اس کے بجلی کے بٹن کی طرف چلنا ایسی بات کے سبب سے ہے جو نہ صرف اب تک وقوع میں نہیں آئی - بلکہ آئے گی نہیں -

اگر عالم کی کوئی علّت تام (یا ایسی علّتوں کا مجموعہ) نہیں تو درحقیقت اس

کا سمجھنا دشوار ہے - اور یہ ہمارے تجربہ کے خلاف ہے - جیسا اُوپر بیان ہو چکا -
عقل اس بات کا تقاضی کرتی ہے کہ کوئی مسبب الاسباب ہو جس سے کوئی بڑا
نہیں اور جو موجود مطلق اور واجب الوجود ہو - دنیا کا ترتیب وار ہونا جیسا اُوپر
مرقوم ہے اس طرف اشارہ کرتا ہے -

ایسی ایسی دلائل کا مجموعہ زنجیر کی مانند نہیں کہ اگر ایک کڑی ٹوٹی تو زنجیر ٹوٹی -
کیونکہ یہ دلائل بہت کم ایک دوسری پر منحصر ہیں - برعکس اس کے وہ چند الگ الگ
رسیوں کی مانند ہیں جو کسی جانور کے باندھنے کے لئے ساتھ ساتھ استعمال کی
جائیں جو ایک دوسرے کی مدد کرتی ہیں - یا یوں کہیں روایتوں کا حال یہ ہے کہ
کہ فلاں ابن فلاں نے فلاں ابن فلاں سے سنا اور اس نے اور کسی شخص سے سنا الخ -
اگر روایتوں کے راویوں کے تمام سلسلہ میں ایک بھی ناقابل اعتبار ہو تو روایت پر
بھروسہ کرنا عبث ہے - پر جب چار پانچ الگ الگ معتبر گواہ کسی واقعہ کی گواہی دیتے
ہیں تو ان کی گواہی بہت زبردست ہوتی ہے - خدا کی ہستی کی دلائل اسی طرح ہیں -

---

فصل چہارم

صفات ستودہ - الٰہی صفات

خدا کی صفات اس کی ذات اور ماہیت کا اظہار ہیں - کسی شے یا شخص کی
صفات اس کی ماہیت سے الگ نہیں اور نہ اس کی ماہیت اس کی صفات سے
الگ ہے - خدا کی صفات دو قسم کی ہیں - یا یوں کہیں کہ انسان ان کو سمجھنے کے لئے

ان کو دو قسموں میں تقسیم کرتا ہے۔ (ل) ذاتی صفات (ب) وہ صفات جو مخلوقات سے تعلق رکھتی ہیں، اور جو خدا کے کاموں سے ظاہر ہوتی ہیں۔ بہرحال یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ خدا کے کاموں کے سبب سے اس کی ذات میں تغیر ہوتا ہے۔ ہم فقط اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اگر خدا کے کام اور ہوتے تو اس کی ذات کو اور طرح سے سمجھنا چاہیئے۔

یہ بھی یاد رہے کہ انسان خدا کی ماہیت سے صرف اس قدر واقف ہو سکتا ہے، جس قدر خدا نے انسان کو سمجھنے کی طاقت بخشی اور اپنے آپ کو اس پر ظاہر فرمایا۔

(ل) ذاتی صفات

۱۔ **روحانیت** ۔ خدا روح ہے۔ بعض اوقات لوگ روح کو ایک قسم کا لطیف مادّہ سمجھتے ہیں۔ پر یہ خیال غلط ہے۔ مسیحی دُنیا کی تعلیم کے موافق روح مادّی نہیں ہے۔ ایسی ہستی کا تصوّر کرنا جو بالکل مادّی نہ ہو بہت مشکل ہے۔ ہماری روح جسم کے ساتھ مرکّب ہے تو بھی ہم معلوم کرتے ہیں کہ ہمارے روحانی کام خیال کرنا۔ ارادہ کرنا۔ محبت رکھنا۔ اگرچہ ان کے نتیجے مادّی ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم معلوم کرتے ہیں کہ روح مادّہ پر اثر ڈالتی ہے (اور مادّہ کسی رُوح پر) تو بھی ہرگز مادّی نہیں ہے۔ ہم ان تمام حدود کو جن سے ہماری روحیں بندھی ہیں بالائے طاق رکھیں اور یاد کریں کہ خدا روحِ مطلق ہے۔ اور کسی طرح بھی مادّی نہیں۔ اس کا کوئی جسم یا اعضا نہیں (دیکھو ۱ تمتھیس ۱: ۱۷؛ ۲ کرنتھیوں ۳: ۱۷؛ یوحنّا ۴: ۲۴؛ عبرانیوں ۱۲: ۹؛ ۱ تمتھیس ۶: ۱۶)

۲۔ **خدا لاانتہا ہے** ۔ تمام مخلوقات محدود ہیں پر خدا لامحدود ہے۔ یہ تو سچ ہے کہ جب خدا ایسا ارادہ کرتا ہے تو اپنے کاموں کی حدود ٹھہرا سکتا ہے

مثلاً وہ خود مختار روحوں کو خلق کرسکتا ہے پر یہ اس کے ارادے کا نتیجہ ہے۔ کوئی شے یا کوئی مخلوق ہستی خدا کو محدود نہیں کرسکتی +

خدا کامل اور لاعیب ہے۔ لفظ کامل کے دو معنی ہیں۔ اوّل اپنی جنس کے موافق بے نقص ہونا مثلاً چھوٹی گولائی کامل طور پر گول ہوسکتی ہے۔ دوم۔ وہ جو لامحدود ہے اور جس سے بڑا یا بہتر کا خیال بھی نہیں کیا جاسکتا۔ خدا دوسرے معنی میں کامل ہے۔ جس کی صفت کے بارے میں ہم کہہ سکیں کہ اس کا ہونا اس کے نہ ہونے سے بہتر ہے۔ وہ خدا میں کامل طور پر موجود ہے۔ لیکن ان صفات سے وہ خوبیاں مستثنیٰ ہیں جو صرف محدود ہستی میں ہوسکتی ہیں۔ مثلاً انسان کا تربیت پذیر ہونا اچھا ہے۔ پر یہ صفت خدا میں نہیں ہوسکتی۔ کامل میں ترقی کا امکان نہیں۔

خدا لامحدود ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ تخلیق نے خدا میں کوئی اضافہ یا تغیر پیدا نہیں کیا۔ کسی نے اس کو ریاضی کے طور پر یوں تشبیہہ دی :۔

خدا + خلقت = خدا

خدا + خلقت ۔ خلقت = خدا

خدا + خلقت ۔ خدا = صفر

یعنی خلقت پورے طور پر خدا پر منحصر ہے پر خدا کو خلقت کی ضرورت نہیں اس نے پسند کیا کہ اس کو خلق کرے۔ بہرکیف ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ اگر خدا خالق نہ ہوتا تو اس کی ذات اور قسم کی ہوتی اگرچہ ہم مخلوق انسان اسے معلوم کرنے کے لئے موجود نہ ہوتے +

۳۔ خدا ازلی و ابدی ہے۔ جب خدا نے اپنے آپ کو موسیٰ پر ظاہر فرمایا تو اپنا نام (یعنی اپنی ماہیت) یوں ظاہر کیا: "میں جو ہوں سو ہوں"۔ یعنی خدا خود واجب الوجود ہے نیز وہ تمام وجود کا مخرج ہے۔ مکاشفہ میں یوں مرقوم ہے:۔ "خداوند خدا جو ہے اور جو تھا اور جو آنے والا ہے" (باب ا آیت ۸)۔ ابراہام نے "ابدی خدا سے دعا کی" (پیدائش ۲۱: ۳۳) یہ بھی لکھا ہے: "ازل سے ابد تک تو خدا ہے" (زبور ۹۰: ۲) (نیز دیکھو یسعیاہ ۵۷: ۱۵؛ ۴۴: ۶؛ ا تمتھیس ا: ۱۷ وغیرہ) خادم مانتا ہے کہ زمان و مکان مخلوق ہیں کیونکہ ان کا علم واقعات کے سلسلہ سے حاصل ہوتا ہے۔ جب ہم اِدھر سے اُدھر چلتے یا دوسرے شخص یا چیز کو چلتے دیکھتے ہیں کون مکان یعنی ابعاد ثلاثہ پہچانتے ہیں اور جب واقعات یکے بعد دیگرے ہوتے ہیں تو ہم زمانہ یا وقت کو پہچانتے ہیں۔ ایسی اشیا جن کا انحصار تغیر پر ہے اپنے مخلوق ہونے کے آثار ظاہر کرتی ہیں خدا ان دونوں سے مبرّا اور لامحدود ہے۔ ہم جو وقت اور مکان کے کیڑے ہیں ابدیت کا تصور نہیں کر سکتے ہیں پر اس کا کچھ نہ کچھ خیال کر سکتے ہیں۔ ازلی و ابدی خدا کے سامنے زمانہ جیسے ہم اس کو پہچانتے ہیں کوئی چیز نہیں۔ بہر حال زمانہ میں ایک قسم کی حقیقت ہے جو خدا نے اسے بخشی۔

ممکن ہے بلکہ خادم کو ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تمام زمانہ خدا کے سامنے موجود ہے۔ اس کے لئے نہ ماضی نہ مستقبل ہے پر سب حال ہے۔ یہ پطرس کے دوسرے خط کی ایک آیت (۳: ۸) کا مطلب معلوم ہوتا ہے "خداوند کے نزدیک ایک دن ہزار برس کے برابر ہے اور ہزار برس ایک دن کے برابر"

۴-خدا لاتبدیل ہے ۔ "تو نے قدیم سے زمین کی بنیاد ڈالی ۔

آسمان تیرے ہاتھ کی صنعت ہے وہ
نیست ہو جائیں گے پر تو باقی رہے گا ۔
بلکہ وہ سب پوشاک کی مانند پرانے
ہو جائیں گے تو ان کو لباس کی مانند
بدلے گا اور وہ بدل جائیں گے ۔ پر تو
لاتبدیل ہے ۔
اور تیرے برس لاانتہا ہوں گے "!

(زبور ۱۰۲: ۲۴-۲۶؛ عبرانیوں ۱: ۱۰-۱۲ ۔ ان آیات میں زبور کا اقتباس ہے)

اس صفت سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ خدا کا برتاؤ ہر وقت یکساں رہتا ہے خدا نے ایسی ہستیاں اپنی مرضی سے پیدا کیں جو بدلتی رہتی ہیں اور ان کے تغیرات کے موافق ان کے ساتھ خالق کا برتاؤ بدلتا ہے ۔ ورنہ خدا خود تبدیل ہوتا ۔ بدلنے والی شے کے ساتھ غیر تبدیل کا تعلق بدلتا ہے ۔ ورنہ لاتبدیل کو بدلنے کی ضرورت ہوتی مثلاً آگ ایک چیز ہے پر وہ لکڑی کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے ۔ چکنی مٹی کو سخت کر دیتی ہے سیسہ کو پگھلاتی ہے پانی کو بھاپ کر دیتی ہے ۔

چنانچہ جب انسان راہِ راست سے بھٹک جاتا ہے یا بھٹکنے کے بعد تائب ہوتا تو اس کے ساتھ خدا کا برتاؤ تبدیل ہوتا ہے ۔

خدا کی لاتبدیلی کو سوچتے وقت اس بات کو مدِ نظر رکھیں کہ خدا "زندہ خدا"

یعنی ارادہ اور کام کرنے والا ہے۔ پر خدا کے کاموں کا اس کی ذات پر کوئی اثر نہیں پڑتا
بعض فلسفیوں نے خیال کیا کہ اس کی لاتبدیلی کا مطلب یہ ہے کہ تمام کائنات اس
کے صدور سے پیدا ہوئے پر از روئے فلسفہ یہ ضروری نہیں معلوم ہوتا اور ہرگز
بائیبل کی تعلیم کے موافق نہیں۔

(ب) خلقت کے اعتبار سے خدا کی صفات

یاد رہے کہ درحقیقت فصل کے مضمون کی تقسیم از روئے انسان ہے خدا
کی ہر صفت اس کی ذات میں ہے۔ پر بعض صفات ہم پر اس وقت صفائی سے
ظاہر ہوتی ہیں جب ہم خلقت کو مدِّنظر رکھتے ہیں۔ ہمارے نقطۂ نگاہ سے
تو یہ اعتباری ہیں اور خلقت سے تعلق رکھتی ہیں پر خدا خلقت پر کسی طرح منحصر نہیں۔

۱۔ آزادی ۔ اصل میں خدا لامحدودی کا نتیجہ ہے۔ کوئی ہستی کسی بات
پر خدا کو مجبور نہیں کر سکتی۔ وہ اپنے ارادے سے وہ اپنی قدرت کو کسی موقعہ پر محدود
رکھ سکتا ہے۔

مثلاً وہ ایسی روحوں کو پیدا کر سکتا ہے جن کو قوتِ ارادہ اور کسی قدر
خودمختاری حاصل ہے۔ حالانکہ اس کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ روحیں خدا کے احکام
یعنی اس کی مرضی کے خلاف چلے۔ بائیبل کی صاف تعلیم ہے کہ خدا نے انسان
کو ایسا پیدا کیا۔ (پیدائش ۲۶:۱؛ زبور ۸:۱۳؛ یرمیاہ ۲۳:۲۴؛ زکریاہ
۳:۷ وغیرہ) نئے عہدنامہ میں بار بار لوگوں کو حکم دیا جاتا اور ان سے
التماس کیا جاتا ہے کہ وہ خدا کے حکموں کو مانیں۔ اور اس کی آواز کے شنوا
ہوں جس کا یہ مطلب ہے کہ اگر آدمی رضامند نہیں ہوتے تو خدا کی مرضی کے

خلاف چل سکتے ہیں۔ بہر حال یہ صرف خدا کی اجازت سے ہے۔ کیونکہ اس نے پاک کلام میں یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ بنی آدم رضامندی سے اس کے حکموں کو مانے اور اس سے محبت رکھے ورنہ خدا کے لئے مشکل نہ تھا کہ کاٹھ کی پتلیاں خلق کرے جو مجبوراً اس کی مرضی پر چلیں۔ جیسے اجرام فلک چلتے ہیں۔

۲۔ **قادرِ مطلق**۔ خدا جو چاہتا ہے، ہمیشہ کر سکتا ہے "خدا سے سب کچھ ہو سکتا ہے" (مرقس ۱۰: ۲۷) سب کچھ کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ایسا جملہ بنائیں جو صرف نحو کے لحاظ سے درست ہو پر درحقیقت کوئی مطلب نہیں اور پھر دعویٰ کریں کہ اگر خدا قادرِ مطلق ہے تو یہ بھی کر سکتا ہے۔ مثلاً یہ دعویٰ کرنا کہ خدا ایسا انتظام کرے کہ کوئی واقعہ ایک ہی وقت میں ہو اور نہ ہو یا انسان چلنے کے قابل ہو پر ہمیشہ نیکی چلنے پر مجبور ہو۔ درحقیقت ان جملوں کا کوئی مطلب نہیں۔

یاد رہے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ خدا قادرِ مطلق ہے تو اس کا یہ دعویٰ بھی ہے۔ کہ خدا کے لئے کوئی مشکل نہیں اور اس کو تدبیر اور ترکیب کی ضرورت نہیں۔ خدا کا ارادہ اس کے ہر کام کے لئے کافی ہے۔

۳۔ **ہمہ جا حاضر**۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ خدا ہر وقت اور ہر جگہ سب کچھ جانتا ہے۔ اور پورے طور پر اپنی قدرت کو کام میں لا سکتا ہے۔ ہم اس خیال کو ہر گز دل میں جگہ نہ دیں کہ خدا کسی لطیف مادّہ کی مانند ہر جگہ پھیلا ہوا ہے خدا کی حضوری کے یہ معنی نہیں پر وہ ہر جگہ ہماری دعا سن سکتا ہے اور ہر وقت اور ہر جگہ ہماری مدد کر سکتا ہے۔ چنانچہ:۔

۴۔ **خدا عالم الکل ہے**۔ وہ بعض اوقات عالم الغیب کہلاتا ہے۔

درپے شک جو باتیں ہم سے پوشیدہ ہیں وہ خدا کے سامنے کھلی ہیں۔ ایک مشہور
دعا میں یوں مرقوم ہے "تیرے آگے سب کے دل کا حال کھلا ہے، تجھے سب کی
مرادیں معلوم ہیں اور تجھ سے کوئی بھید چھپا نہیں"۔ پر خدا کو عالم الکل کہنا زیادہ مناسب
ہے۔ وہ تمام موجودات اور ان کے تعلقات سے پورے طور پر ہر وقت واقف ہے
انسان کا علم ایسا ہے کہ جن چیزوں کو وہ جانتا ہے صرف ایک یا سب سے زیادہ
دو تین کسی وقت اس کے دماغ میں روشن ہیں پر خدا سب کچھ ہر وقت صفائی سے
جانتا ہے۔ اور کوئی باریکی پل بھر بھی اس سے چھپی نہیں۔

خدا کو نہ صرف تمام موجودات۔ مادّہ وارواح اور ان کے تعلقات ۔ ماضی۔
حال اور مستقبل یعنی تمام عالمین کے کل حال کا علم ہے بلکہ تمام ممکن اور غیر ممکن
عالمین بھی کسی قسم کی حدود کے بغیر عالم الکل ہیں۔

۵۔حکمت ۔مسلمانوں کے ہاں اللہ حکیم کہلاتا ہے اور اگرچہ مسیحی یہ لفظ
کم استعمال کرتے ہیں بہر حال خدا کی حکمت پر زور دیا جاتا ہے اور دونوں عہدنامے
اس میں متفق ہیں۔

"اے خداوند! تیری صنعتیں کیسی بے شمار ہیں تو نے یہ سب کچھ
حکمت سے بنایا"۔ (زبور ۱۰۴: ۲۴)

"خداوند نے حکمت سے زمین کی بنیاد ڈالی"۔ (امثال ۳: ۱۹)

درحقیقت امثال میں حکمت کے بارے میں ایسے ایسے جملے استعمال کئے
گئے کہ گویا وہ ایک شخص ہے۔ مثلاً "کیا حکمت پکار نہیں رہی؟....... وہ راہ
کے کنارے اونچی جگہوں کی چوٹیوں پر...... وہ زور سے پکارتی ہے۔ اے

آدمیو! میں تم کو پکارتی ہوں" امثال ۸: ۱-۴ پھر لوقا میں "خدا کی حکمت نے کہا" (۱۱: ۴۹) یعنی خدا کی حکمت نے فرمایا۔" واہ! خدا کی دولت اور حکمت اور علم کیا ہی عمیق ہیں۔" (رومیوں ۱۱: ۳۳) "خدا کی طرح طرح کی حکمت" (افسیوں ۳: ۱۵) حکمت اور علم میں فرق ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی آدمی عالم ہو پر اس میں حکمت نہ ہو۔ انگلستان کے بادشاہ جیمس اول کے بارے میں کسی نے کہا کہ وہ سب سے عالم احمق تھا۔ جو کبھی تخت نشین ہوا۔ ممکن ہے کہ تہمت ہو پر اس سے علم اور حکمت کا فرق معلوم ہو جاتا ہے حکمت یہ ہے کہ علم ہر موقعہ پر صحیح طور پر استعمال کیا جائے خدا میں کمال حکمت ہے۔ وہ ہر وقت ہر موقعہ پر وہ ہی کرتا ہے جو پورے طور پر اس موقعہ کے لئے مناسب ہے۔

۶۔ خدا راست اور بھلا ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے تو فی زمانہ بہت سے لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر یہ دعویٰ سچ ہے تو کیا وجہ ہے کہ دنیا اس قدر دکھوں سے بھری ہے؟ یہ اعتراض بے سود اور بے مطلب نہیں پر اس کا جواب ابھی نہیں دیا جا سکتا ہے۔ خادم کا ارادہ ہے کہ دوسرے باب کے اثنا یا اس کے آخر میں اُس پر غور کرے۔ (دیکھو میری کتاب "خدا کی بابت مسیحی دین کی تعلیم" ضمیمہ صفحہ ۱۵۱ الخ)

خدا انسان سے محبت رکھتا اور اس کا بھلا چاہتا ہے اور جو لوگ خدا سے میل ملاپ کر لیتے اور خداوند یسوع مسیح کے وسیلے سے خدا سے محبت رکھتے ہیں۔ اگرچہ ان کو دنیا میں تکلیف بھی ملے تو بھی درحقیقت خوش وقت ہیں" ضرور ہے کہ ہم بہت مصیبتیں سہہ کر خدا کی بادشاہی میں داخل ہوں (اعمال ۱۴: ۲۲)" دنیا میں مصیبت اٹھاتے ہو لیکن خاطر جمع رکھو میں دنیا پر غالب آیا ہوں۔" یوحنا ۱۶: ۳۳)

"سب چیزیں مل کر خدا سے محبّت رکھنے والوں کے لئے بھلائی پیدا کرتی ہیں۔"
(رومیوں ۸: ۲۸)

حقیقت یہ ہے کہ چاہے دعوی صحیح ہو چاہے غلط۔ بائیبل یہ دعوی کرتی اور یہ سکھاتی ہے کہ خدا راست اور بھلا ہے اور ساتھ ہی اس کے تسلیم کرتی ہے کہ دنیا گناہ اور دکھ سے بھری ہوئی ہے۔ ایسے ایسے مسیحی گذرے ہیں جنہوں نے سکھایا کہ خدا سچے مسیحوں کو تمام دکھوں سے بچائے گا۔ مگر یہ بائیبل کی تعلیم نہیں۔ بعض زبوروں میں اس زمانہ کے یہودیوں کا جن کا ایمان نامکمّل تھا یہ یقین ظاہر کیا جاتا ہے کہ نیکوکار آدمی دنیا میں خوشحال ہوگا۔ ایوبؔ کی کتاب اس غلط فہمی اور ضعف الاعتقادی کے خلاف لکھی گئی۔

جو کچھ خدا کرتا ہے وہ بھلا ہے پر اب تک ہم اس کے کاموں کا تھوڑا سا حصّہ تھوڑے وقت تک معلوم کرتے ہیں۔ پس اپنے تجربے سے کچھ بھی ثابت نہیں کر سکتے۔ بہرکیف اکثر ایماندار مسیحی مانتے ہیں کہ ان کا تجربہ خدا کی بھلائی دکھاتا ہے خصوصاً وہ جو اپنا وقت اوروں کی مدد کرنے میں صرف کرتے ہیں۔

خدا تمام خوبیوں کا سرچشمہ ہے "ہر اچھی بخشش اور ہر کامل انعام ..... اوپر سے نوروں کے باپ کی طرف سے ملتا ہے جس میں نہ کوئی تبدیلی ہو سکتی ہے اور نہ گردش کے سبب سے اس پر سایہ پڑتا ہے۔ (یعقوب ۱: ۱۷) خدا کا جلال وجمال تمام دنیا کی شان وشوکت حُسن وخوبصورتی سے بڑھ کر ہے۔ خدا کا دیدار حاصل کرنا سب سے بڑی کامیابی ہے۔ اور اس کے لئے تمام دنیاوی فائدوں کو بالائے طاق رکھنا چاہیئے۔ وہ جو تمام دنیاوی حُسن، خوبصورتی، علم، دلچسپی، الغرض تمام خوبیوں کا سرچشمہ

ہے اس کا جلال وجمال ان سب سے اعلیٰ وافضل ہے ۔

۶۔ **خدا کی پاکیزگی یا قدسیت** :۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ بہت سے لوگ "پاک" اور "طاہر" کے ایک ہی معنی سمجھتے ہیں یعنی پاکیزگی کو مادّی اور جسمانی سمجھتے ہیں ۔ایسے ایسے لوگ نہیں سمجھ سکتے کہ خدا کیوں قدّوس اور پاک کہلائے۔ اگر وہ کچھ بھی سمجھتے ہیں تو یہ ہے کہ خدا کو مادّی اور جسمانی نجاست سے تنفر ہے ۔خدا نے اپنے حسنِ انتظام سے یہودیوں کو طہارت کے ذریعے سے پاکیزگی کا مطلب سمجھایا ۔اور نبیوں کی زبانی ان کی ہدایت فرماتا رہا یہاں تک کہ خداوند یسوع مسیح ان کو اصلی پاکیزگی کی تعلیم دے سکا ۔

خدا کی پاکیزگی کا یہ مطلب ہے کہ خدا ہر قسم کی بدی اور بُرائی سے بَری ہے۔ باری تعالیٰ کی آنکھیں ایسی پاک ہیں کہ وہ بدی کو دیکھ نہیں سکتا ۔اور کج رفتاری پر نگاہ نہیں کرسکتا ۔ (حبقوق ۱: ۱۳) نہ تو اس میں کوئی عیب ہے اور نہ وہ بُرائی کی برداشت کرسکتا ہے ۔حالانکہ وہ گناہ گار کی برداشت کرتا ہے تاکہ اُسے گناہ سے بچائے ۔ساری کائنات گویا پُکارتی ہے کہ بُرائی کا نتیجہ بُرا ہے تمام تواریخ سے ظاہر ہے کہ بدی کرنے والی قومیں ضرور اپنی برائی کی سزا پاتی ہیں ۔خدا کی قدسیت ایسی ہے کہ مخلوق انسان اس سے ڈرتا ہے ۔اور جب غور کرتا ہے تو اس کو ناراض کرنے سے خوف کرتا ہے ۔اس نے فرمایا کہ "تم پاک ہو کیونکہ میں جو تمہارا خداوند خدا ہوں پاک ہوں ۔"

چنانچہ خدا سچا اور وفادار ہے ۔اور اس کا ہر ایک کام راست ہے ۔اور وہ منصف بھی ہے ۔جو ہر ایک آدمی کو اس کے کاموں کے مطابق اس کو بدلا

دے گا۔ (زبور ۶۲: ۱۲) وغیرہ) وہ اپنے وعدوں کو پورا کرتا ہے اور صادق القول کہلاتا ہے۔

۷۔ یہ مشہور آیت ہے کہ "خدا محبت ہے" (یوحنا ۴: ۱۶) اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ خدا کی تمام صفتوں میں وہ صفت جو سب سے زیادہ اس کی ماہیت کو ظاہر کرتی ہے محبت ہے۔ وہ انسان سے محبت رکھتا ہے۔ خداوند یسوع مسیح نے یہ بار بار سکھایا۔ کئی ایک تمثیلیں یہ سکھاتی ہیں مثلاً مُسرف بیٹے کی تمثیل۔ پر ممکن ہے کہ چونکہ انسانی محبت میں اکثر نقص ہوتے ہیں مثلاً خود غرضی اس لئے لوگ خدا کی محبت کو غلط طور پر سمجھتے ہیں۔ خدا کی محبت یہ ہے کہ جو کچھ ہر ایک آدمی کی اصلی بہتری کے لئے درکار ہے خدا اس آدمی کو وہی چیز دے گا۔ اور اس کے ساتھ وہی برتاؤ کرے گا۔ جب کسی فرد بشر کو رنج ہوتا ہے تو خدا اس کا ہمدرد و غم گسار ہے۔ پر جب کسی کو رنج و مصیبت کی ضرورت ہوتی ہے تو اس کو رنج میں ڈلنے یا اس پر مصیبت لانے سے نہیں جھجکتا۔ ایک عورت کی لڑکی کو مہلک بیماری ہوئی جس کا علاج صرف خاص ہسپتال میں ہو سکتا تھا پر اس عورت کی ناقص محبت اس لڑکی کو جُدا نہ ہونے دیتی تھی اور لڑکی مر گئی۔ بعض ماں باپ لڑکوں کو تادیب اس لئے نہیں کرتے ہیں کہ ان کے رونے کی برداشت نہیں کر سکتے اور لڑکے بگڑ جاتے ہیں یہ محبت نہیں، محبت کی بگاڑ ہے۔ خدا کی محبت ایسی نہیں۔ اگرچہ اپنی مصلحت سے ہم کو تکلیف بھی دے تو بھی ہم اس پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔

۸۔ **خدا کا جلال**:۔ خدا جلیل وجمیل ہے۔ اس دنیا کی جتنی خوبیاں۔ جتنی خوشی اور جتنی لذت ہے سب خدا کے جلال و جمال کا پرتو ہے۔ حالانکہ انسان

ان کو غلط طور پر استعمال کرنے سے گناہ بھی کرتا ہے۔ خدا سے الگ رہنے کا آخرکار یہ نتیجہ ہوگا کہ وہ روح جو خدا سے الگ رہتی ہے ان سب خوبیوں سے بھی الگ ہوگی۔ پر خدا کا جلال سب سے زیادہ اس میں ظاہر ہوا کہ اس نے مسیح میں ہو کر تکلیف، خدمت کی سختیاں بلکہ موت اس لئے گوارا کی کہ بنی آدم کو گناہ سے مخلصی دے۔ جب یہوداہ اسکریوتی نے مسیح کی محبت کو رد کر دیا اور اس کے پکڑنے کے لئے نکلا تو یسوع نے فرمایا: "اب ابنِ آدم نے جلال پایا اور خدا نے اس میں جلال پایا (یوحنا ۱۳: ۳۱) تمام دنیاوی شان و شوکت خدا کے جلال کے لحاظ سے کچھ بھی نہیں پر اس کی محبت اور اس کی رحمت اس کے جلال کا سب سے بڑا حصہ ہے۔

باب دوم

انسان

فصل اوّل

انسان کی حقیقت

انسان مخلوق ہے۔ نہ تو وہ خدا سے نہ صدور سے پیدا ہوا۔ اور نہ اس کی روح الٰہی ہے۔ شروع ہی سے بائبل سکھاتی ہے کہ انسان کو خدا نے خلق کیا۔ پیدائش میں بتایا گیا ہے کہ "خدا نے انسان کو۔۔۔۔ پیدا کیا۔" (۱: ۲۷) اور بار بار پاک کلام میں اس بات کا ذکر ہے۔ (دیکھو استثنا ۴: ۳۲، یسعیاہ ۴۳: ۷، واعظ ۱۲: ۱ کلسیوں ۱: ۱۵، رومیوں ۱: ۲۱-۲۵) اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمام عبرانی اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ انسان مخلوق ہے۔ اور خدا اس کا خالق ہے۔ اور دیگر مسلّم باتوں کی طرح اس کا زیادہ ذکر نہیں ہوتا۔ بلکہ اس پر اور تعلیم مبنی ہوتی ہے۔ بعض مذہبوں میں یہ تعلیم ہے کہ انسان کی روح الٰہی ہے۔ اور خدا سے صادر (مثلاً ہندومت) مگر یہ دین عیسوی کی تعلیم کے خلاف ہے۔

چونکہ انسان میں وہ خاص صفات ہیں جو دوسرے مخلوقات میں نہیں اس لئے انسان اکثر اشرف المخلوقات کہلاتا ہے۔ پاک کلام میں یہ بتلایا گیا ہے کہ خدا نے انسان کو دیگر مخلوقات کا مالک بنایا۔ (پیدائش ۲۸:۱، زبور ۸-۶:۸ اور ۱۶:۱۱۵) لیکن خاص بات یہ ہے کہ بائیبل کے مطابق خدا نے "انسان کو اپنی صورت پر اپنی شبیہہ کی مانند بنایا" (پیدائش ۲۶:۱) اس بات کی طرف اور مقاموں میں اشارہ ہے مثلاً (کلسیوں ۱۵:۳، ۱کرنتھیوں ۷:۱۱، یعقوب ۹:۳) یاد رہے کہ خدا کی صورت جسمانی نہیں بلکہ روحانی واخلاقی ہے۔ انسان میں قوتِ ارادہ، قوتِ تخیلہ، سے لگن ہی، اپنی شخصیت کی پہچان، نیک و بد کی پہچان اور یہ قابلیت کہ انسان خدا کو پہچان سکتا ہے، نیکی کی طرف میلان یہ وہ باتیں ہیں جو خاص طور پر انسان کو حیوان مطلق سے جدا اور ممتاز کرتی ہیں۔ خدا کی بہت سی صفات انسان میں نہیں۔ مگر مذکورہ بالا صفات وہ ہیں جن کے سبب سے یہ بتایا گیا کہ انسان خدا کی "صورت پہ اس کی شبیہہ کی مانند" خلق ہوا۔

بنی نوع انسان ایک ہی نسل سے پیدا ہوئے یہ پیدائش کی تعلیم ہے۔ اور اگرچہ پیدائش کے بیانات شاید تمثیلیں سمجھی جائیں تو بھی تمام بائیبل میں یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ خدا کی نظر میں تمام انسان گراں قدر ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ خدا نے عبرانیوں کو چنا کہ اس کی مرضی سے واقف ہوں، وحدانیت کو پہچانیں اور اس تعلیم کے محافظ ہوں، اور دنیا میں بشارت کریں۔ یہودیوں نے اپنے آپ کو نجات کا وارث سمجھ کر دیگر اقوام کی ناقدری کی لیکن یہ پاک کلام کی تعلیم کے برعکس تھی اور نئے عہدنامہ میں انسان کی یگانگی بڑی صفائی سے سکھائی جاتی ہے "خدا نے دنیا

سے ایسی محبت رکھی کہ اس نے اپنا اکلوتا بیٹا بخش دیا تاکہ جو کوئی اس پر ایمان لائے ہلاک نہ ہو بلکہ ہمیشہ کی زندگی پائے" (یوحنا ۱۶:۳) پھر پولوس رسول نے فرمایا کہ یہودی اور یونانی خدا کی نظر میں برابر ہیں (رومیوں ۱۱-۹:۲؛ ۱۲-۱۵:۳) پھر وہ بڑی صفائی سے گلتیوں کے خط میں ایسے ہی تعلیم دیتا ہے "تم سب جتنوں نے مسیح میں شامل ہونے کا بپتسمہ لیا مسیح کو پہن لیا نہ کوئی یہودی رہا نہ یونانی، نہ کوئی غلام نہ کوئی آزاد، نہ کوئی مرد نہ کوئی عورت کیونکہ تم سب مسیح یسوع میں ایک ہو" (گلتیوں ۳:۲۸-۲۷) وہ تمام امتیاز اور حسد، وہ تمام قومی فخر اور غرور جو دنیا میں پھیلے ہیں، انجیل جلیل کی تعلیم کے بالکل خلاف ہیں۔ خدا کی نظر میں برہمن اور ڈوم دونوں گراں قدر ہیں۔ دونوں کے لئے مسیح یسوع آیا، موا اور جی اٹھا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمام انسان برابر ہیں جیسا کوئی چھ فٹ لمبا اور کوئی صرف ساڑھے پانچ اور اسی طرح انسان کی صفتوں میں فرق ہیں جسمانی بھی اور عقلی بھی لیکن خدا کی بادشاہی میں سب کے حقوق برابر ہیں۔ اور خدا سب سے برابر محبت رکھتا ہے "خدا کے ہاں کسی کی طرف داری نہیں" (رومیوں ۲:۱۱) "تمام انسان خدا کی صورت پر پیدا ہوئے۔ اور سب میں وہ صورت تازہ کی جا سکتی ہے" (کلسیوں ۳:۱۵)

جب ہم کہتے ہیں کہ انسان مخلوق ہے تو مطلب یہ ہے کہ اس کا جسم اس کی عقل اس کی روح سب مخلوق ہیں بچے تو ماں باپ سے پیدا ہوتے ہیں پیدا کرنے کی قوت خالق کی بخشش ہے۔ اور اگر ہم مانتے ہیں کہ خدا ہر جگہ اپنی مرضی پوری کرتا ہے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر بچہ خدا کی پیدائش ہے۔

بعض نے خیال کیا کہ انسان کی روح خدا سے صادر ہوتی ہے۔ اور وحقیقت الہی ہے نہ بائیبل کی تعلیم کے خلاف ہے۔ مگر ہمہ اوستی کے معتقد مانتے ہیں۔ پر ہمہ اوستی کے کی رو سے سب کچھ خدا میں داخل ہے۔ یہ سوال کہ آیا ہر انسان کی روح خدا کی خاص مخلوق ہے جو موروثی جسم میں ڈالی جاتی ہے یا خود موروثی ہے۔ ایسا ہے کہ انسان ۔۔ کا جواب نہیں دے سکتا۔ اور جو لوگ خدا کی ہمہ جا حاضری کو مانتے ہیں۔ ان کو ۔۔ فیصلہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ موروثی صفات بھی اسکی خلقت ہیں۔

یہ گمان کہ انسان کی روح بار بار اس جہان میں پیدا ہوتی ہے۔ پورے طور پر پا[illegible] کلام کی تعلیم کے خلاف ہے۔ صرف ایک ہی آیت میں اس کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے یعنی (یوحنا ۹: ۲) جب شاگردوں نے جنم کے اندھے کے بارے میں سوال کیا۔ "کس نے گناہ کیا تھا جو یہ اندھا پیدا ہوا۔ اس شخص نے یا اس کے ماں باپ نے"؟ کوئی ثبوت یا گواہی نہیں کہ اس زمانے میں یہودی تناسخ مانتے تھے۔ مگر بعض یہ مانتے تھے کہ خدا انسان کو پیشتر سے ان گناہوں کی سزا دیتا تھا جو وہ کرنے کو تھا۔ (اس کا ذکر آگے بھی آئے گا۔)

ارتقاء اور انسان کی پیدائش از روئے ارتقا انسان کا جسم اور دماغ رفتہ رفتہ کسی حیوان سے پیدا ہوئے۔ جو مسیحی مسلم ارتقا کے قائل ہیں وہ مانتے ہیں کہ اول ارتقا تخلیق کا طریقہ ہے۔ دوم خدا نے ان عقل مند حیوان کو جو انسان کے باپ دادا ہیں روح بخشی۔ "خدا نے ..... انسان کو بنایا اور اس کے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا" پیدائش ۲: ۷ یعنی پہلے خدا نے انسان کا حیوانی جسم تیار کیا۔ اور پھر اس کو روح اور وہ صفات بخشیں جس کے سبب سے وہ انسان بنا۔ یاد رہے کہ مسئلہ ارتقاء

ثابت نہیں ہوا اور غالباً ثابت نہیں ہو سکتا۔ بہرحال فی زمانہ جن لوگوں نے اعلیٰ تعلیم پائی ہے وہ زیادہ تر اس مسئلہ کے قائل ہیں اور بے شک اس کے سچا ہونے کی بہت سی دلائل ہیں۔ حالانکہ وہ پایۂ ثبوت تک نہیں پہنچیں۔

فصل دوم

خدا کی صورت

ہم دیکھ چکے ہیں کہ بائیبل کی یہ تعلیم ہے کہ انسان اگرچہ صدور سے نہیں پیدا ہوا بلکہ خلق ہوا تو بھی خدا کی صورت پر اس کی شبیہ کے موافق بنایا گیا۔ یہ صورت اور شبیہ کیا ہیں؟ مذکورہ بالا فصل میں خدا کی صورت کی بابت یہ لکھا گیا کہ اس میں ذیل کی باتیں شامل ہیں۔

قوتِ ارادہ۔
قوتِ متخیلہ۔
بے گناہی۔
اپنی شخصیت کی پہچان۔
نیک و بد کی پہچان۔
خدا کی پہچان حاصل کرنے کے لئے عقل۔
نیکی کی طرف میلان۔

یہ صفات وہ ہیں جن کے سبب سے انسان نہ صرف حیوان ناطق ہے۔ بلکہ

شخص کہلانے کے قابل ہے۔ مُقدّس اتھینیئس (Athanasius) نے لکھا کہ "یہ صورت مسیح ہے" یعنی چونکہ انسان میں خدا سے کچھ مشابہت ہے لہذا خدا کے بیٹے اقنوم ثانی کا تجسم ممکن تھا۔ اگر خدا انسان سے بالکل جداگانہ ہوتا۔ یہاں تک کہ انسان کی صفتیں اور خدا کی صفتیں بالکل ایک دوسرے کے برعکس ہوتیں تو تجسم ممکن نہ ہوتا۔ نیز خدا کی پہچان ممکن نہ ہوتی۔ کیونکہ ہم صرف ان چیزوں یا شخصوں یا روحوں کو پہچان سکتے ہیں جن سے ہم کو کچھ نہ کچھ موافقت حاصل ہے۔

پاک کلام کی تعلیم میں اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ خدا ارادہ کرتا ہے یعنی اس کی راست اور مبارک مرضی پر زور دیا جاتا ہے۔ پولس "خدا کی نیک اور پسندیدہ اور کامل مرضی" کا ذکر کرتا ہے۔ (رومیوں ۲:۱۲) بلکہ بائبل کی تلاوت کرنے سے بہت جلد ظاہر ہو جاتا ہے کہ خدا کی مرضی کا بار بار ذکر آتا ہے اور مثالوں کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ انسان کی قوتِ ارادہ اس الٰہی صورت میں جو خدا نے بخشی ہے داخل ہے۔ لیکن قوت تخیلہ بھی لازمی ہے۔ جس سے ہم غیر موجود چیز کا دل میں تصوّر کرتے ہیں۔ قوت ارادہ بغیر تخیلہ کے ممکن نہیں۔ کیونکہ ارادہ ان کاموں کا ہوتا ہے جو ابھی نہیں کئے گئے۔ پھر بھلائی و برائی (نیک و بد) کی پہچان کی بھی ضرورت ہے ورنہ قوتِ ارادہ ناقص ہوتا۔ کیونکہ یہ قوت مفید طور پر اسی وقت کام میں آتی ہے۔ جب ہم معلوم کرتے ہیں کہ ہر کام اچھا یا بُرا ہے۔

انسان معصوم یعنی بے گناہ پیدا ہوا اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کا راستی کی طرف میلان تھا۔ کیونکہ بے گناہ گناہ کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ ہم تو گناہ گار ہیں پر تو بھی بعض گناہوں کی طرف جو ہم نے کبھی نہیں کئے کوئی میلان نہیں رکھتے۔

ممکن ہے کہ شخصیت میں یہ بھی داخل ہے کہ شخص اپنی شخصیت پہچانے اور معلوم کرے کہ میں فاعل ہوں۔ نوزائیدہ بچے شخص نہیں کہلا سکتے۔ مگر وہ رفتہ رفتہ اپنی شخصیت کو پہچاننے لگتے ہیں اور جیسے ان کی شخصیت بڑھتی جاتی ہے ویسے ہی شخصیت کی پہچان بھی بڑھتی ہے۔

بائبل کی تعلیم ہے کہ انسان خُدا کو پہچاننے اور اس سے محبت رکھنے کے لئے پیدا ہوا۔ یہ آیت مشہور ہے "تو اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری طاقت سے اپنے خداوند اپنے خدا سے محبت رکھ۔" (استثنا ۵:۶، لوقا ۲۷:۵ وغیرہ) اس محبت کا امکان اس بات پر نہیں ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا۔

(بعض مفسروں نے خدا کی صورت اور اس کی شبیہ میں امتیاز کرنا چاہا۔ پر یہ امر ضروری نہیں بلکہ غلط ہے اگرچہ یہ دو الفاظ استعمال ہوئے تو بھی دو مفہوم نہیں۔ (پیدائش ۲۶:۱ "ہم انسان کو اپنی صورت پر اپنی شبیہ کی مانند بنائیں") عبرانی محاورے کے موافق اکثر ایک ہی مفہوم کے لئے دو الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اس کی بہت سی مثالیں زبور اور انبیاء کے صحیفوں میں ملیں گی۔ اردو میں بھی یہ دستور ہے مثلاً "میں بالکل حیران و پریشان ہوں"۔]

گذرے زمانے میں لوگ خدا کی صورت سے یہ نتیجہ نکالتے تھے کہ خدا نے آدم کو تمام اچھی صفتوں اور قابلیت سے مالا مال کیا۔ یہاں تک کہ بشپ ساؤتھ (South) نے فرمایا کہ "ارسطاطالیس محض آدم کی بگاڑ تھا"۔ مگر حقیقتاً اس خیال کی بنیاد بائبل میں نہیں ملتی۔ ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ پہلے انسانوں میں

نیک، خداترس، خداپرست اور عالم و فاضل بننے کی لیاقت تھی اگر انسان راہ راست پر چلتے رہتے تو اس وقت دنیا بہشت کا ٹکڑا ہوتی۔

کیا انسان غیر فانی بنا؟ ہم کو معلوم ہے کہ انسان کے اس دنیا میں برپا ہونے سے پہلے جاندار مرتے تھے۔ کیونکہ چٹانوں اور پتھروں میں اس کی ہڈیاں ملتی ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ انسان راہِ راست سے نہ بھٹکتے تو نہ مرتے۔ مگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر انسان گناہ نہ کرتے تو موت وہ ڈراؤنی چیز نہ ہوتی جو اس وقت ہے۔ اگر ہم کو یہ علم ہوتا کہ موت کے بعد خدا کے ہاں خوشی و خرمی سے رہیں گے تو موت سے زیادہ نہ ڈرتے۔ جیسے اس وقت بھی ڈرتے ہیں۔ انسان کے بگڑنے کے باوجود بہت سے ایماندار مسیحی موت سے بہت کم ڈرتے ہیں۔ "موت کا ڈنک گناہ ہے۔" پیدائش کی کتاب میں جہاں آدم کی موت کا ذکر ہے اس سے محض جسمانی موت مراد نہیں۔ یہ لکھا ہے "جس روز تو نے اس میں سے (یعنی نیک و بدکی پہچان کے درخت میں سے) کھایا تو مرا۔" لیکن بیان ہے کہ جب اُنھوں نے اس میں سے کھایا تو خدا اور فردوس سے جدائی یعنی روحانی موت ہوئی پر جسمانی موت فوراً نہ ہوئی

فصل سوم

انسان کا گرنا

دوسری فصل میں ہم نے دیکھا کہ انسان از روئے بائبل بے گناہ پیدا ہوا۔ خدا کو پہچانتا تھا۔ اس سے رفاقت رکھتا۔ اس کے حکموں کو مانتا تھا۔

راستی کی طرف مائل تھا۔ مگر گرنے کے بعد یہ حالت نہ رہی۔ اکثر مذاہب سکھاتے ہیں کہ ایک زمانہ تھا۔ جبکہ بنی آدم نیک اور خدا ترس تھے ان کی عمر دراز اور ان کی قوت کافی و دائی تھی پر یہ زمانہ بہت پرانا سمجھا جاتا ہے۔ اور دورِ حاضرہ کو انسان کے بگاڑ کا زمانہ مانا جاتا ہے۔ خود پیدائش کی کتاب میں ذکر ہے کہ انسان کی بے گناہی جلد جاتی رہی۔

درحقیقت سب دیکھ سکتے ہیں کہ انسان کا حال ٹھیک نہیں۔ بیسویں صدی کے شروع میں جیسے بوڑھوں کو یاد ہے یہ خیال تھا کہ بہت جلد جنگ موقوف ہو جائے گی تعلیم اور علم طب کے پھیلنے سے انسان کی تکلیفیں اور برائیاں جاتی رہیں گی لیکن شاید کسی صدی میں ایسی خونناک جنگیں کبھی نہ ہوئیں اور اب ۱۹۵۰ء میں معلوم ہوتا ہے کہ شاید آدمی اپنی شائستگی اور تمدن کے تمام آثار اور فوائد ایٹم بم یا ہائیڈروجن بم کے ذریعے سے برباد کر دیں گے۔ ایک شخص کا ذکر ہے جس کے پاس کافی روپیہ تھا۔ اور اس نے اپنے لئے ایک عالی شان محل بنوایا۔ ہر کمرہ لطیف و نفیس چیزوں سے آراستہ کیا گیا۔ علم حاصل کرنے کے لئے نہایت عمدہ کتب خانہ تھا۔ ہر قسم کے باجے تھے۔ غرض ایسا کوئی مکان تمام شہر میں نظر نہیں آتا تھا۔ پھر جب سب تیار ہو چکا۔ اور اس کا مالک اس میں رہنے لگا تو پاگل ہو گیا اور آگ لگا کر اپنے محل کو جلا دیا بلکہ خود اس کے اندر ہلاک ہوا۔ یہ بنی آدم کی ایک تمثیل ہے۔ انتظامِ قدرت پر آدمیوں کی اتنی طاقت اور اتنا تسلط کبھی نہ تھا۔ جتنا اب ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پاک کلام کی وہ آیت پوری ہو رہی ہے جس میں یہ لکھا ہے۔ انسان کیا ہے ؟ تو نے اُسے خدا سے کچھ ہی کمتر بنایا ہے۔

اور جلال اور شوکت سے اُسے تاجدار کرتا ہے۔
تو نے اسے اپنی دستکاری پر تسلط بخشا ہے۔
تو نے سب کچھ اس کے قدموں کے نیچے کر دیا ہے۔
سب بھیڑ بکریاں گائے بیل
بلکہ سب جنگلی جانور۔
ہوا کے پرندے اور سمندر کی مچھلیاں۔
اور جو کچھ سمندر کے راستوں میں چلتا پھرتا ہے۔ (زبور ۸۔ ۴: ۸) آدمی ہوا میں پرندوں کی طرح اُڑتے ہیں۔ سمندر کے اندر مچھلی کی طرح تیرتے ہیں۔ بجلی کو گویا پال کر اپنا نوکر بنا دیا ہے۔ مہلک مرضوں کو موقوف کرنے کے لئے نئی نئی دوائیں ایجاد کیں۔ لیکن دنیا میں خوف، رنج، حسد، غصہ، بے انصافی، نفاق، افلاس، کال، تمام برائیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ ننانوے فی صدی انسان صلح چاہتے ہیں پر اُس جنگ کا اندیشہ ہے کہ جس میں انسان کا تمام اندوختہ جاتا رہے گا۔

اگر قوموں سے نظر ہٹا کر انسانی افراد پر نگاہیں کریں اور خود اپنے دل اور اپنی زندگی کو جانچیں تو کیا دیکھتے ہیں۔؟ "جب نیکی کا ارادہ کرتا ہوں تو بدی میرے پاس آموجود ہوتی ہے کیونکہ باطنی انسانیت کی رو سے تو میں خدا کی شریعت کو بہت پسند کرتا ہوں۔ مگر مجھے اپنے اعضا میں ایک اور شریعت نظر آتی ہے جو میری عقل کی شریعت سے لڑ کر مجھے اس گناہ کی قید میں لے آتی ہے جو میرے اعضا میں موجود ہے۔" الغرض جس نیکی کا ارادہ کرتا ہوں وہ تو نہیں کرتا۔ مگر جس بدی کا ارادہ نہیں کرتا اُسے کر لیتا ہوں۔" (رومیوں ۱۹۔۲۳۔۲۲: ۷) کیا یہ سچ نہیں؟

یہ سوال کبھی کریں کیا سبب ہے کہ ہمارے تجربہ کے لحاظ سے نیکی کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے اور نیکی نہ کرنا آسان ہے۔

پیدائش کی کتاب کے تیسرے باب میں بیان کیا جاتا ہے کہ "سانپ نے حوا کو ورغلایا اور آدم و حوا دونوں نے خدا کی حکم عدولی کی جس کے سبب وہ باغ عدن سے باہر کردیئے گئے۔ خادم کے خیال میں یہ بیان تمثیلی ہے۔ اس میں انسان کے گناہ میں پھنسنے کے طریقہ کی عمدہ تصویر کھینچی گئی ہے۔ اوّل اس بات کو دل میں جگہ دینا کہ شائد کوئی گناہ درحقیقت برا نہیں اور اس کا منع کرنا زیادتی میں داخل ہے۔ "کیا واقعی خدا نے کہا ہے کہ باغ کے کسی درخت کا پھل تم نہ کھانا"؟ دوم گناہ کے برے نتیجہ پر شک کرنا۔ "تم ہرگز نہ مروگے" پھر گناہ کے ظاہری لطف پر غور کرنا۔ "عورت نے جو دیکھا کہ وہ درخت کھانے کے لئے اچھا اور آنکھوں کو خوشنما معلوم ہوتا ہے اور عقل بخشنے کے لئے خوب ہے تو اس کے پھل میں سے لیا اور کھایا۔" (پیدائش ۳: ۱-۶)

یہ تو پرانے عہدنامہ میں نہیں لکھا کہ آدم و حوا کی نافرمانی سے تمام بنی آدم گناہ میں مبتلا ہوئے پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ کہ درحقیقت سب آدمی گنہگار ہیں اور ہوتے ہیں۔ نئے عہدنامہ میں پولس نے ذکر کیا کہ ایک آدمی کے گناہ کے سبب سے سب گنہگار ہوئے (رومیوں ۵: ۱۲ ۔ ۱ کرنتھیوں ۱۵: ۲۲)
پر وہ یہ نہیں بتاتا کہ یہ گنہگاری موروثی ہے یا ورگنہگاروں کے گناہ کا نتیجہ ہے۔

بعض اوقات کہا گیا ہے کہ اگر پیدائش کا بیان تواریخی نہیں تو دین عیسوی غلط ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر انسان نہیں گرا تو اس کو اٹھانے کے لئے نجات

دہندہ کی ضرورت نہیں۔ جو ایسا کہتا ہے اس سے صرف اتنا کہنا چاہئے کہ وہ دنیا پر نظر دوڑائے اور اپنی زندگی اور اپنے باطن کی جانچ کرے۔ دونوں سے یہ ظاہر ہوگا۔ کہ آدمیوں نے گناہ کیا اور اب بھی کیا کرتے ہیں۔ اور ان کو بچانے والے کی سخت ضرورت ہے۔

کیا آدمی اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں؟ اگر بچا سکتے ہیں تو اب تک کیوں نہیں بچے؟ آدمی برائی میں ایسے جکڑے ہوئے نظر آتے ہیں جیسے جنگلی جانور یا چڑیا صیاد کے دام میں۔

انیسویں[19] صدی میں بہت سے لوگ سمجھتے تھے کہ تعلیم کی ترقی کے سبب سے بدی رفتہ رفتہ جاتی رہے گی۔ مگر علم کے بڑھنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ انسان قتل اور تباہی کے زیادہ خوفناک وسائل تیار کرتا ہے۔ بعض لکھتے تھے کہ بہت سے لوگ تمدن کے بگاڑ کے سبب سے برائی میں پھنستے ہیں اور اگر سب کو اچھے مکان ملتے تو وہ اچھے ہو جاتے۔ بہا گرچہ اس خیال میں جنداں سچائی ہے تو بھی پورے طور پر سچ نہیں۔ خادم نے خود ایک جگہ دیکھی جہاں جرائم پیشہ بہتروں کو پکے مکان دیئے گئے ہیں پر ان کا محلہ اس تمام شہر میں سب سے میلا ہے۔ (دیکھو ۲۔ پطرس ۲۲:۲)

از روئے ارتقا کہنا پڑے گا کہ انسان کا ارتقا بگڑ گیا۔ اور وہ ایسا نہیں جیسا ہونا چاہیئے۔ اور از روئے دین کہنا پڑتا ہے کہ انسان راستی سے دور ہو گیا[1] اور خدا کے مقاصد پورے نہیں کرتا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ انسان بالکل بگڑا ہوا ہے۔ اور زبور کی یہ آیات

پڑھتے ہیں۔

"خداوند نے آسمان پر سے بنی آدم پر نگاہ کی۔
تاکہ دیکھے کہ کوئی دانشمند
کوئی خدا کا طالب ہے یا نہیں۔
وہ سب کے سب گمراہ ہوئے وہ باہم نجس ہو گئے۔
کوئی نیکو کار نہیں۔ایک بھی نہیں۔"

(زبور ۳-۲:۱۴ + رومیوں ۳) یا یہ آیت "دل سب چیزوں سے زیادہ حیلہ باز ہے اور لاعلاج ہے۔" لیکن نہ تو ان آیات سے اور نہ کلام پاک کے کسی اور بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان بالکل بگڑ گیا ہے۔ ورنہ اس کو توبہ اور خداترسی کے لئے بلانا اور دعوت دینا بے مطلب ہوتا۔ بہرکیف یہ بے شک سچ ہے کہ انسان کا ہر کام گناہ آلودہ ہے۔ ہماری نیکی بھی خود بینی اور خود پرستی سے خالی نہیں۔ ہم نہ صرف اپنے تجربہ کے قائل ہیں (یہ ضروری ہے ورنہ ہم انسان نہ کہلا سکتے) بلکہ ہم اپنے آپ کو اپنی دنیا کا مرکز اور حاکم بناتے ہیں اور مخلوق کا ایسا کرنا گناہ کا جوہر اور اس کی جڑ ہے۔ زید خود غرض اور خود بین ہے پس بکر اوّل اس کی نقل کرتا ہے اور دوم اپنے بچاؤ کے لئے خود غرض بن جاتا ہے رشیر خوار، نوزاد بچہ شخص کہلانے کے قابل نہیں اور اسے اپنی شخصیت حاصل کرنا پڑتی ہے۔ گناہ بھری دنیا میں شخصیت حاصل کرتے کرتے وہ خود غرض اور خود بین بن جاتا ہے۔ اس خود غرضی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی اصلی بہتری پہچان نہیں سکتا۔ اور ایسی ایسی عادتوں میں پڑ جاتا ہے جن کے سبب سے

اس کی قوتِ ارادہ بگڑ کر کمزور ہو جاتا ہے " جو کوئی گناہ کرتا ہے گناہ کا غلام ہے "۔
(یوحنا ۸ : ۳۴ ، رومیوں ۶ : ۱۶-۲۰) طِطس کے تیسرے باب کی تیسری آیت میں
مرقوم ہے " ہم بھی پہلے نادان .... اور رنگ برنگ کی خواہشوں اور عیش و
عشرت کے بندے تھے "۔

ہویل (Whale) صاحب فرماتے ہیں کہ انسان کے گناہ میں گرنے
کا بیان تواریخ کے شروع کے بارے میں باقاعدہ بیان نہیں۔ یہ مسئلہ عقل کے لئے ضروری
ہے پر متخیلہ اس کا تصور پیدا نہیں کر سکتا۔ عدن کا کسی نقشہ میں پتہ نہیں اور آدم
کا بگڑنا کسی تواریخی جنتری میں جگہ نہیں پاتا۔ انسان کا گرنا ..... انسانی تجربہ کا ایسا
حصہ ہے جو ہمیشہ موجود ہے یعنی ہم جو خدا کی رفاقت کے لئے پیدا ہوئے برابر اُس
رفاقت سے انکار کرتے رہتے ہیں۔

بے شک جب انسان پیدا ہوا (چاہے خدا نے کسی موجودہ حیوان میں
انسانیت پیدا کی چاہے انسان کو از سرِ نو نئے طور پر پیدا کیا) ممکن تھا کہ وہ نیکی پسند
کرتا ، اور اس نے بدی پسند کی۔ فرماں برداری چن سکتا تھا اور نافرمانی چنی خدا کی
رفاقت قبول کر سکتا تھا ، اور اس نے رفاقت کو قبول کرنے سے انکار کیا۔

فصلِ چہارم
گناہ

۱۔ گناہ کیا ہے ؟ یوحنا کے پہلے خط عام میں لکھا ہے کہ " جو کوئی گناہ

کرتا ہے وہ شرع کی مخالفت کرتا ہے ۔ اور گناہ شرع کی مخالفت ہے " (۱یوحنا ۴:۳) یہ ہر طرح کی ناراستی گناہ ہے (۱یوحنا ۱۷:۵) یاد رہے کہ ان الفاظ کے لکھتے وقت مقدس یوحنا روحانی نصیحت کا خط لکھتا تھا نہ کہ علم الٰہی کا رسالہ ۔ اقتباسات میں پہلے شرع کا ذکر آیا ہے یعنی خدا کی ظاہر کی ہوئی مرضی دوسرے میں راستی کا ذکر آیا ہے یعنی اس چال چلن کا جو انسان کی حقیقت اور ضروریات کے موافق ہے ۔ یہ دو الگ الگ باتیں ہیں ایک خدا کے لحاظ سے اور دوسری خدا کے لحاظ سے لکھی گئی ۔ چونکہ خدا ہر طرح سے نیک اور راست ہے اس لئے اس کی مرضی میں اور راستی میں فرق نہیں ۔ جو لوگ کسی بڑے معبود کو مانتے ہیں مثلاً شِوَگ جو بھوانی کو مانتے ہیں ان کے خیال میں معبود کی مرضی اور راستی میں فرق ہو سکتا ہے مگر جو لوگ خدا کو مانتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ خدا کی مرضی اور راستی میں فرق نہیں ۔

پس گناہ یہ ہے کہ آدمی خدا کی مرضی پوری کرنے کے بجائے اور کچھ کرتا ہے اور اپنی مرضی اپنی خوشی، اپنے شخصی خیالات اپنی جسمانی خواہشوں کو خدا کی مرضی پر ترجیح دیتا ہے ۔ اور نیز دیگر انسان کی ضرورتوں کو بلکہ خود اپنے اصلی فائدہ کو بالائے طاق رکھ کر وہ کام کرتا ہے جس سے انسان کا نقصان ہوتا ہے ۔

پر گناہ نہ صرف اس وقت ہوتا ہے جب آدمی بُرے کام کرتے ہیں ۔ بلکہ اس وقت جب وہ اچھے کام کرنے سے غفلت یا انکار کرتا ہے " راستی کی راہ کا نہ جاننا اس سے بہتر ہوتا کہ اسے جان کر اس پاک حکم سے پھر جاتے جو اسے سونپا گیا تھا " (۲پطرس ۲۱:۲) " جو کوئی بھلائی کرنا جانتا ہے اور نہیں کرتا اس کے لئے یہ گناہ ہے " (یعقوب ۱۷:۴) پھر بار بار ان لوگوں پر برکت کا اعلان کیا جاتا

ہے جو خدا کی مرضی پوری کرتے یعنی نیکی کرتے ہیں۔ توڑوں کی تمثیل اور اشرفیوں کی تمثیل یہ سکھاتی ہیں (متی ۳۰-۱۴ : ۲۵ ، لوقا ۲۷-۱۱ : ۱۹) بلکہ چند اور تمثیلوں میں یہی تعلیم ہے۔ مثلاً دس کنواریوں کی، آخری عدالت کی، دولت مند اور لعزر کی تمثیلیں۔

نیز گناہ میں وہ بری مرضی شامل ہے جس کے سبب سے وہ کام کیا جاتا ہے جسے گناہ کہہ سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ آدمی بے علمی کے سبب سے کوئی ایسا کام کرے جس کا نتیجہ بُرا ہو پر چونکہ اس کی مرضی بُری نہیں ہم اس کو نادان یا بے وقوف کہیں گے نہ کہ گنہگار۔ پولُس نے سکھایا ہے کہ "بُری مرضی بُرے فعل سے بھی بدتر ہے"۔ حالانکہ وہ خدا کا یہ حکم جانتے ہیں کہ ایسا کام کرنے والے موت کی سزا کے لائق ہیں پھر بھی نہ فقط آپ ہی ایسے کام کرتے ہیں بلکہ اور کرنے والوں سے بھی خوش ہوتے ہیں۔" (رومیوں ۳۲ : ۱) ہمارے خداوند نے خود فرمایا "جس کسی نے بُری خواہش سے کسی عورت پر نگاہ کی وہ اپنے دل میں اس کے ساتھ زنا کر چکا۔" (متی ۲۸ : ۵)

۲۔ گناہ کی جڑ کیا ہے؟ بعض دین سکھاتے ہیں کہ گناہ کی جڑ مادہ ہے کیونکہ وہ مادہ کو ناپاک قرار دیتے ہیں۔ اور الٰہی صفات کے خلاف لیکن مسیحی دین کی تعلیم یہ ہے کہ مادہ اچھا ہے۔ پیدائش میں بتایا گیا ہے کہ خدا نے خلقت کو دیکھ کر اچھا قرار دیا بلکہ بہت اچھا (پیدائش ۱۳-۱۲ : ۱) اور یہ تمام بائیبل کی تعلیم ہے۔ یہ بتایا جاتا ہے کہ ہمارے جسم پاک بلکہ خدا کے لئے لائق قربانی ہو سکتے ہیں (رومیوں ۱ : ۱۲ ؛ اکرنتھیوں ۱۵ : ۶)

درحقیقت یہ تعلیم کہ مادہ برا ہے یا یہ کہ خدا نے دھوکہ دیا یہاں تک کہ دنیا و

دمافیہا محض دھوکا میں خدا کی توہین ہے۔ پس مادہ گناہ کی جڑ نہیں۔ بے شک بعض گناہ جسمانی ہیں پر جسم کی خواہش اصل میں بُری نہیں۔ برائی یہ ہے کہ ہم بے موقع خدا کے حکم کے خلاف یا زیادتی سے ان کو پورا کریں۔ یہ زیادتی بُری غرضی۔ یا خود غرضی یا جسم کو روح پر ترجیح دینے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کا مخرج انسان کی عقل ہے۔
(متی ۱۹: ۱۵)

بعض کہتے ہیں کہ گناہ کی جڑ لاعلمی اگیانتا ہے مگر حالانکہ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ لوگ بُرے کاموں کو نیک یا اچھے کاموں کو بُرا سمجھکر گناہ میں مبتلا ہوتے ہیں۔ مثلاً تعلیم نسواں کو برا سمجھنا یا کثرت ازدواج کو اچھا سمجھنا وغیرہ اخلاقی بُرائی کا باعث ہوتا ہے۔ بہرکیف بہت سے لوگ جان بوجھ کر گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں درحقیقت اکثر گناہوں کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ ان کے کرنے والے جانتے ہیں کہ یہ نامناسب ہیں اگرچہ شاید ان گناہوں کی پوری بُرائی پہچانتے نہیں (گناہ کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ گنہگار گناہ کی حقیقت کو نہیں پہچانتا) اصل بات یہ ہے کہ اگرچہ نیکوکاری کے لئے علم درکار ہے تو بھی علم میں وہ زور نہیں جس سے آدمی نیکی میں حتی الامکان کوشش کرے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ بہت سے پڑھے لکھے آدمی بلکہ وہ بھی جو اخلاق کا علم رکھتے ہیں۔ بُرائی کرتے رہتے ہیں اور جن کاموں کو وہ خود بُرا جانتے ہیں یہ ان کے مرتکب ہوتے ہیں۔

پھر گناہ محض انسان کی محدود حالت کا نتیجہ نہیں ایسا خیال اس سبب سے غلط ہے کہ اس میں اختلاف پر زور نہیں دیا جاتا۔ طاقت رکھنا اور ہے اور نیک ارادہ کرنا اور۔ بے شک محدود ہستی بہت اچھا کام نہیں کرسکتی پر ممکن ہے کہ اس کی نیت

بالکل خالص ہو۔ اور وہ اپنی کمزوری پہچان کر خدا کی مرضی کو ہمیشہ پسند کرے۔
توڑوں کی تمثیل پر ایک مفسّر نے یہ لکھا ہے کہ انسان کی جانچ کے صحیح الفاظ یہ نہیں عقلمند اور کامیاب بلکہ "اچھا اور دیانت دار"۔ (متی ۲۱ : ۲۵)

۳۔موروثی گناہ :۔ یہ محاورہ وعلمائے عام کی کتاب میں استعمال ہوا ہے۔ یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ محاورہ کے دونوں الفاظ متضاد ہیں۔ کیونکہ جو موروثی ہے اس پر انسان کا اختیار نہیں۔ اور جس کام یا حالت پر آدمی کا اختیار نہیں۔ وہ آدمی اس کے سبب سے نہ تو نیک کہلا سکتا ہے نہ گنہگار کیونکہ نیک وہ ہے جو اپنی خوشی اور مرضی سے اچھے اچھے کام کرتا ہے۔ اور گنہگار وہ ہے جو اپنے ارادے سے برائی کرتا ہے۔ اس لئے شاید فطرتی یا ذاتی گناہ کہنا بہتر ہوگا۔ مگر موروثی گناہ مروّج محاورہ ہے۔

ہمارا تجربہ ہے کہ تمام بنی آدم کسی نہ کسی بدنما عادت مائل ہیں یعنی سب آدمی گناہ کرتے ہیں۔ تو بھی ان کو ان کا احساس نہیں ہوتا۔ اور آدمی گناہ کی اہمیت نہیں پہچانتے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ دنیا کا بگاڑ معمولی آدمیوں کے گناہ کا نتیجہ ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو ماننا پڑے گا۔ کہ کوئی خدا کو اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اپنی ساری عقل اور اپنے سارے زور سے پیار نہیں کرتا۔

ڈاکٹر ٹیننٹ صاحب (Tennant) کا قول ہے کہ اس معاملہ کو ارتقا کے لحاظ سے سمجھنا چاہیئے۔ یعنی انسان ارتقا کی اس منزل پر ابھی نہیں پہنچا کہ کہ اسے اپنی جبلتی تواریر پورا قابو حاصل ہو۔ گناہ اس کی اسی کمی کی وجہ سے واقع ہوتا ہے۔ اس مسئلہ میں کچھ سچائی ضرور ہے۔ لیکن اس میں ایک بڑا نقص ہے۔

اس سے معلوم نہیں ہوتا کہ انسان روحانی گناہ میں کیونکر مبتلا ہوتا ہے۔ حسد اور غرور سب سے بڑے گناہ ہیں۔ لیکن جسمانی گناہ نہیں بلکہ عقلی اور روحانی ہیں۔ حیوان مغرور نہیں ہوتے البتہ بعض پالتو جانوروں میں حسد نظر آتا ہے۔ لیکن اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ یاد رہے کہ پالتو جانور گنہگار انسان کی صحبت میں رہتے ہیں۔

انسان کو نیکی کرنے کا اختیار رہا تھا۔ لیکن اس نے بجائے نیکی کے بدی کو اختیار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا بگڑ گئی۔ اور انسان کی طبیعت بھی گناہ آلودہ ہو گئی۔ ہم کو بدیہی طور پر معلوم نہیں کہ یہ آلودگی ہمیں ورثہ میں ملتی ہے یا یہ محض ماحول کا اثر ہے۔ بہر حال یہ بگاڑ ایک حقیقت ہے جیسا کہ ہر انسان کے تجربے سے ثابت ہوتا ہے۔

انسان بجائے اس کے کہ خدا کو مانے خود خدا کی جگہ لے لیتا ہے۔ اور بھول جاتا ہے کہ وہ مخلوق ہے۔ ہم اپنے انتظامات خود کرتے ہیں۔ اور اپنی مرضی کے مطابق اپنے خاندان وغیرہ کی بہتری اور بہبودی کے جویاں ہوتے ہیں۔ انسان کا میلان گناہ کی طرف ایسا ہے کہ وہ اپنی گنہگاری محسوس نہیں کر سکتا بلکہ اپنے گناہوں کو درست اور معقول سمجھتا ہے۔

۴۔ گناہ کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان خدا سے جدا ہوتا ہے۔ اس کی قوت ارادہ کمزور ہوتی جاتی ہے۔ ان کا تصور خراب ہوتا ہے۔ نیز گنہگار اور مجرم اور خدا کے غضب کا مستحق ہو جاتا ہے۔ خدا ہر قسم کی بدی سے ناخوش رہتا اور نفرت کرتا ہے خدا کا غضب یہ ہے۔

(۱) چونکہ گناہ نظام قدرت کے خلاف ہے لہذا دنیا میں طرح طرح کی

مصیبتیں. تکلیف - رنج - کال - بیماری وغیرہ پیدا ہوتی ہیں۔

(۲) گنہگار خدا کی رفاقت سے محروم ہو جاتا ہے۔ خدا کی..... رفاقت سے تمام فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ درحقیقت خدا سے الگ کوئی خوبی حاصل نہیں ہو سکتی اور گنہگاری کا نتیجہ یہ ہے کہ گنہگار رفتہ رفتہ تمام خوبیوں سے محروم ہو جاتا ہے۔

۵ - آدمی اکیلے نہیں رہتے بلکہ خاندانوں قوموں، شہروں میں لہذا گناہ کا اثر نہ صرف گنہگار پر پڑتا ہے۔ بلکہ اوروں پر بھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک شخص کے گناہ کے سبب سے دنیا میں بدی پھیل جاتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ دنیا میں گناہ اس قدر پھیل جاتا ہے کہ تمام بنی آدم اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ دنیا کی بدی سے کوئی فرد بشر الگ نہیں ہو سکتا۔ گناہ اور انسان کی خود غرضی کے سبب سے دنیا میں بہت سی برائیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ جن سے ہم میں سے کوئی بری نہیں ہو سکتا۔ مثلاً بعض مالک اپنے مزدوروں کو دباتے اور ان کو کم تنخواہ دیتے ہیں۔ جس کے سبب سے چیزیں سستی ہوتی ہیں۔ ممکن نہیں کہ سب سے اچھا شخص معقول قیمت معلوم کرکے ادا کر سکے۔ اس قسم کے بہت سے معاملے ہیں۔ ہر ملک کے انتظام میں ایسی ایسی باتیں ہیں۔ جو برائی اور ظلم پیدا کرتی ہیں۔ ان سے کوئی شخص الگ نہیں ہو سکتا۔ ہم سب کے سب دنیا کے گناہ میں مبتلا ہیں۔ اور جیسا نبی نے نہ صرف اپنے گناہوں کا اقرار کیا بلکہ اپنے ہم وطنوں کا ویسا ہی ہم کو بھی کرنا چاہیئے۔

گناہ کا یہ زور اور اس کی یہ عالمگیری ایسی باتیں ہیں جن سے گناہ کی برائی ظاہر ہوتی ہے۔ اگر ہم اس اعتبار سے خداوند یسوع مسیح کی مصیبت اور موت کو سوچیں، تو ظاہر ہوگا کہ خداوند مسیح دنیا کی برائی کے جال میں پھنس کر انسانی

طور پر فوت ہوا۔

۶۔ لفظ آزمائش کے دو معنی ہوتے ہیں۔ (۱) امتحان (۲) گناہ کی رغبت۔

(۱) ممکن ہے کہ آدمی امتحان یعنی دنیا کی تکلیفوں میں پڑ کر گناہ کرے لیکن ایسی ایسی تکلیفیں انسان میں روحانی مضبوطی بھی پیدا کر سکتی ہیں چنانچہ مُقدس یعقوب فرماتا ہے "جب تم طرح طرح کی آزمائش میں پڑو تو اس کو یہ جان کر کمال خوشی کی بات سمجھنا چاہیئے کہ تمھارے ایمان کی آزمائش صبر پیدا کرتی ہے..... الخ (یعقوب ۳-۲-۱:۱) مگر مصیبت خوفناک ہوتی ہے۔ اور اسی لئے مسیح نے حکم دیا ہے کہ ہم اس میں نہ پڑنے کے لئے دعا کریں (۲) گناہ کی رغبت خدا کی طرف سے نہیں آتی۔ (یعقوب ۱۵-۱۳:۱) کیونکہ خدا برائی کی طرف کسی کو نہیں کھینچتا۔ بہر حال یہ پہچاننا چاہیئے کہ آزمائش (یعنی گناہ کی ترغیب) گناہ میں شامل نہیں۔ جب ہم آزمائش پر غالب آتے ہیں تو اس میں گناہ نہیں۔ بے شک ایسے ایسے خیالات اور خواہشیں دل میں پیدا ہو سکتی اور ہوتی بھی ہیں جو گناہ میں داخل ہیں حالانکہ ان پر عمل بھی نہ کیا جائے۔

مگر بُرے خیال دل میں آنے کا یہ لازمی نتیجہ نہیں کہ آدمی گناہ کرے۔ اگر آدمی ایسے خیالوں پر توجہ دے اور ان بُرے کاموں کی لذت پر غور کرے۔ تو غالباً عملی گناہ کر بیٹھے گا۔

(نوٹ:- پولس رسول نے کئی بار لفظ جسم کو بُرے معنی میں استعمال کیا۔ اس لفظ سے جو یونانی لفظ سارکس کا ترجمہ ہے ہمارا دری بدن ہی مراد نہیں بلکہ انسان کی گناہ آلودہ شخصیت...... یہ ظاہر ہے کہ پولس چند ایسے گناہوں

کو جسم کا کام کہتا ہے جو مادری جسم کے کام ہیں۔ مثلاً بت پرستی، عداوتیں جھگڑا تفرقہ۔ جدائیاں۔ بدعتیں بغض]

۷۔ بعض عالم گناہوں کے دو درجے بتاتے ہیں یعنی مہلک اور ہلکے۔ اگرچہ اس تقسیم سے صرف اتنا مراد ہے کہ بعض گناہ بہ نسبت اوروں کے زیادہ برا نتیجہ پیدا کرتے ہیں اور زیادہ شرارت ظاہر کرتے ہیں یہ صحیح ہے۔ پر اگر اس کا یہ مطلب ہے کہ کوئی بھی گناہ ایسا ہلکا ہے کہ اس کا لحاظ کرنا فضول ہے تو یہ خیال غلط ہوگا۔ ہم پہچان سکتے ہیں کہ یہ گمان کرنا کہ تمام گناہ برابر بڑے ہیں تجربہ کے خلاف ہے اور بعض گناہ دل اور نیت کی زیادہ خرابی کے آثار ہیں۔ بہر حال ایک گناہ یہاں تک اہم ہے کہ اوّل تو وہ خدا کی حکم عدولی ہے۔ اور شریعت کی مخالفت ہے "جس نے ساری شریعت پر عمل کیا۔ اور ایک ہی بات میں خطا کی وہ سب باتوں میں قصوروار ٹھہرا" یعنی شریعت کے رو سے وہ شخص گنہگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ دوم وہ گناہ جن کو ہم چھوٹا سمجھتے ہیں بڑھتے بڑھتے ساری طبیعت و خصلت کو بگاڑ دیتے ہیں۔ سوم ہمارا سارا وقت اور سب مال و منال اور ہماری تمام لیاقتیں خدا کی طرف سے امانت ہیں۔ (دیکھو متی ۲۵: ۱۴-۳۰) اور ہم پر فرض ہے کہ عمر بھر کبھی نیکی کرنے میں نہ چوکیں ورنہ گناہ کر بیٹھیں گے۔ ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ انسان کو نیکی کرنا چاہیئے۔ یہاں تک کہ دین عیسوی کے لحاظ سے کوئی کام مستحب نہیں جس کے کرنے کے لئے ثواب ہے پر اس کا نہ کرنا گناہ نہیں۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خدا ہر قسم کے گناہ سے متنفر ہے اور اس کی قدسیت کا یہ مطلب ہے کہ وہ ہر طرح کی برائی سے بری ہے۔ ہر قسم کی

معصیت چاہے قصور ہو (یعنی کمی کوتاہی) چاہے خطا (غلطی) چاہے گناہ (بُرائی - بدی) خدا کی شان کے خلاف ہے۔ دعائے عام کی کتاب کے اقرار عام میں گناہ کی تقسیم اشارۃً کیا خوب کی گئی ہے۔ "ہم نے خطا کی ہے (غلطی) اور کھوئی ہوئی بھیڑوں کی مانند (ایک دوسرے کے کاموں کی نقل کرتے کرتے) تیری راہوں سے بھٹک گئے ہیں (راستی سے جدا ہونا) ہم نے اپنے اپنے دل کے منصوبوں اور خواہشوں کی زیادہ پیروی کی ہے۔ (اپنی مرضی کو خدا کی مرضی پر ترجیح دینا) ہم تیرے پاک حکموں کے خلاف چلے ہیں۔ (حکم عدولی) جو ہم کو کرنا لازم تھا وہ ہم نے نہیں کیا (نیکی کرنے میں کوتاہی) اور جو ہم کو کرنا روا نہ تھا وہ ہم نے کیا ہے۔ (شریعت کی مخالفت، خاص بُرائی کرنا) اور ہم میں کچھ صحت نہیں (ہمارے سب کام گناہ آلودہ ہیں۔ اور ہم اپنے آپ کو بچا نہیں سکتے)

باب سوم

خُداکی بادشاہی

اس باب میں ہم پہلے اس مضمون پر غور کریں گے کہ مسیحی دین تواریخ اور واقعات کے بارے میں کیا سکھاتا ہے۔ پھر اس پر کہ مسیحی دین کیوں تواریخی دین کہلاتا ہے۔ اور اس کے بعد خدا کی بادشاہی کو مدنظر رکھنے کے لئے تیار رہوں گے۔

فصل اوّل

تواریخ

۱۔ تواریخ کے بارے میں ہندو اور مسیحی تصورات مختلف ہیں۔ ہندوؤں کے نزدیک واقعات کا سلسلہ پہیے کی مانند ہے جو کچھ ہوتا ہے وہ ہو چکا ہے اور پھر ہوگا۔ لاکھوں یا کروڑوں برس کے بعد موجودہ حالت پھر وقوع میں آئے گی۔ ست یُگ، ترتیا یُگ، دواپر یگ اور کلیگ برابر آتے چلے جاتے ہیں۔ کلیگ کے بعد پھر ست یگ شروع ہوگا۔ اور اس انتظام کا خاتمہ نہ ہوگا۔ یا کم از کم اس کا ختم ہونا ضروری نہیں۔ پُرانے زمانے میں یونانیوں کا بھی یہ ہی خیال تھا۔ پھر مسیحی تعلیم کی رو سے واقعات

لا سلسلہ دائرے کی مانند نہیں بلکہ خط کی مانند جس کا شروع بھی ہوا اور خاتمہ بھی ہوگا۔ ہندو خیال کی روسے درحقیقت دنیا کے واقعات بے مطلب ہیں۔ کیونکہ ان کا کوئی دائمی نتیجہ نہیں۔ نہ تو وہ کوئی مقصد وقوع میں لاتے ہیں اور نہ ان سے کوئی مقصد ظاہر ہوسکتا ہے۔

۲۔ تواریخ یعنی واقعات کا بیان یہ نہیں کہ ہر ایک واقعہ لکھا جائے۔ اول تو یہ ممکن نہیں دوم ہر ایک واقعہ ایسا نہیں کہ ہم اس کو پر مطلب کہہ سکیں۔ حالانکہ ہر ایک واقعہ کوئی نہ کوئی مطلب رکھتا ہے۔ اور خدا کو ہر ایک کا مطلب اور نتیجہ معلوم ہے۔ پر انسان اسکو معلوم نہیں کرسکتا۔

تواریخ میں صرف اہم واقعات کا بیان شامل ہے۔ اہم یا پُر مطلب واقعہ کی پہچان یوں ہے۔

(۱) اس کے سبب سے تمام بعد کے واقعات تبدیل ہوتے ہیں۔ مثلاً یورپ میں اصلاح دین اور رومی حکومت کا برباد ہونا۔ ایشیا میں یسوع مسیح کی زندگی اور کام جن کے سبب سے تمام دنیا میں تبدیلیاں ہوئیں۔

(۲) وہ دوبارہ اسی صورت میں کبھی وقوع میں نہیں آسکتا۔ بہرحال مد اصل نہ صرف ان واقعات کا نتیجہ بڑا ہوتا ہے۔ بلکہ وہ اکثر عام لوگوں کے کاموں اور خیالوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مثلاً فی زمانہ چین میں عام لوگ چیانگ صاحب کی سرکار سے ایسے ناراض اور بیزار ہوئے کہ فوج بھی اس کے لئے لڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اور اکثر ہتھیار ڈال دیتی یا کمیونسٹوں کی طرف ہوجاتی تھی۔ ان میں کوئی بہت بڑا شخص نہ تھا پر عام لوگوں کے فیصلوں کے سبب سے ملک میں نہایت

بڑی تبدیلی ہوئی۔

نیز نہ صرف یہ سچ ہے کہ واقعہ کے حقیقی مطلب واقعات کے سلسلہ کو تبدیل کرتا ہے۔ مگر کسی واقعہ کا جو مطلب محض مانا جاتا ہے گویا خیالی ہے وہ بھی موثر ہوتا ہے۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک کی جنگ میں جرمنی کی فوج ہار گئی۔ لیکن رفتہ رفتہ جرمن لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ درحقیقت فوج نے شکست نہیں کھائی بلکہ ملک کی شکست کا سبب یہ تھا کہ عام لوگ ہمت ہار کر فوج کے پیچھے ملک کے اندر اپنی سرکار اور اپنے قیصر سے منحرف ہو گئے۔ جنگ میں کامیابی سے ہاتھ دھو بیٹھے اور بغاوت کرنے لگے۔ اس غلط فہمی نے ہٹلر کو دوبارہ جنگ کرنے کا حوصلہ دیا۔ لہذا دوسری عالمگیر جنگ چھڑ گئی جس کے نتیجوں سے تمام دنیا اب تک تکلیف اٹھاتی ہے۔

۳۔ بائبل میں تواریخ کس نقطۂ نگاہ سے دیکھی جاتی ہے؟ پرانے اور نئے عہد نامہ میں یہ تعلیم ملتی ہے یا یوں کہیں کہ یہ بات مسلّم ہے کہ زمانے کے واقعات خدا کے نزدیک پُر مطلب ہیں۔ اور وہ ان کے اندر کام کرتا ہے۔ اور اپنے مقاصد پورے کرتا ہے۔ گویا دنیا کے واقعات خدا کا کارخانہ ہیں۔

یہ مطلب نہیں کہ لاتبدیل خدا میں تغیر ہوتا ہے۔ خدا تو لا ابتدا و لا آخر ہے۔ وہ زمانے کا خالق اور اس کی حدود سے محدود نہیں۔ اس کے نزدیک زمانہ گذشتہ، زمانہ حال و زمانہ مستقبل سب یکساں حاضر ہیں۔ پر غیر تبدیل کے بدلنے والے کے ساتھ برتاؤ بدلتا ہے۔ ورنہ لاتبدیل نہ ہوتا۔ اگر خدا زمانہ کے واقعات سے لاپرواہ ہوتا ان میں دخل نہ دیتا اور ان کے دائرے کے اندر کام نہ کرتا تو پاک کلام میں اس کی جو

ذات وصفات ظاہر ہوتی ہیں وہ اور ہی کچھ ہوتیں۔ دنیا کا انحصار خدا پر ہے۔ نہ کہ دنیا پر خدا کا۔

دانی ایل کی کتاب کے اکثر ابواب میں اور تمام انبیا کے صحیفوں میں بلکہ تمام بائبل میں یہ بات تسلیم کی جاتی ہے۔ کہ دنیا کے واقعات سے خدا کو سروکار رہے اور وہ ان میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً خورس فوجی سردار اور فاتح بادشاہ تھا۔ اور ممکن ہے نہایت سخت گیر شخص تھا۔ پر یسعیاہ اسے خدا کا ممسوح کہتا ہے۔ اگر خورس کو یہ بتایا جاتا کہ مظلوم عبرانیوں کے ایک نبی نے آپ کو یہوواہ کا ممسوح کہا۔ تو غالباً ہنس پڑتا۔ پر نبی نے پہچانا تھا۔ کہ اگرچہ خورس اپنی فتحوں کو اپنے زور اپنی عقل اور اپنی بہادری سے منسوب کرتا ہے تو بھی درحقیقت وہ بادشاہ خدا کے مقصدوں کو پورا کرتا ہے۔ عاموس نے بہت صفائی سے دنیا کے واقعات سے خدا کا تعلق دکھایا۔ مگر سچ پوچھئے تو بائبل کی کوئی کتاب اس تعلیم سے خالی نہیں ہے

۴۔ عہد نامہ عتیق و عہد نامہ جدید دونوں میں تواریخ از روئے دین لکھی گئی ہے یعنی ان واقعات پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اور ان کا زیادہ مفصل بیان مرقوم ہوتا ہے جن سے مذہبی باتیں صریح طور پر نظر آتی ہیں۔ مثلاً بنی آدم اور خصوصاً عبرانیوں سے جو خدا کی برگزیدہ قوم مانے جاتے ہیں۔ خدا کا برتاؤ۔ خدا کی مرضی کا اظہار انسان کی زندگی پر خاص کر قوموں کی زندگی پر آدمیوں کی نیکی یا بدی کا اثر۔

اسرائیلی بادشاہوں میں ایک بہت کامیاب بادشاہ یربعام ثانی گذرا ہے۔ پر سلاطین کی دوسری کتاب میں اس کی سلطنت کے بیان میں صرف چھ آیتیں لکھی گئی ہیں

اخی اب ایسا کامیاب نہ تھا اور نہ ایسا عقلمند پر اس کی سلطنت کے بارے میں
ایک سو اٹھاسی[۱۸۸] آیتیں لکھی گئیں کیونکہ اس کے عہد میں بڑے بڑے دینی واقعات
ہوئے۔ غیر مسیحی مورخوں نے خداوند یسوع مسیح کا ذکر کم کیا اور پولُس رسول کا بالکل
ذکر نہ کیا مگر بائیبل میں ان کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا بلکہ ساری بائیبل مسیح
سے تعلق رکھتی ہے۔ آج کل تقریباً تمام دنیا خداوند یسوع کے نام سے واقف ہے۔
پر خداوند کے زمانہ کے اکثر بڑے بڑے لوگ بالکل فراموش یا صرف تھوڑے ہی لوگ
ان سے واقف ہیں۔

تواریخ کو دینی نقطہ نگاہ سے لکھنا خطرہ بالکل نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ سلسلۂ
واقعات میں قصداً یا سہواً جھوٹ ملا دیا جائے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ تاریخ نویس
کو اس نقص سے پاک رکھنے کے لئے خدا کے فضل بلکہ الہام کی ضرورت ہے۔
مورخ اپنی طبیعت سے الگ ہو کر کچھ نہیں لکھ سکتا۔ چنانچہ ممکن ہے کہ وہ
حقیقت کو مروڑ کر لکھے۔ اور ضرور ہے کہ واقعات کی اہمیت کے بارے میں فیصلہ
کرتے وقت اس کا فیصلہ اس کی تربیت وغیرہ کے موافق ہو۔

۵۔ دنیا میں دو قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ اول وہ جو اس دنیا اور دیکھی ہوئی
چیزوں کا لحاظ کرتے ہیں۔ دوم وہ جن کا رجحان دوسرے جہان اور ان دیکھی چیزوں کی
طرف ہوتا ہے لیکن درحقیقت دونوں باتیں ہونی چاہئیں۔ جب ہم صرف ان دیکھی
دنیا اور ابدیت پر غور کرتے ہیں تو اس دنیا کے واقعات اور ان کی تاریخی اہمیت گھٹتی
ہے۔ یہاں تک کہ وہ ہماری سمجھ میں بے مطلب ہو جاتی ہیں۔ برعکس اس کے اگر
ہم محض دیکھی چیزوں اور ظاہری واقعات کو مدِ نظر رکھتے ہیں تو ان کا اندرونی کوئی

مطلب ظاہر نہیں ہوتا۔ اور تواریخ کی بابت ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ تھا اور یہ ہے اور بس۔ کہتے ہیں کہ ایک بادشاہ نے تین عالموں کو بھیجا کہ انسان کی زندگی کا حال دریافت کرکے اسے خبر دیں۔ بہت عرصے کے بعد ان میں سے ایک عمر رسیدہ ہو کر واپس آیا جب وہ بادشاہ کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہ قریب المرگ ہے۔ بادشاہ نے تاخیر کی وجہ اور تفتیش کا نتیجہ دریافت کیا۔ عالم نے بیان کیا کہ ہم نے بہت سے ملکوں کی سیر کی اور بہت سے عالموں سے ملکوں کی حالت دریافت کی۔ میرے دونوں ساتھی مر بھی گئے۔ ہماری تفتیش کا نتیجہ یہ ہے کہ آدمی پیدا ہوتے۔ دکھ اٹھاتے اور مر جاتے ہیں۔

اگر ہم چاہیں کہ تواریخ کو سمجھیں اور اس میں خدا کو پہچانیں تو دونوں جہان کو مدنظر رکھنا چاہیئے۔ زمانہ کو یاد رکھیں اور ابدیت کو فراموش بھی نہ کریں۔

۲۔ بہت دفعہ ہم سلسلۂ واقعات کا مطلب صرف اس وقت سمجھتے ہیں جب سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ اگر ہم کسی کاریگر کو کوئی ایسی چیز بناتے دیکھیں جس سے ہم واقف نہیں تو جب تک وہ چیز بن کر نظر یا تیار نہ ہو جائے ہماری سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اسی طرح چونکہ ہم سلسلۂ تواریخ کے انجام کو نہیں جانتے لہذا وہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔

تمام تواریخ کا مطلب صرف اس وقت ظاہر ہوگا جب تواریخ انجام کو پہنچے گی۔ یہی حالت کسی نظم، ڈراما یا راگ کی ہوتی ہے۔ جب ہم کوئی افسانہ پڑھتے ہیں تو ابتدائی ابواب کا مطلب فسانہ کے ختم ہونے پر معلوم ہوتا ہے۔ فسانہ نویس شروع ہی سے ان کا مطلب جانتا ہے۔ پڑھنے والا نہیں جانتا۔ خدا کو تاریخ کا پورا علم ہے۔ ہم

انسان اُسے نہیں جانتے۔

۷۔ یہ خیال کہ خدا نے انسان کو اکیلا چھوڑ اکہ جو چاہے سو کرے غلط ہے اور یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ خدا نے ہر واقعہ مقدّر کیا ہے۔ بائبل سکھاتی ہے کہ خدا کی مرضی آخر کار پوری ہوگی۔ ممکن تھا کہ ہم اس سے یہ نتیجہ نکالتے (جیسے بعض مسیحیوں نے نکالا) کہ خدا نے ہمارے تمام افعال کو مقدّر کیا ہے اور ہم قسمت سے ایسے بندھے ہوئے ہیں کہ ذرا بھی آزادی نہیں مگر پاک کلام صاف سکھاتا ہے کہ خدا نے انسان کو نہ صرف فعل مختار بنایا بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ انسان آزادی حاصل کرے "سچائی تم کو آزاد کرے گی۔۔۔۔۔۔ اگر بیٹا تم کو آزاد کرے تو تم واقعی آزاد ہوگے" (یوحنا ۸: ۳۲، ۳۶) "زندگی کے روح کی شریعت نے مسیح یسوع میں مجھے گناہ اور موت سے آزاد کر دیا" (رومیوں ۸: ۲) "جہاں خداوند کا روح ہے وہاں آزادی ہے (۲ کرنتھیوں ۳: ۱۷) "تم آزادی کے لئے بلائے گئے ہو" (گلتیوں ۵: ۱۳) "اپنے آپ کو آزاد جانو" (۱ پطرس ۲: ۱۶) [دیکھو ۱ کرنتھیوں ۷: ۲۲، گلتیوں ۵: ۱، یعقوب ۱: ۲۵ اور ۲: ۱۲]

ایسا انتظام کرنے سے خدا نے آزاد ارادے کے مطابق اور اپنی خاص مہربانی سے اپنی قدرت اور اپنی مرضی کو کسی قدر محدود کیا تاکہ انسان واقعی انسان ہو اور اپنی خوشی سے خدا کی عبادت و خدمت کرے اور اس سے محبّت رکھے۔

۸۔ بائبل کی یہ تعلیم ہے کہ "صداقت قوم کو سرفرازی بخشتی ہے" (امثال ۱۴: ۳۴) اور قومی گناہ کے نتیجے نہایت خوفناک ہیں "گناہ سے اُمتوں کی رسوائی ہوتی ہے" (ایضاً) جو کتابیں بائبل کے اندر تواریخی کتابیں کہلاتی ہیں یعنی یشوع

سموئیل، قضاۃ، سلاطین اور تواریخ ان کتابوں میں اس تعلیم کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ نیز توریت کی کتابیں خاص کر پیدائش اور انبیا کے صحیفوں میں شامل کرتے ہیں۔ اور یہ درست ہے کیونکہ اگرچہ لکھنے والوں مرتبوں کے نام معلوم نہیں تو بھی وہ محض مورخ نہ تھے۔ کیونکہ ان کتابوں کے ذریعہ سے وہ خدا کی مرضی اور اپنی قوم کے متعلق اس کے بڑے بڑے کاموں کو بیان کرتے ہیں۔ مثلاً وہ داؤد کی سوانح عمری سے ظاہر کرتے ہیں کہ انسان اچھے اور برے کاموں کا اس کی زندگی اور اس کے خاندان پر کیا اثر پڑتا ہے اور ان کتابوں کے لکھے جانے کا ایک خاص مقصد یہ دکھانا ہے کہ بنی اسرائیل کے اچھے اور برے چال چلن کا قوم پر کیا اثر ہوا۔ ان کتابوں کے ذریعہ یہ بتایا گیا ہے کہ قوم کی بربادی کا سبب ان کا راہ راست اور سچے ایمان سے بار بار گمراہ ہونا ہے۔ بے شک بعض برے افعال کا نتیجہ فوراً ہی ظاہر نہ ہوا لیکن یہ ثابت ہوتا ہے کہ آخر کار بدی کا نتیجہ ہلاکت ہی ہوتا ہے۔ مخادم کی نوجوانی کے ایام تک معلوم ہوتا تھا کہ جرمنی کے ظلم اور بغیر کافی سبب کے نزدیک کی قوموں کو جنگ میں پھنسانے کا نتیجہ اس قوم کی بہبودی کا باعث ٹھہرا اور خود جرمن لوگوں کا یہ گمان تھا۔ پر آخر کار جب پھر سنہ ۱۹۱۴ء میں وہ فرانس پر حملہ آور ہوئے تو بہت نقصان اٹھایا۔ اور جب سنہ ۱۹۳۹ء میں انھوں نے سہ بارہ حملہ کیا تو بڑی رسوائی اور بربادی کا تجربہ کرنا پڑا۔

۹۔ یہ خیال کرنا غلط ہے کہ دنیا کی تواریخ میں بعض زمانے کچھ قدر و قیمت نہیں رکھتے۔ خدا تمام بنی آدم سے محبت رکھتا ہے۔ اور ہر شخص چاہے دنیا کی

نظر میں کتنا ہی ذلیل کیوں نہ سمجھا جائے خدا کے نزدیک گراں قدر ہے۔ اسی طرح سے وحشی اقوام خدا کو پیاری ہے۔ اور وہ ان کی بہتری چاہتا ہے۔ اسی طرح ہر زمانہ بذاتہٖ قدر رکھتا ہے۔ حالانکہ بعض زمانوں میں زیادہ بڑے اور مفید واقعات وقوع میں آئے ہیں۔ یہ خیال کرنا غلط ہے کہ بعض زمانے واقعات کے سلسلے میں بے قدر کڑیاں ہیں۔ جو محض پہلے زمانوں کے نتیجے اور آنے والے زمانوں کے پیدا کرنے والی ہیں۔

انیسویں اور بیسویں صدی کی ابتدا میں اکثر لوگوں کا یہ خیال تھا۔ کہ انسان ترقی پذیر ہے۔ اور یہ ترقی بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہے گی۔ انیسویں صدی کے بیچ میں یا دوران میں والس (Wallace) نے مسئلۂ ارتقا کی دلائل پیش کیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر پڑھے لکھے لوگ یہ سمجھنے لگے کہ ترقی لابدی اور عالمگیر ہے۔ حالانکہ ارتقا یہ نہیں بتاتا کہ ترقی لازماً اچھی ترقی ہوگی۔ وہ تو صرف یہ سکھاتا ہے کہ حیوانات نباتات اپنے ماحول کے ساتھ تبدیل ہوتے رہیں گے۔ دورِ حاضرہ کے خوفناک واقعات سے ثابت ہے کہ باوجودیکہ انسان کائنات کی قوتوں پر قابض ہوتا جاتا ہے تو بھی اس کی گناہ آلودہ فطرت کے سبب سے یہ حکومت دنیا کی بہتری نہیں بلکہ بربادی کا باعث ہوتی ہے۔ ایک خیال اور ہے بالفرض ترقی لابدی ہے تو انسان کو دنیا کو بہتر بنانے کی کوئی ضرورت نہیں وہ تو خود بخود بہترین بن جائے گی۔

پر یاد رہے کہ یہ امید خدا کی پروردگاری پر مبنی ہے یہ نہیں کہ انسان اچھی کوشش سے ترقی پذیر ہوگا۔ حالانکہ بہت سے لوگ فی زمانہ یہ ماننا چاہتے ہیں

آدمیوں نے گذشتہ چوتھائی صدی میں دکھایا ہے کہ ان کی کوششوں کا نتیجہ بربادی اور تنزلی ہو سکتا ہے۔ اور بہت جگہوں میں ایسا ہوا بھی ہے۔ پھر ترقی یا تو اتفاق پر منحصر ہے یا جبر (قسمت) پر۔ اگر اتفاق پر تو اس کے پیدا ہونے اور قائم رہنے پر کوئی بھروسہ نہیں ہو سکتا۔ اگر جبر پر تو ترقی بے معنی ہے۔ انسان ترقی کرنے پر مجبور ہے اور انسان کہلانے کے لائق نہیں۔ جو تبدیلیاں مختلف مجبور ہستیوں میں نظر آئیں وہ دراصل ترقی نہ تھیں۔ کتابِ مقدس میں بار بار خداوند کے دن کا ذکر آتا ہے۔ مثلاً "رب الافواج کا دن تمام مغروروں اور متکبروں پر آئے گا۔ اور وہ پست کئے جائیں گے۔" (یسعیاہ ۲ : ۱۲) گروہ پر گروہ انفصال کی وادی میں ہے کیونکہ خداوند کا دن انفصال کی وادی میں پہنچا (یوایل ۴ : ۱۴) عہد نامہ عتیق میں اس محاورے سے عموماً خدا کی عدالت یا انتقام کا دن مراد ہے۔ پھر عہد نامہ جدید میں اس سے آخری دن مراد ہے۔ "ہمارے خداوند یسوع کے دن تم پر ہمارا فخر ہو گا" (۲ کرنتھیوں ۱ : ۱۴) خداوند کا دن اس طرح آنے والا ہے جس طرح رات کو چور آتا ہے۔ (۱ تھسلنیکیوں ۵ : ۲) خداوند یسوع مسیح نے کئی بار آخری دن کا ذکر کیا۔ میرے باپ کی مرضی یہ ہے کہ جو کوئی بیٹے کو دیکھے اور اس پر ایمان لائے ہمیشہ کی زندگی پائے۔ اور میں اسے آخری دن پھر زندہ کروں گا۔ (یوحنا ۶ : ۴۰) بعض اوقات آخری دن کو محض وہ دن کہا گیا ہے۔ مثلاً "اس دن یا اس گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا۔ (مرقس ۱۳ : ۳۲) پس ظاہر ہے کہ دین یہودی اور دین عیسوی کی تعلیم یہ ہے کہ تاریخ میں منزلیں ہیں اور ایک ایک آخری منزل جب دنیا یا موجودہ قرن (دور) ختم ہو گا۔ اس عظیم دن کے بارے میں بہت نہیں لکھا گیا۔ جس سے اس

کا مفصل حال ظاہر ہو۔ اس کا مفصل بیان کرنا ممکن نہیں۔ وہ دن زمانہ کا خاتمہ
ہے۔ اور اس کے بعد ابدیت ہوگی۔ پر ہم انسان زمانے کے کیڑے ہیں۔ اور ہماری
لغت میں اس کے بیان کے لئے الفاظ اور محاورات نہیں اور نہ یہ ہماری سمجھ میں
آسکتا ہے۔ پر ہم دیکھ سکتے ہیں کہ واقعات کے سلسلہ میں خاص اوقات گویا خاص
منازل ہیں ان کے بارے میں لکھا ہے۔ خداوند کے نزدیک ایک دن ہزار برس
کے برابر ہے۔ (۲ پطرس ۸:۳) اور ایک منزل مقصود ہے جبکہ خدا کے مقاصد
پورے ہوں گے اور "آخرت ہوگی" اس وقت وہ (مسیح) ساری حکومت اور سارا
اختیار اور قدرت نیست کر کے بادشاہی کو خدا یعنی باپ کے حوالے کرے گا۔
تاکہ سب میں خدا ہی سب کچھ ہو۔ (۱ کرنتھیوں ۲۴:۱۵ اور ۲۸ آیت)

فصل دوم

مسیحی دین تواریخی ہے

ا۔ جب غیر مسیحی خصوصاً ہندو اصحاب مسیحی عقیدوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو
انھیں اس بات سے تعجب ہوتا ہے کہ ان میں اس قدر تاریخی واقعات کا ذکر
ہے۔ ان کو تو عقیدوں میں خدا کی صفات اور راہ نجات کے ذکر کی توقع ہوتی ہے
بجائے اس کے انھیں یہ بیان ملتا ہے "یسوع مسیح .... روح القدس کی
قدرت سے کنواری مریم سے مجسّم ہوا اور انسان بنا۔ اور پنطیس پلاطس کے عہد
میں ہمارے لئے مصلوب ہوا۔ اس نے دکھ اٹھایا اور دفن ہوا۔ اور تیسرے

دن ...... جی اٹھا اور آسمان پر چڑھ گیا۔" وہ پوچھتے ہیں کہ دین کے عقائد نامہ میں اس شخص پنطس پیلاطس کا کیا کام ہے۔؟ اگر وہ مقدس اتھنیس کا عقیدہ بھی دیکھتے ہیں جس میں خدا کی ذات اور پاک تثلوث کا زیادہ تر ذکر ہے وہاں بھی یہ ملتا ہے کہ اس نے ہماری نجات کے واسطے دکھ اٹھایا۔ عالم ارواح میں اُتر گیا۔ تیسرے دن مُردوں میں سے جی اٹھا۔ آسمان پر چڑھ گیا"

ہندو خیال میں اس قسم کی تاریخی باتیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ مگر مسیحی دین میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ کیونکہ مسیحی دین تاریخی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوقا کی انجیل کے پہلے تین بابوں میں مسیح کے پیدا ہونے اور کام شروع کرنے کے متعلق یہ بتایا جاتا ہے کہ اس وقت کون کون سے حاکم حکومت کرتے تھے۔

(لوقا ۱:۵ ، ۲:۲ ، ۳:۱-۲)

جیسے بعض مذہب دُنیا کو دھوکا بتاتے ہیں اور بعض اس کو حقیقی مانتے ہیں، ویسا ہی تواریخی مذہب ہیں اور دیگر مذاہب تواریخ کی پرواہ نہیں کرتے تواریخی مذاہب انبیائی ہیں۔ (یہودیت۔ مسیحیت۔ اسلام) اور غیر تواریخی مذہبوں میں انبیا نہیں مانے جاتے کیونکہ انبیا خاص زمانوں کے لوگوں کے لئے بھیجے گئے۔ مگر غیر تواریخی مذہبوں میں زمانہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ انبیائی دینوں میں خدا کی مرضی اور اس کے کاموں پر زور دیا جاتا ہے۔ غیر انبیائی دینوں میں خدا کی مرضی نہیں مانی جاتی اور نہ اس کے کام بتائے جاتے ہیں۔

۲۔ تمام مذاہب میں مسیحی دین سب سے زیادہ تواریخی ہے۔ بیشک یہودی موسیٰ کے کام اور الہام پر زور دیتے ہیں مگر دین یہودی تعلیم موسیٰ اور دیگر

انبیا کی شخصیت پر پورے طور پر موقوف نہیں۔ اسلام کے کلمہ کے دوسرے جملے میں محمدؐ صاحب کا ذکر ہے۔ (محمدؐ رسول اللہ) پر اگرچہ یہ مانا جاتا ہے۔ اور مسلمانوں کو یہ ماننا لازمی ہے تو بھی اسلام کی خاص تعلیم کو محمدؐ صاحب کی ذات یا شخصیت سے ایسا تعلق نہیں کہ اگر ان حضرت کی جگہ دوسرا نبی ہوتا، تو دین اسلام بالکل بدل جاتا۔ لیکن دین عیسوی کا انحصار خداوند یسوع مسیح کی زندگی، موت جی اُٹھنے، صعود فرماتے اور کفارہ کا کام کرنے پر ہے۔ اگر خداوند یسوع مسیح یہ کام نہ کرتا تو مسیحی دین اور ہی چیز ہوتا۔ بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ کبھی قائم نہ ہو سکتا۔ بودھ مذہب کا بانی گوتم بدھ ہوئے پر ممکن تھا کہ دوسرا شخص وہی تعلیم دیکر اس مذہب کو قائم کرتا یعنی مذہب تعلیم پر منحصر ہے نہ کہ ایک شخص کی زندگی اور کام پر

مسیحی عقیدہ کی رو سے ممکن نہیں کہ دوسرا شخص خداوند یسوع مسیح کا کام کرتا۔ ممکن تھا کہ اس کا وہ نام نہ ہوتا پر ضرور تھا کہ وہ خدا سے مجسّم ہوتا اور وہی کام کرتا۔ "اگر مسیح نہیں جی اُٹھا تو ہماری منادی بھی بے فائدہ ہے۔ اور تمہارا ایمان بھی بے فائدہ ہے...... اگر مسیح نہیں جی اُٹھا تو تمہارا ایمان بے فائدہ ہے۔ تم اب تک اپنے گناہوں میں گرفتار ہو" (۱ کرنتھیوں ۱۵: ۱۴، ۱۷) پولُس کا یہ فقرہ حقیقت بیان کرتا ہے۔ واقعی اگر وہ باتیں جن کا ذکر انجیلوں میں ملتا ہے وقوع میں نہ آتیں تو مسیحی دین کا وجود ناممکن تھا۔

مسیحی دین چند خاص واقعات پر اور ایک خاص شخص کی شخصیت اور کام پر مبنی ہے نہ کہ کسی تعلیم پر۔ اس میں کلام نہیں کہ خداوند یسوع مسیح نے نہایت عمدہ تعلیم دی جو تمام دیگر اخلاقی اور دینی تعلیم سے بڑھ کر ہے۔ لیکن اس کی تعلیم مسیحی

دین اور بنی آدم کی نجات کی بنیاد نہیں۔ مسیح کا خاص کام یہ تھا کہ خدا باپ کو ظاہر کرے یعنی نہ صرف تعلیم سے بلکہ اپنی شخصیت اور کاموں سے۔ خدا نادیدہ ہے "خدا کو کسی نے کبھی نہیں دیکھا۔ اکلوتا بیٹا جو باپ کی گود میں ہے اسی نے ظاہر کیا۔"

(یوحنا ۱: ۱۸) "تو پوشیدہ خدا ہے" (یسعیاہ ۴۵: ۱۵) خدا .... ہمارے دلوں میں چمکا تاکہ خدا کے جلال کی پہچان کا نور یسوع مسیح کے چہرہ سے جلوہ گر ہو" (۲ کرنتھیوں ۴: ۶) انسان خدا کے جلال کو نہیں دیکھ سکتا۔ "انسان مجھے دیکھ کر زندہ نہیں رہے گا" (خروج ۲۰: ۳۳) اور انسان جو دنیاوی اور خاکی اور زمانے کا کیڑا ہے۔ ابدی و ازلی قادر مطلق، حق تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتا انبیا خدا کی طرف سے کلام سناتے ہیں پر اس بات کی ضرورت تھی کہ الٰہی صفات خاص انسانی زندگی میں ظاہر کی جائیں۔ جب سورج گرہن ہوتا ہے تو لوگ سورج کو غور سے دیکھنے کی غرض سے یا تو اُسے گہرے نیلے رنگ کے شیشے میں سے دیکھتے یا پانی میں اس کا عکس دیکھتے ہیں۔ تقریباً اسی طور پر خدا نے اپنا جلال انسانی زندگی پر ظاہر فرمایا۔ ابدی خدا نے زمانے کے اندر اپنے آپ کو دکھایا اور یوں زمانے میں خود داخل ہوا

گناہ تو زمانہ کے اندر واقع ہوا۔ اور ہوتا ہے۔ اس لئے جو کچھ اس کے علاج کے لئے کیا گیا ضرور تھا کہ وہ زمانے کے اندر کیا جائے۔ گناہ اور اس کا علاج دونوں تواریخ کے اندر ہیں۔

۳۔ اہل یہود ہمیشہ دو باتوں پر زور دیتے ہیں۔ کہ خدا نے ان کے جد امجد ابراہام کو ملک مسوپتامیہ سے بلایا۔ تاکہ اس سے ایک بڑی قوم بنائے۔ اور پھر یہ کہ ان کے باپ دادا ملک مصر میں غلامی میں رہتے تھے۔ اور خدا نے ان کو

بڑھائے ہوئے ہاتھ اور قوی بازو سے موسیٰ کے وسیلے سے غلامی سے بچا کر ان کو آزاد کیا۔ اور چالیس برس کی بیابان گردی کے بعد کنعان میں لایا اور وہاں کے پہلے باشندوں پر فتح بخشی۔ بار بار یہ الفاظ پرانے عہد نامہ میں آتے ہیں۔ جو تم کو ملک مصر سے نکال کر لایا وہ میں ہی ہوں۔ خداوند تمھارا خدا (احبار ۱۹:۳۶ وغیرہ) پچاس مرتبہ سے زیادہ پاک کلام میں اس کا صاف ذکر ہے۔ اور بہت دفعہ اس کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ اسی طرح سے مسیحی دین کا شروع مسیح کی صلیبی موت ہے۔ تعجب کی بات ہے۔ کہ دو بڑی اُمتیں ایسی ایسی باتوں پر فخر کریں جو دنیا کی نظر میں ذلت سمجھی جاتی ہیں۔ اکثر قومیں اپنے باپ دادا کی عظمت پر فخر کرتی ہیں مثلاً انگریز کہتے ہیں۔ ہمارے باپ دادا نے انگلستان کو فتح کیا۔" حالانکہ ان میں سے بہتیروں کے باپ دادا اس زمانے میں فاتح نہیں بلکہ مفتوح ہوئے۔ ہندوستان میں بعض قوموں کے لوگ جواب ذلیل ہیں، دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا ملک میں راج کرتے تھے۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ ضرور بالضرور اس بات میں سچائی ہے کہ عبرانی ملک مصر میں غلام تھے۔ ورنہ وہ کبھی اس بات کو ایجاد نہ کرتے غالباً اگر ہمارے پاس اس زمانے کی مصری تواریخ ہوتی۔ تو آفتوں کا ذکر کرتے وقت مصری مؤرخ ان کو اسرائیلوں کے معبود کی قدرت سے منسوب نہ کرتے۔ بہر کیف یقیناً خدا نے بڑی کرامت دکھا کر عبرانیوں کو مصریوں کے پنجے سے چھڑا لیا۔ خداوند یسوع مسیح کی صلیبی موت اور قیامت کی گواہی اور قسم ہے۔ جیسا نیچے مرقوم ہے۔

۴۔ کسی فلسفی کا قول ہے "تواریخ کے واقعات ابدی حقیقتوں کا ثبوت

نہیں ہو سکتے" اور بے شک جو لوگ مایا اور ہمہ اوستی کے معتقد ہیں وہ متفق ہوں گے۔ پھر بھی لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ جب تک ابدی حقیقت کا ظہور زمانے کے اندر تواریخ میں نہ ہو اس وقت تک اس کو حقیقی ماننے کا کوئی کافی سبب اور ثبوت نہیں۔ "خدا محبت ہے" ایک ابدی حقیقت کا بیان ہے۔ پر اگر یہ بات تواریخ کے واقعات میں ظاہر نہیں کی گئی تو کیونکر مانی جا سکتی ہے۔؟ اگر مسیح خدا کے ساتھ ایک نہیں ہے۔ اور محض صلیبی موت پائی۔ لیکن پھر جی اٹھا نہیں تو کون مان سکتا ہے کہ خدا محبت ہے؟ اس ہی اظہار کے سبب سے عام لوگ نئے عہد نامے کو سچا مان کر مسیحی دین کو قبول کرتے ہیں۔ کیونکہ اس میں خدا کی محبت کا اظہار خداوند یسوع کی موت، قیامت اور صعود سے ہوتا ہے۔

۵ ۔ پھر یہ سوال لازم آتا ہے کہ خداوند یسوع مسیح کا مصلوب ہونا اور پھر جی اٹھنا تاریخی واقعات ہے یا نہیں عموماً اسکول یا کالج کے طلبا کو یہ علم نہیں کہ جو قدیم تاریخ وہ پڑھتے ہیں وہ کہاں تک مثبت سندوں پر مبنی ہے۔ مثلاً روم اور یونان کی تواریخ میں جو واقعات مرقوم ہیں ان میں سے اکثر کی صرف ایک یا دو شہادتیں ملتی ہیں۔ ایک بار پرانے زمانے کی تواریخ کے پروفیسر سے دریافت کیا گیا کہ "فلاں کتاب بہ لحاظ تاریخ کے معتبر ہے یا نہیں"؟ جواب ملا کہ "ہاں معتبر ہے پر بعض باتوں میں شک ہے۔ صرف دو گواہ ہیں جو ایک دوسرے کے مخالف اور منصف کو ان میں سے ایک کو معتبر ماننا پڑا۔ ورنہ کتاب معتبر ہے" اور پرانے زمانے کی تواریخ کا عموماً یہی حال ہے۔ مگر خداوند یسوع مسیح کی تصلیب اور قیامت کے پانچ گواہ موجود ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ پہلی تین انجیلوں کے بیانات میں

اس قدر یکسانی ہے کہ انھیں تین علیحدہ شہادتیں سمجھنا درست ہوگا۔ تمام انجیلی بیانات کا چشمہ ایک ہی تھا۔ مگر اس میں بھی ایک چیز مستثنیٰ ہے یعنی مسیح کی اذیت وغیرہ کا بیان۔

اگر ہم مسیح کی موت اور جی اٹھنے کے بیان پڑھیں تو صاف ظاہر ہوگا کہ اس میں وہ الگ الگ گواہ ہیں۔ پس یہ کہنا صحیح ہے کہ مسیح کی تصلیب اور قیامت کے پانچ گواہ موجود ہیں۔ یہ امر قابل غور ہے کہ پرانے وقت کی تاریخ میں کسی واقعہ کی اتنی گواہی موجود نہیں۔ اگر یہ بیان معمولی باتوں کا ہوتا تو دنیا بھر میں ایک بھی آدمی اس کے بارے میں شک نہ کرتا۔ مگر واقعات یہاں تک غیر معمولی بلکہ معجزانہ ہیں اور ان کو سچا ماننے کا نتیجہ ایسا اہم ہے کہ لوگ پس و پیش کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اناجیل دوسری صدی میں لکھی گئیں۔ اب ان کا یہ نظریہ غلط ثابت ہوگیا ہے اور مثبت شہادت کی بنا پر ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ واقعات حقیقی معنوں میں تاریخی ہیں۔ مسیحی دین نہ محض تواریخی ہے بلکہ تواریخ پر مبنی ہے۔ خداوند یسوع مسیح کی آمد بے تیاری نہیں ہوئی وہ بطور موسم گرما کی آندھی کے یکبارگی وارد نہیں ہوا۔

اوّل۔ پرانا عہدنامہ خداوند کی آمد کی تیاری ہے۔ بغیر اس انجام کے پرانا عہدنامہ نامکمل ہے۔

اس میں گناہ کے دور کرنے کا کوئی طریقہ نہیں بتایا گیا۔ یرمیاہ نبی ایک عہد کی امید دلاتا ہے (باب ۳۱) مگر یہ نہیں بتاتا کہ وہ کب اور کیونکر قائم ہوگا۔

دوم۔ انبیاء نے پیشین گوئی کی کہ ابدی و کامل بادشاہ آئے گا۔ اور خداوند کا خادم لوگوں کا کفارہ دے گا۔" اس نے ہماری مشقتیں اٹھالیں اور ہمارے غموں کو

برداشت کیا...... وہ ہماری خطاؤں کے سبب سے گھائل کیا گیا اور ہماری بدکاری کے باعث کچلا گیا...... ہم سب بھیڑوں کی مانند بھٹک گئے۔ ہم میں سے ہر ایک اپنی راہ کو پھرا۔ پر خداوند نے ہم سب کی بدکرداری اس پر لادی...... بہت لوگوں کی خطاؤں کے سبب سے اس پر مار پڑی " وغیرہ (یسعیاہ ۵۳ سارا باب پڑھنا چاہیئے) یہ یہاں تک سچ ہے کہ یسوع کے زمانے میں یہودی مسیح کی راہ دیکھتے تھے۔ اور جو یہودی مسیحی نہیں ہوئے ان میں سے اکثر اس کا انتظار اب تک کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یسوع ناصری مسیح نہیں ہے۔ اب غور کیجئے کہ نہ صرف یہودیوں کے پرانے عہدنامہ میں مسیح موعود کی تیاری ہوئی۔ بلکہ تمام دنیا میں اس کی آمد کی تیاری ہوئی تھی۔ خداوند کی آمد سے کچھ قبل برسوں کے بعد مغربی ایشیا اور یورپ میں صلح ہوئی اور بحیرۂ روم کے نزدیک ہر جگہ ایک ہی حکومت تھی۔ اور انجیل کے مبشر بغیر روک ٹوک کے جہاں چاہتے تھے جا سکتے تھے۔ رومی حکومت سے پہلے سکندر اعظم کی فتوحات نے اس تمام علاقہ میں یونانی تہذیب اور یونانی زبان پھیلا دی جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ اکثر مشنری جاتے تھے وہاں پڑھے لکھے لوگ ان کی منادی سمجھ سکتے تھے۔ اگرچہ بعض جگہوں میں ان پڑھ لوگ کم سمجھتے ہوں گے۔ (دیکھو اعمال ۱۱: ۱۴)

اس کے سوا اس زمانے میں یونان اور روم میں پرانا مت کمزور ہو رہا تھا اور اکثر پڑھے لکھے لوگ دیوی دیوتاؤں اور پرانی رسموں اور پوجا وغیرہ کو چھوڑ بیٹھے تھے۔ بلکہ بہتیرے ان پر ہنستے تھے بڑی بڑی جنگوں اور انقلابوں کے بعد اکثر ایسا نظر آتا ہے کہ لوگ لامذہب ہو جاتے ہیں۔ ساری مغربی دنیا بھوتوں اور بدروحوں سے ڈرتی تھی۔ اور رفاگیروں او جھاؤں اور جنات کے آشناؤں کو مانتی

اور ان کی تلاش میں رہتی تھی۔ نئے نئے مذہب قائم ہو جاتے تھے۔ اور جیسا کہ ہم رومیوں کے۔ پہلے باب سے اور نیز جوونل (Juvenal) اور اس زمانے کے اور مصنفوں کی کتابوں سے معلوم کر سکتے ہیں اس دنیا کا اخلاقی حال نہایت خراب تھا۔ خداوند یسوع مسیح کی آمد عین وقت پر ہوئی۔

۴۔ بہر کیف ماننا پڑتا ہے کہ اگرچہ کوئی معمولی آدمی حسن اتفاق سے مصلوب ہوتا اور تین دن کے بعد جی بھی اٹھتا تو بھی اس۔ سے بڑا نتیجہ نہ نکلتا۔ لیکن غور کریں کہ یکس کی تصلیب اور قیامت تھی۔ یسوع ناصری کو جو لوگ نجات دہندہ یا خدائے مجسم نہیں مانتے قریب قریب سب اس کی تعریف کرتے ہیں۔ جو لوگ آج کل انجیل جلیل کی تلاوت کرتے ہیں ان پر خداوند یسوع کی شخصیت کا اثر پڑتا ہے۔ اور وہ پرانے وقت کے یہودی سپاہیوں کی طرح کہتے ہیں "انسان نے کبھی کلام ایسا نہیں کیا" (یوحنا ۷: ۴۶)

مسیح کے شاگرد یہودی تھے۔ اور ہر زمانے میں یہودی وحدانیت کے کٹر ماننے والے رہے ہیں۔ جیسے آج کل مسلمان ہیں۔ وہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کر سکتے تھے۔ بفرِ وع شروع میں عبرانی اکثر بت پرستی اور شرک میں پھنس جاتے تھے۔ پر خدا نے ان کو اس کی سزا دی۔ ان کے ساتھ ایسا سلوک کیا کہ جتنے یہودی بابل کی اسیری سے واپس آئے ان میں سے یہ خرابیاں دور ہو چکی تھیں۔ بہر حال انجیلوں میں مندرج ہے کہ شمعون پطرس نے اقرار کیا "تو مسیح زندہ خدا کا بیٹا ہے" اور توما نے کہا "اے میرے خداوند اے میرے خدا" (متی ۱۶: ۱۵) (یوحنا ۲۰: ۲۸) پھر جب مسیحی کلیسیا شروع ہوئی تو یہ یہودی یسوع مسیح کو (یونانی

Kurios جو خدا تعالیٰ کا لقب ہے) خداوند کہنے لگے۔ اس کی مثالیں خطوط اور اعمال کی کتابوں میں اتنی ہیں کہ آیتوں کے اقتباس کی کوئی ضرورت نہیں۔

یہ موت اور جی اٹھنا تمام تواریخ کے ایک بڑے اور پاک شخص کی ہے۔ معمولی شخص کی نہیں۔ مسیح نے خود اپنی موت اور قیامت کی پیشین گوئی کئی بار کی (متی ۲۳: ۱۷، مرقس ۷: ۱۲ یوحنا ۱۴: ۲۰ وغیرہ)

تعجب کی بات ہے کہ جو لوگ خداوند یسوع مسیح کی تعریف کرتے ہیں پر اس کے دعویٰ کو نہیں مانتے اس غلطی کو نہیں پہچانتے یسوع کی تعریف ان باتوں پر موقوف ہے جو پاک کلام میں لکھی ہیں لیکن ان ہی انجیلوں میں یہ بھی ذکر ہے کہ یسوع نے شریعت بدلنے کا دعویٰ کیا۔ (متی ۴، ۳۴، ۳۳، ۲۸، ۲۷-۲۲، ۲۲-۲۱: ۵) گناہوں کو معاف کرنے کا اختیار اپنے آپ سے منسوب کیا (مرقس ۱۰: ۲) اپنے آپ کو پاک سبت کا مالک بتایا (مرقس ۲۸: ۲) اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کی خدمت اور اطاعت کرنا رشتہ داروں کی محبت بلکہ جان سے بھی بڑھ کر ہے (متی، ۲۵: ۱۲-۳۷: ۱۵) اور یہ دعویٰ کیا کہ دنیا کے آخر میں وہی بنی آدم کی عدالت کرے گا۔ (متی ۱۴: ۱۳، ۴۶-۳۱: ۲۵، یوحنا ۲۷: ۵، مرقس ۲۷-۲۶: ۱۳)

علاوہ اس کے خداوند یسوع نے خدا کے ساتھ ایک ہونے کا دعویٰ کیا جب وہ صدر عدالت کے سامنے پیش کیا گیا اور سردار کاہن نے پوچھا "کیا تو اس ستودہ (خدا) کا بیٹا مسیح ہے۔" تو یہ جواب دیا "ہاں میں ہوں اور تم ابن آدم کو قادرِ مطلق کے دہنی طرف بیٹھے دیکھو گے۔ اور آسمان کے بادلوں پر آتے دیکھو گے۔"

دمرقس ۶۲-۶۱ و ۱۴) یہودیوں نے خوب پہچانا کہ وہ یہ دعویٰ کرتا ہے اور سخت ناراض ہوئے۔ (یوحنا ۱۰:۳۳)

یسوع کی تعریف نہ کرنا یہ کہہ کر اس نے خود دھوکا کھایا اور اوروں کو بھی دھوکہ دیا۔ قرین عقلی ہے۔ لیکن اس کی تعریف کرنا اور اس کے دعوؤں کو جھوٹا جاننا یا نظرانداز کرنا عقلمندی نہیں۔

۷۔ نیچری مذہب میں افراد کی قدر نہیں کی جاتی اور درحقیقت قدرتی اشیا ایسی ہیں کہ ان میں مردوں کی پرواہ نہیں (مچھلیاں اکثر لاکھوں انڈے دیتی ہیں۔ لیکن ان سے نکلی ہوئی دو چار ہی مچھلیاں زندہ رہتی ہیں۔ اگر ہم خدا کی شخصیت نہ مانیں تو شخصوں کی کیوں قدر کریں) لیکن تواریخ میں ہر شخص کچھ نہ کچھ قدر رکھتا اور ہرایک کا کچھ نہ کچھ حصّہ ہوتا ہے۔ حالانکہ معمولی آدمیوں کا حصہ بہت کم ہے اگرچہ عام طور پر تواریخ میں بڑے بڑے لوگوں کا زیادہ ذکر ہوتا ہے تو بھی وہ اشخاص چھوٹے آدمیوں کی مدد کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اگرچہ نپولین قیصر ایسے ملکوں میں رہتا جس کے لوگ لڑنا نہ جانتے یا بزدل ہوتے تو وہ باوجود اپنی لیاقت کے کبھی بڑا فاتح نہ ہوسکتا۔

تواریخی مذہب یہ دکھاتا ہے اور خصوصاً مسیحی دین کی یہ تعلیم ہے کہ تواریخ یعنی دنیا کے واقعات میں خدا کا فرمان ہے۔ وہ ان کا لحاظ کرتا۔ ان کے اندر اپنی قدرت اور محبت دکھاتا ہے۔ اور ان کے ذریعے سے اپنی مرضی پوری کرتا ہے۔ تواریخ میں انقلاب ہوا کرتا ہے۔ خداوند یسوع مسیح کی آمد، خدمت، موت، قیامت و صعود نے دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا۔ پرانی چیزیں جاتی رہیں۔ دیکھو وہ نئی ہو گئیں۔ وہ

خداوند کا روز عظیم تھا جو نئے دور کا شروع تھا۔

فصل سوم

خدا کی بادشاہی

ا۔ گلتیوں کے نام پولس رسول کے خط کے پہلے باب کی چوتھی آیت میں یوں لکھا ہے: "اُسی نے (مسیح نے) ہمارے گناہوں کے لئے اپنے آپ کو دے دیا۔ تاکہ ...... ہمیں اس موجودہ خراب جہان سے خلاصی بخشے۔" عبرانیوں کے خط میں ان لوگوں کا ذکر ہے۔ جنہوں نے "آئندہ جہان کی قوتوں کا ذائقہ" لیا (۶-۵) ان آیات کا تعلق اس خیال سے ہے کہ دو قرن یا زمانے ہیں۔ یعنی موجودہ قرن اور آئندہ قرن۔ مسیح نے اپنی جان دی تاکہ آئندہ قرن کو جو آئندہ جہان بھی کہلاتا ہے شروع اور قائم کرے۔ عبرانیوں کے خط میں پھر آیا ہے (۲-۵) خدا نے اس آنے والے جہان کو ..... فرشتوں کے تابع نہیں کیا۔" آگے اُسی باب میں ذکر ہے کہ "اس آنے والے جہان کا مالک خداوند یسوع مسیح ہے۔

یسوع مسیح کی موت اور قیامت اور روح القدس کے نزول نے نئی چیزیں قائم کیں۔ یہاں تک کہ پرانی چیزیں غائب ہوگئیں۔ پرانا عہدنامہ پرانے قرن کی کتاب ہے۔ نیا عہدنامہ نئے قرن کی کتاب ہے۔ شریعت یعنی موسوی شریعت پرانی چیزوں اور پرانے قرن سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لئے خداوند یسوع مسیح نے اس کو پورا کر کے اور اس کا اصلی مطلب سکھا کر (دیکھو متی ۵-۱۷ سے ۲۸ تک)

اُسے موقوف کر دیا۔ اور "آزادی کی کامل شریعت" (یعقوب ۱۔ ۲۵) اس کی جگہ قائم کی۔ مسیح کی موت کے وقت مقدس کے پردہ کا اوپر سے نیچے تک پھٹ کر دو ٹکڑے ہو جانا اس امر کا نشان تھا کہ پرانی سکاوٹیں جن سے انسان خدا کے حضور آنے سے کسی قدر رُکتے تھے جاتی رہیں اور نیا زمانہ شروع ہو گیا۔ اگرچہ آئندہ قرن کا زیادہ حصہ اب تک باقی ہے۔ یہ خدا کی بادشاہی کا آغاز ہے۔

مسیح کی آمد اور کام "خداوند کے دن" کی آمد ہے۔ خداوند کی منادی کا شروع یہ تھا۔ "وقت پورا ہو گیا اور خدا کی بادشاہی نزدیک آگئی ہے۔" اعمال کی کتاب میں بیان ہے کہ پطرس نے اس کی طرف اشارہ کیا جب کہا "یہ وہ بات ہے جو یوایل نبی کی معرفت کہی گئی" (۲۔ ۱۶) اور "جن باتوں کی خدا نے سب نبیوں کی زبانی پیشتر خبر دی تھی..... وہ اس نے اسی طرح پوری کیں"۔ ایک موقع پر خداوند نے خود فرمایا "اگر میں خدا کی روح کی مدد سے بدروحوں کو نکالتا ہوں، تو خدا کی بادشاہی تمھارے پاس آ پہنچی (متی ۱۲۔ ۲۸) چنانچہ ہم آئندہ قرن میں رہتے ہیں اور خدا کی بادشاہی شروع ہوئی پر اب تک پورے طور پر نہیں آئی کیونکہ یسوع نے ہمکو یہ دُعا کرنا سکھائی "تیری بادشاہی آئے"۔

۲۔ عبرانی انبیا نے پہچانا کہ درحقیقت خدا دنیا کے اوپر حکومت کرتا ہے ان کے زمانے میں ایسی ایسی عالمگیر آفتیں اور مصیبتیں واقع ہوئیں جیسی ہم اس بیسویں صدی میں دیکھ چکے ہیں۔ بہر حال ان کا ایمان جاتا نہ رہا۔ کیونکہ انھوں نے اُن جنگوں۔ ظلموں۔ قوموں کی اسیری وغیرہ میں خدا کا ہاتھ پہچانا۔ اور برابر سکھاتے رہے کہ خداوند ساری دنیا کا مالک ہے۔ اور ان واقعات

کے ذریعے سے سزا و جزا دیتا اور اپنی مرضی پوری کرتا ہے پر انھوں نے یہ نہ سکھایا کہ خدا کی بادشاہی آگئی۔ بلکہ ایک کامل بادشاہ۔ کامل خادم کی پیشین گوئی کی جو آئے گا۔ ان پیشین گوئیوں کو خداوند یسوعؔ مسیح ہی نے پورا کیا۔

۳۔ خدا کی بادشاہی یا آسمان کی بادشاہی کا انجیلوں میں بار بار ذکر آتا ہے۔ محاوروں سے خدا کا بادشاہی کرنا مراد ہے۔ انجیلوں سے ظاہر ہے کہ اوّل یہ بادشاہی اب موجود ہے۔ دوم۔ اس کی تکمیل ابدیت میں ہوگی۔ سوم۔ ایمانداروں کو چاہیئے کہ اس بادشاہی کو ڈھونڈھیں۔ اور اس کے لئے دعا کریں۔

اوّل۔ یہ موجود ہے۔ بہت سی تمثیلوں میں خدا کی بادشاہی کی خاصیتیں اس طرح بیان کی جاتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب موجود ہے یا آرہی ہے۔ مثلاً کڑوے دانوں۔ رائی کے دانوں۔ خمیر۔ چھپے خزانے۔ تاکستان کے مزدوروں کی تمثیلیں (متی ۱۳۔ ۲۴۔ سے ۳۰ اور ۳۶ سے ۴۳ تک ، متی ۱۳۔ ۳۱ اور ۳۲ وغیرہ ، متی ۱۳۔ ۲۳ وغیرہ ، متی ۱۳۔ ۴۴ ، متی ۲۰۔ ۱ سے ۱۶ تک)۔

فریسیوں سے خداوند یسوعؔ نے فرمایا "خدا کی بادشاہی ظاہری طور پر نہ آئے گی۔ اور لوگ یہ نہ کہیں گے کہ دیکھو یہاں ہے یا وہاں ہے کیونکہ دیکھو خدا کی بادشاہی تمہارے درمیان ہے۔ (لوقا ۱۷۔ ۲۰ اور ۲۱) اس آیت کا یہ بھی ترجمہ ممکن ہے "خدا کی بادشاہی تمھارے اندر ہے۔" پر مسیح نے یہ باتیں فریسیوں سے کہیں اور اس میں شک نہیں کہ یسوعؔ کے ان مخالفوں کے اندر خدا کی بادشاہی نہ تھی۔ ان الفاظ کا یہ مطلب ہے کہ خداوند یسوعؔ مسیح (اور اس کے شاگردوں) کی موجودگی خدا کی بادشاہی کی موجودگی تھی۔

جب یوحنا بپتسمہ دینے والے نے اپنے شاگردوں کو یسوع کے پاس اس کے مسیح ہونے یا نہ ہونے کی بابت دریافت کرنے کے لئے بھیجا تو ان کے چلے جانے کے بعد خداوند نے لوگوں سے یوحنا کی تحسین کر کے فرمایا "جو عورتوں سے پیدا ہوئے ہیں اُن میں یوحنا بپتسمہ دینے والے سے کوئی بڑا نہیں، لیکن جو خدا کی بادشاہی میں چھوٹا ہے وہ اُس سے بڑا ہے۔" (لوقا۔ ۷۔ ۲۸) یعنی یوحنا پُرانے قرن یعنی پُرانے عہد کا سب سے بڑا شخص تھا۔ لیکن اب نیا عہد کا زمانہ نیا قرن شروع ہوا۔ خدا کی بادشاہی قائم ہونے لگی اس کی رعایا میں ادنیٰ شخص پُرانے زمانہ کے ہر شخص سے بڑا مرتبہ رکھتا ہے۔

دوم۔ خدا کی بادشاہی حالانکہ موجود ہے پورے طور پر نہیں آئی۔ آخری عشاء کے وقت ہمارے خداوند نے فرمایا "میں تم سے کہتا ہوں۔ کہ انگور کا شیرہ اب سے کبھی نہ پیوں گا۔ جب تک خدا کی بادشاہی نہ آئے۔" (لوقا ۲۲۔ ۱۸) پھر شمعون پطرس کے اقرار کے بعد یسوع نے کہا "جو یہاں کھڑے ہیں اُن میں سے بعض ایسے ہیں کہ جب تک خدا کی بادشاہی کو قدرت کے ساتھ آیا ہوا نہ دیکھ لیں موت کا مزہ ہرگز نہ چکھیں گے۔" (مرقس۔ ۹۔ ۱۔ وغیرہ) غالباً اشارہ روح القدس کے نزول کی طرف ہے۔ پھر بعض تمثیلیں آنے والی بادشاہی کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ مثلاً بڑے جال کی تمثیل (متی ۱۳۔ ۴۷ سے ۵۰ تک) دس کنواریوں۔ توڑوں۔ اور آخری عدالت کی تمثیلیں (متی۔ ۲۵)

پولُس کے خطوط میں کئی دفعہ خدا کی بادشاہی کا وارث ہونے کا ذکر

آتا ہے (مرقس ۹-۱، کلسیوں ۵-۲۱، افسیوں ۵-۵ وغیرہ) ان سے ظاہر ہے کہ خدا کی بادشاہی کی تکمیل آیندہ ہے۔

ان دو باتوں میں اختلاف نہیں کیونکہ کسی حالت یا انتظام کا شروع ہونا اور چیز ہے اور اس کی تکمیل اور۔

سوم۔ پھر چونکہ ابھی تک خدا کی بادشاہی پورے طور پر نہیں آئی لہذا ایمانداروں کو حکم دیا گیا، کہ دعا کریں کہ پورے طور پر آجائے "تیری بادشاہی آئے" دعائے ربانی کا ایک فقرہ ہے۔ اور ہم کو اس میں داخل ہونے کی کوشش کرنا ہے "تنگ دروازہ سے داخل ہو۔" (متی ۷-۱۳) یہی الفاظ دوسرے معنی میں لوقا کی انجیل میں آتے ہیں۔ (۱۳-۲۴) پہلے جملہ میں ہلاکت کے راستہ کی آسانی اور کشادگی پر زور دیا جاتا ہے۔ دوسرے مقام میں یہ خیال ہے کہ زندگی میں داخل ہونا مشکل ہے اور بعض لوگ اس کی مشکلوں کے سبب سے داخل نہ ہو سکیں گے۔ پھر یسوع نے فرمایا "پہلے اُس کی بادشاہی اور اس کی راستبازی کی تلاش کرو۔" (متی ۶-۳۳) ایک اور مقام میں بتایا جاتا ہے کہ دولت مندوں کا داخل ہونا مشکل ہے (متی ۱۰-۲۳ وغیرہ) اور پھر یہ کہ داخل ہونے والے کی سادہ دلی بچے کی سی ہونا لازم ہے (مرقس ۱۰-۱۵)۔ یوحنا کی انجیل میں داخل ہونے کی شرائط نئی پیدائش اور بپتسمہ بتائے گئے (یوحنا ۳-۳ اور ۵) اسی کے مطابق مسیح نے یہ فیصلہ کیا کہ خدا کی بادشاہی یہودیوں سے لے لی جائے گی، اور ایسی قوم کو دی جائے گی، جو اس کے پھل لائے (متی ۲۱-۴۳)

۴۔ خدا کی بادشاہی کے مسئلہ کی بنیاد مسئلہ تخلیق ہے۔ چونکہ خدا

خالق ہے۔ اور ساری کائنات اور ارواح مخلوق ہیں اس لئے خدا ان کا مالک اور بادشاہ ہے۔ تمام قدرتی اشیا اور تمام نظامِ قدرت اُس کی مرضی کے مطابق مخلوق ہوئے اور اسی کے ماتحت ہیں۔ خدا کو پسند آیا کہ انسان کو قوتِ ارادہ بخشے۔ اور انسان یہاں تک خود مختار ہے کہ وہ اپنی مرضی کے موافق یا تو خدا کی بادشاہی کو قبول کرے یا باغی ہو جائے۔ ....

.... چنانچہ بنی آدم کے درمیان خدا کی بادشاہی قائم کرنا پڑی۔ کیونکہ انسان نے بدی اور نافرمانی اختیار کی جس سے وہ خدا کی بادشاہی سے محروم رہا۔ (رومیوں ۳-۲۳) پولس یہ بھی سکھاتا ہے کہ انسان کے گنہگار بننے کے سبب سے تمام مخلوقات (یعنی اس دُنیا کی) کسی نہ کسی قدر بگڑ گئی ہے (رومیوں ۸-۲۰ سے ۲۲ تک)

پھر خداوند تعالیٰ نے ایک قوم بنی اسرائیل کو چُنا کہ دنیا میں وحدانیت کا ایمان سیکھے۔ اور اُسے قائم رکھے اور نیز خدا کی خاص ملکیت اور بادشاہی ہو۔ خدا ان کا بادشاہ سمجھا جاتا تھا (اسموائیل ۸-۷ سے ۹ تک) اسی لئے اُن کے بادشاہ خداوند کے ممسوح کہلاتے تھے۔ پھر اسرائیل کو لازم تھا کہ وہ دُنیا میں خدا کی بادشاہی قائم کرے۔ الغرض تمام پُرانا عہدنامہ شاہد ہے کہ بنی اسرائیل نے بار بار خدا سے برگشتہ ہو کر بُت پرستی اور ناراستی اختیار کی اور اُن کے انبیا بتاتے رہے کہ ایک کامل بادشاہ آئے گا۔ اُن کی یہ پیشین گوئی خداوند یسوع مسیح سے پوری ہوئی۔

ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ خدا ہمارا خالق ہے۔ یہی حقیقت خدا کی بادشاہی

کی بنیاد ہے۔ دوسری بنیاد یہ ہے کہ خدا نے مسیح میں ہو کر اپنی بے پایاں محبت ظاہر فرمائی اور دُنیا کا اپنے آپ سے میل ملاپ کیا (۲ کرنتھیوں ۵-۱۹)۔

۵- کلیسیا خدا کی بادشاہی نہیں ہے۔ حالانکہ بعض نے تعلیم دی کہ کلیسیا اور خدا کی بادشاہی مترادف ہیں۔ اوّل تو کلیسیا اُس وقت قائم ہوئی جب خُدا نے ابرہام کو بلایا اور بنی اسرائیل قوم بھی تھی اور کلیسیا بھی۔ نیا عہدنامہ سکھاتا ہے کہ مسیحی کلیسیا اسرائیل کا قائم مقام بلکہ حقیقی اسرائیل ہے (فلپیوں ۳-۳ وغیرہ)۔ چنانچہ اسرائیل کی طرح کلیسیا خدا کی خادم اور اس کی بادشاہی قائم کرنے کا وسیلہ ہے۔ پھر خدا کی بادشاہی کی رعایا سب اس کی حکومت مانتے ہیں پر جیسا بارہ رسولوں میں سے ایک یہوداہ اسکریوتی "شیطان" تھا۔ (یوحنا-۲-۷۰) ویسا ہی دیدنی کلیسیا میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو حقیقی مسیحی اور خدا کے ماننے والے نہیں ہیں۔

خدا کی بادشاہی کوئی جماعت یا انجمن نہیں بلکہ خدا کی حکومت۔ یا خدا کا تسلط ہے۔ اس وقت وہ نامکمل ہے پر دنیا کے آخر میں پوری ہو جائے گی۔

۱-کرنتھیوں کے پندرہویں باب میں یوں لکھا ہے کہ مسیح کے آنے کے "بعد آخرت ہوگی۔ اُس وقت وہ ساری حکومت اور سارا اختیار اور قدرت نیست کرکے بادشاہی خدا یعنی باپ کے حوالہ کرے گا۔......... اور جب سب کچھ اس کے تابع ہو جائے گا تو بیٹا خود اس کے تابع ہو جائے گا جس نے سب چیزیں اس کے تابع کر دیں تاکہ سب میں خدا ہی سب کچھ ہو۔" (۱۵-۲۴ اور ۲۸)

۶- خداوند یسوع مسیح نے پیلاطس کے سامنے اپنی بادشاہی کا ذکر کیا اور کہا "میری بادشاہی اس دُنیا کی نہیں۔" (یوحنا-۱۸-۳۶) واقعی خدا کی

بادشاہی مسیح کی ہے۔ وہی اس کو قائم کرنے کے لئے مجسم ہوا۔ اور زندگی بسر کرنے معجزے دکھانے اور خدا کی تعلیم دینے کے بعد مرا اور جی اٹھا کہ خدا کی بادشاہی قائم کرے۔ یسوع کے کلام سے ظاہر ہے کہ اس نے مسیح ہونے کا دعویٰ کیا۔ (متی ۔ ۱۶۔ ۱۶ اور ۱۷ ، مرقس ۱۴۔ ۶۱ اور ۶۲ وغیرہ)

پُرانا عہدنامہ غیر مکمل ہے۔ اُس میں کوئی صحیح طریقہ نہیں بتایا جاتا جس سے انسان شریعت کو پورا کرے۔ نئے عہد کا ذکر ہے (یرمیاہ ۔ ۳۱) پر یہ نہیں بتایا جاسکتا تھا کہ انسان اس نئے عہد کو کیونکر پورا کرے۔ دل کی تبدیلی کا بھی ذکر ہے (یرمیاہ ۳۱ ، حزقی ایل ۳۶ ۔ ۲۶) پر یہ نہیں بتایا جاتا ہے۔ کہ نیا دل کیونکر پیدا ہو۔ ابدی کامل بادشاہ کا ذکر ہے مگر صرف پیشین گوئی کے طور پر۔ یہی وجہ ہے کہ مسیح کے زمانہ میں یہودی مسیح کی راہ دیکھتے تھے۔ اور ان میں سے چند نے یسوع ناصری کو پہچانا بھی کہ یہ مسیح ہے۔

یہودی اور غیر یہودیوں کے درمیان سخت مخالفت تھی۔ حالانکہ خدا نے اسرائیلی قوم کو غیر قوموں کو نجات کی راہ بتلانے کے لئے مقرر کیا۔ یہی یوناہ کی کتاب کا مطلب ہے۔ یوناہ قوم اسرائیل ہے۔ بڑی مچھلی بابل ہے جس نے یہودیوں کو نگل لیا پر وہ اسیری سے چھوٹ گئی۔ اسرائیل یوناہ کی طرح خدا کی مرضی پوری کرنے سے جھجھکا اور سخت تعصب سے بھرا رہا۔ یہ مخالفت خداوند یسوع نے ختم کرنے کا بندوبست کیا (دیکھو۔ افسیون ۲ ۔ ۳)

خدا کی بادشاہی محض قدرتی ارتقا کا نتیجہ نہیں۔ بعض لوگ اب تک خیال کرتے ہیں کہ انسان ترقی کرتے کرتے قدرتی طور پر اُس حالت کو حاصل

کریں گے کہ دنیا میں امن و امان اور ہر قسم کی بہبودی اور خوبی پیدا ہوگی حالانکہ بیسویں صدی کے واقعات دکھاتے ہیں کہ جس قدر بنی آدم قدرتی اشیا پر اختیار حاصل کرتے ہیں اُسی قدر آفتیں بڑھ جاتی ہیں۔

خدا اپنی بادشاہی خود دُنیا میں لایا۔ اس نے مسیح کی زندگی۔ تعلیم معجزوں موت۔ جی اُٹھنے۔ اور روح القدس کے نازل ہونے سے اپنی قدرت دکھائی۔ (Dodd) ڈاڈ صاحب فرماتے ہیں کہ "یسوع مسیح کی تصلیب ایک بیحد آفت تھی۔ جس میں خدا کے خلاف انسان کی بغاوت کمال تک پہنچی اور گناہ نے تواریخ کے صفحوں پر اپنی خرابی لکھی۔ مسیح کی قیامت نے اُس آفت ہی کو بنیاد روحانی موقع بنا دیا جس سے اس دُنیا کے اندر انسان نئی روحانی حالت حاصل کر سکتے ہیں...... یوں تواریخ میں خدا کی عدالت اور دی ہوئی نجات وقوع میں آئی۔ یہ خدا کی بادشاہی کی آمد تھی۔" (نیز دیکھو رومیوں ۸) عبرانیوں ۷۔ ۲۵، متی ۱-۳۲ اور ۳۴)

۷۔ دنیا میں مسیح کے وقت سے آج تک خدا اور اس کی بادشاہی کی مخالفت کی جاتی ہے۔ یا یوں کہیں کہ نیکی اور بدی کے درمیان جنگ ہوتی ہے۔ بعض اوقات کچھ عرصہ تک معلوم ہوتا ہے کہ کسی ملک کے باشندوں کی زبردستی اور ظلم کامیابی پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً ۱۸۷۰ء میں جرمنی نے دغابازی سے فرانس کو جنگ میں پھنسایا تاکہ اس کو نیچا کر دکھلائے۔ اور یہ جنگ سلسلہ میں تیسری تھی جس میں جرمنی کامیاب ہوئی۔ پر ۱۹۱۴ء میں جرمنی نے دوبارہ جنگ کی اور ہار گئی۔ سب کو یاد ہے کہ ۱۹۳۹ء میں جرمنی ہی نے پھر جنگ

چھیڑی تاکہ دنیا کو فتح کرے اور سب کو یاد ہے کہ اس کا نتیجہ جرمنی کی بربادی ہوئی۔
تواریخ سے ظاہر ہے کہ آخر کار قومی گناہوں کی سزا اسی دنیا میں ہوتی ہے۔
شخصی گناہوں کا نتیجہ بعض اوقات دنیاوی ذلت ہوتا ہے پر بعض اوقات یہ نتیجہ صرف اندرونی یعنی روحانی مُردگی ہوتا ہے۔ زبور نویس اکثر شریروں کی خوشحالی کی شکایت کرتے ہیں۔ کیونکہ اس زمانہ میں یہ معلوم نہ ہو گیا تھا کہ گناہوں کا نتیجہ ہمیشہ ظاہری نہیں ہوتا اور اسرائیلی لوگ اکثر یہ خیال کرتے تھے کہ دنیاوی کامیابی اور ترقی نیکی ہی کا نتیجہ اور خدا کی خوشنودی کا ثبوت ہے۔
فی زمانہ (۱۹۵۱ء) تمام دُنیا کی قوموں کا تمدّن اور طرزِ زندگی زیرِ عدالت ہے۔ اس زمانہ کے انقلابات اور اس کی مصیبتیں قوموں کی بداخلاقی، لالچ اور اندرونی بدانتظامی اور ظلم کا نتیجہ ہیں۔ تبدیلی کی ضرورت عرصہ سے ہے اور اگر قومیں خدا کی بادشاہی قبول کرکے اپنے تمدّن کی اصلاح نہ کریں گی تو دُنیا کی کایا پلٹ ہو جائیگی۔ اور اس کے ساتھ بڑی بڑی آفتیں دُنیا کے باشندوں پر آئیں گی۔
جب قومی گناہوں کا ذکر کیا جاتا ہے تو اُن سے نہ صرف بڑے بڑے حاکموں اور پیشواؤں ہی کے گناہ مُراد ہیں۔ عموماً عوام کی خود غرضی، شہوت۔ رشوت، بیرحمی۔ نشہ بازی۔ بددیانتی وغیرہ حاکموں کی بُرائیوں سے زیادہ بُرے نتائج پیدا کرتی ہیں۔ خدا سے قومی مخالفت انفرادی مخالفت کا نتیجہ اور مجموعہ ہے۔ پُرانے زمانہ میں روم کی بربادی زیادہ تر عام لوگوں کی غلطیوں۔ لاپروائی۔ اور خود غرضی سے پیدا ہوئی اور ہر زمانہ میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ جیسا مسیح نے خود فرمایا "جو میرے ساتھ جمع نہیں کرتا وہ بکھیرتا ہے" (متی ۱۲ - ۳۰) اور "جو پودا میرے آسمانی باپ نے

نہیں لگایا جڑ سے اُکھاڑا جائے گا" (متی۔ ۱۵۔ ۱۴)

ہم ابدی خدا کی بادشاہی قبول کرتے ہیں (یعنی اُس سے رفاقت حاصل کرتے ہیں، جب کہ ہم اپنے زمانے کے واقعات اور شخصوں کے متعلق خدا کی مرضی کے مطابق خاص رویّہ اختیار کرتے ہیں۔ خدا کی بادشاہی کے دنیا میں ہمارے درمیان شروع ہونے کا مطلب یہی ہے۔ کیونکہ خدا نے جس نے فرمایا تم خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل سے محبّت رکھو یہ بھی حکم دیا اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبّت رکھو۔ سلسلہ تواریخ ابھی ختم نہیں ہوا۔ خدا کی ایماندار رعایا کو موقعہ ہے۔ کہ وہ الٰہی انتظام سے واقعات کے درمیان بلکہ ان کے ذریعہ ایک نئی اور اچھی دنیا بنائے۔ خدا کی بادشاہی کا ایک مقصد یہی ہے۔ چنانچہ ابدی زندگی اس دنیا میں شروع ہوتی ہے۔ یوحنا کی انجیل کے سترھویں باب کی تیسری آیت میں یوں مرقوم ہے "ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھ خدائے واحد اور برحق کو اور یسوع مسیح کو جسے تو نے بھیجا ہے جانیں" غور طلب بات ہے کہ اس آیت میں زمانۂ حال کا ذکر ہے۔ یہ نہیں کہ "ہمیشہ کی زندگی ہوگی" بلکہ یہ کہ "ہمیشہ زندگی ہے۔"

۸۔ خدا کی بادشاہی ایک وقت پوری ہوگی۔ اس "وقت" کو ہم آخری دن کہتے ہیں۔ خداوند یسوع نے کئی بار اس کا ذکر کیا "اگر میں چاہوں کہ یہ میرے آنے تک ٹھہرا رہے تو تجھ کو کیا؟" (یوحنا ۲۱-۲۲)

جب تک ایک بھی رسول زندہ رہا مسیحیوں کو گمان تھا کہ ان کی زندگی کے ایام میں خداوند پھر آجائے گا۔ چنانچہ رسولوں نے ایسے الفاظ لکھے ہیں جن سے ظاہر ہے کہ اب بھی ایک معنی میں خداوند آچکا ہے اور ہم "آئندہ جہان کی قوتیں" حاصل

کرتے ہیں۔ جب ہم سب کے بے نقاب چہروں سے خداوند کا جلال اس طرح منعکس ہوتا ہے، جس طرح آئینہ میں، تو اس خداوند کے وسیلہ سے جو روح ہے ہم اُسی جلالی صورت میں درجہ بدرجہ بدلتے جاتے ہیں (۲۔کرنتھیوں ۳۔۱۸) "پرانی چیزیں جاتی رہیں دیکھو وہ نئی ہو گئیں"۔ (۲۔کرنتھیوں ۵۔۱۷) "اسی نے ہم کو تاریکی کے قبضہ سے چھڑا کر اپنے عزیز بیٹے کی بادشاہی میں داخل کیا"۔ (کلسیوں ۱۔۱۳) "تم فانی تخم سے نہیں بلکہ غیر فانی سے خدا کے کلام کے وسیلے سے جو زندہ اور قائم ہے نئے سرے سے پیدا ہوئے ہو"۔ (۱۔پطرس ۱۔۲۳) "تاریکی مٹتی جاتی ہے اور حقیقی نور چمکنا شروع ہو گیا"۔ (۱۔یوحنا ۲۔۸)

پر دوسرے معنوں میں تواریخ کا خاتمہ ہونے والا ہے۔ آخری دن مسیح ایمانداروں کو پوری زندگی بخشے گا۔ اور وہ جلال میں ظاہر ہوگا۔ اس نے خود فرمایا "میں اُسے آخری دن پھر زندہ کروں گا"۔ (یوحنا ۶۔۴۴ وغیرہ) ممکن ہے کہ خداوند کی یہ دوسری آمد دین عیسوی کا سب سے بڑا واقعہ نہ ہو لیکن جب وہ آمد ہوگی تو کلیسیا کے اس اعتقاد پر صاد کرے گی کہ مسیح کا مکمل کام کلیسیا کی زندگی بلکہ دنیا کی تمام تواریخ کا سب سے بڑا واقعہ ہے۔ (دیکھو باب ۸)

باب چہارم

کفّارہ۔ مسیحِ مصلوب

فصلِ اوّل

انسان کی ضرورت اور اسکی کوششیں

ہر ایک دین میں یہ ضروری سمجھا جاتا ہے کہ انسان اپنے گناہوں کے متعلق کچھ کرے۔ اورنگزیب کی بابت روایت ہے کہ اُس نے کہا "میں ساٹھ برس سے دُنیا میں رہتا ہوں اور میں نے گناہوں کا ٹیلا پیدا کیا۔ اس کے لئے کیا کیا جائے"؟ انسان اپنے گناہوں کے متعلق طرح طرح کا کام تجویز کرتا رہا ہے۔ جن مذہبوں میں گناہ کی خرابی نہیں پہچانی گئی ہے انمیں بعض اوقات یہ خیال کیا جاتا ہے کہ نیک کام اور بُرے کام تولے جائیں گے اور اگر نیک کام زیادہ ہوں گے، تو آدمی کے بُرے کام مٹ جائیں گے۔ حالانکہ خالق کا حق یہ ہے کہ پیدائش کے روز سے مرتے دم تک آدمی بُرائی نہ کرے اور نہ بھلائی کرنے میں قاصر رہے۔ چنانچہ کوئی

مزید نیکی نہیں ہو سکتی جو بدی کے عوض میں دی جائے۔

۱۔ دین کے شروع میں اور آج کل ناقص یا بگڑے ہوئے مذہبوں میں انسان خدا کو ہدیئے دیتا ہے۔ تاکہ اُسے راضی کرے۔ یہاں تک کہ قربانی ایک قسم کی رشوت معلوم ہوتی ہے جو خدا کو دی جاتی ہے۔ بعض اوقات مسیحیوں میں یہ بات نظر آتی ہے۔ اور لوگ خیال کرتے ہیں کہ ہم مذہبی رسموں کو ادا کرنے سے معافی حاصل کریں گے۔

۲۔ اس سے ایک اونچا درجہ جب یہ پہچانا جاتا ہے کہ محض رسم ادا کرنے سے کچھ نہیں بن پڑتا ہے اور جب تک انسان نیک نیتی سے قربانی نہیں گذرانتا یا رسم ادا نہیں کرتا اس وقت تک اس کی قربانی مقبول نہیں ٹھہرتی۔ چند انبیا اس بات پر زور دیتے ہیں۔ مثلاً۔ عاموس۔ باب ۴۔ ۵، یسعیاہ ۱۱۔ ۸ہوسیع ۶۔ ۶، میکاہ ۶۔ ۶سے ۸ تک

۳۔ پھر آدمیوں نے پہچانا کہ توبہ اور شکستہ دلی کی ضرورت ہے "شکستہ روح خدا کی قربانی ہے۔ اے خدا۔ تو شکستہ اور خستہ دل کو حقیر نہ جانے گا" زبور ۵۱۔ ۱۷) یہ نہایت بہتر ہے اور ہر زمانہ میں ضروری لیکن اس میں اندیشہ ہے کہ آدمی اپنے ایمان۔ اپنی توبہ۔ اپنی شکستہ دلی پر بھروسہ رکھے۔ پھر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی درحقیقت خود بین رہتا ہے اور اپنی توبہ اور اپنے ایمان کے ذریعہ سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔

۴۔ درحقیقت ہم صرف اُس وقت خدا ہی پر بھروسا کرتے ہیں۔ جب مسیح مصلوب کی صلیب پر غور کرتے وقت ہم یہ پہچانتے ہیں کہ ہم کو خدا کے ہاتھ سے مفت معافی اور نجات لینا ہے۔ مُسرف بیٹے کی تمثیل کو بغیر اسی باب کی

باقی دو اور تمثیلوں کے پڑھنا غلط فہمی کا باعث ہوا ہے اور ہوتا ہے۔ جب ہم صرف مسرف بیٹے کی تمثیل کو مدِنظر رکھتے ہیں تو ہم کو یہ گمان ہو سکتا ہے کہ اُس نے اپنے آپ کو باپ کے پاس لوٹ کر اپنی توبہ کے زور سے بچایا۔ لیکن کھوئے ہوئے سکّے اور کھوئی ہوئی بھیڑ کی تمثیلوں سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ بچانے والا خدا ہی ہے۔ عورت نے سکّہ ڈھونڈھا، وہ اپنے آپ نہیں لوٹ سکا۔ چرواہے نے بھیڑ کو جا کر بچا لیا، وہ خود نہیں لوٹ سکی۔

۵۔ پُرانے زمانہ میں یہودیوں کو شریعت میں طرح طرح کی قربانیاں گذراننے کا حکم ملا۔ پر اگرچہ اُن میں خطا کی قربانی شامل تھی، تو بھی اُن گناہوں کے لئے کوئی قربانی نہ تھی جو جان بوجھ کر کئے جاتے تھے اور بے باکی یا عمد کے گناہ کہلا سکتے ہیں۔ ان کی بابت حکم تھا کہ کرنے والا اُمّت سے کاٹ دیا جائے۔ حالانکہ بعد کو بعض یہودی مُعلّم سکھانے لگے کہ ایسے گناہوں کے کرنے والوں کو خدا کی رحمت پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ اور یہ بھی سکھایا گیا کہ کفّارہ کے دن کی قربانیاں تمام اسرائیلیوں کے سب گناہوں کے لئے کارآمد ہوتی تھیں بشرطیکہ توبہ کی جائے۔ (مِشنا) بہر حال احبار کے سولھویں ۱۶ باب میں اس کا ذکر نہیں ہے۔

۶۔ پھر اسرائیلی قربانیوں میں ایک کمی تھی۔ اسرائیلی بے سمجھ جانوروں کی قربانی کرتے تھے۔ جانور کی بے عیبی محض مادّی اور جسمانی تھی۔ اور یہ اندیشہ ہر وقت رہتا تھا کہ لوگ رسم ہی پر بھروسا رکھیں جیسا انبیا کے صحیفوں سے صاف ظاہر ہے۔ (مذکورۂ بالا سطور مدِنظر رہیں۔) اور یہ قربانیاں زیادہ تر طہارت اور جسمانی پاکیزگی کے متعلق تھیں۔ (دیکھو عبرانیوں ۹۔ اور ۱۰)

بہرحال اُن میں فوائد بھی تھے۔ جو لوگ عبادت دل سے کرتے تھے، اُن کے ضمیر زندہ ہوتے تھے۔ وہ یہ سیکھتے تھے کہ خدا اُن کی رفاقت چاہتا ہے۔ جب قربانی لانے والا بھینٹ پر اپنا ہاتھ رکھتا تھا تو سیکھتا تھا کہ یہ قربانی میرے بدلہ میں دی جاتی ہے اور میرا دل سے مخصوص ہونا ضروری ہے۔ نیز قربانیاں نہ صرف انفرادی بلکہ قومی ہوتی تھیں۔

خاص بات خطا کی قربانی میں یہ تھی کہ خون (یعنی جان) گذرانا جاتا تھا۔ اور یہ کفارہ خدا کا دیا ہوا تھا۔ دیکھو احبار ۱۷:۱۱ جہاں لکھا ہے "جسم کی جان خون میں ہے اور میں نے مذبح پر تمہاری جانوں کے کفّارہ کے لئے اسے تم کو دیا ہے۔ کہ اس سے تمہاری جانوں کے لئے کفّارہ ہو۔ کیونکہ جان رکھنے ہی کے سبب سے خون کفّارہ دیتا ہے۔" اس سے عابد سیکھتے تھے کہ یہ خون ہماری جانوں کے بدلے دیا جاتا ہے۔ گناہ کے سبب سے ہم کو موت کی سزا اُٹھانا چاہیئے پر خدا یہ معاوضہ قبول کرتا ہے۔ نیز وہ یہ بھی سیکھتے تھے کہ کفّارہ خدا کی بخشش ہے۔ شاید یہ لکھنا چاہیئے کہ وہ "سیکھ سکتے تھے" لیکن نبیوں کے صحیفوں سے ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل میں سے بعض نے یہ سبق سیکھے تھے۔

۷۔ عہد قائم کرتے وقت بھی قربانی ہوتی تھی۔ عبرانیوں کے خط میں اس کی طرف اشارہ ہے۔ (باب ۹) پیدائش کے پندرھویں باب میں جہاں خدا کا نشان ذبح کئے ہوئے جانوروں کے حصّوں کے درمیان ابراہام کو گذرتا نظر آیا۔ اور یرمیاہ ۳۴: ۱۸ اور ۱۹ میں اس کا ذکر ہے۔

یرمیاہ کی کتاب کی ۳۱ویں باب میں نئے عہد کا ذکر اور اس کا وعدہ ہے

حالانکہ وہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ نیا عہد کس طور پر قائم کیا جائے گا (دیکھو۔ عبرانیوں) اور نئے عہد نامہ میں ذکر ہے کہ خداوند یسوع مسیح نے "جس رات وہ حوالہ کر دیا گیا،" پیالہ دیتے وقت فرمایا یہ" میرے خون میں نیا عہد ہے۔" یا شاید" یہ میرا وہ عہد کا خون ہے...... " (متی ۲۶-۲۸ + مرقس ۱۴-۲۴) ۱-کرنتھیوں ۱۰-۱۱)

پرانے عہد کا ذکر خروج کی کتاب میں ملتا ہے یعنی بیسویں باب سے تیئسویں باب تک اور چوبیسویں باب میں ذکر ہے کہ موسیٰ نے اسے قربانی سے مقدس اور پائیدار ٹھہرایا۔ اور اس وقت خون مذبح اور عہد کے طومار اور لوگوں پر چھڑکا گیا۔ یہ پہلے عہد کا خون ہے اور وہ عہد شریعت پر موقوف تھا کہ اگر امت خدا کے حکموں پر عمل کرے تو وہ اُن کا خدا ہوگا اور ملک موعود ان کو دے گا۔ بہر حال جیسا تواریخی کتابوں اور نبیوں کے صحیفوں سے ظاہر ہے، بنی اسرائیل اس عہد کو برابر توڑتے رہے۔

نیا عہد یہ ہے کہ خدا مسیح کی خاطر، مسیح پر ایمان رکھنے والوں کے گناہوں کو معاف کرتا اور ان کو دور کر کے ان ایمانداروں کا اپنے سے میل ملاپ کرتا اور اپنا پاک روح اُن کے دلوں میں ڈالتا ہے۔ یسوع مسیح کا خون اس نئے عہد کا خون ہے اور پاک شراکت کی مے اُس کا نشان ہے

۸۔ خداوند یسوع مسیح اس لئے آیا کہ خدا کی بادشاہی قائم کرے۔ اور بنی آدم توبہ کر کے اور نئے عہد کی خوشخبری کو مان کر اس میں شریک ہوں (مرقس ۱-۱۵) یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیں کہ وہ انسان کو راست بنانے آیا۔ لیکن انسان کی راستی یہ ہے کہ خدا سے اس کا تعلق درست ہو۔ اکثر دینوں میں

یہ بتایا جاتا ہے۔ کہ سب سے پہلے آدمی نیک بنے اور بعد ازاں خدا سے اس کا تعلق درست ہو جائے گا۔ برعکس اس کے خداوند یسوع گنہگاروں کو بلانے آیا اور اُن کو سکھاتا رہا کہ خدا تم سے محبت رکھتا ہے اور تائب گنہگاروں کو قبول کرتا ہے یعنی مسیحی دین کی تعلیم یہ ہے کہ خدا گنہگاروں کو قبول کر کے ان کو نیک اور راستباز بناتا ہے۔ دراصل انسان اپنے آپ کو نیک نہیں بنا سکتا ہے وہ صرف خدا کی دعوت کو قبول کر سکتا ہے بس مسیحی دین کا انتظام درست ہے۔

۹۔ مذکورہ بالا سطور میں ایک بات قلم انداز کی گئی ہے۔ جیسے ایک بزرگ نے کہا "اب تک تو نے گناہ کی اہمیت پر غور نہیں کیا" گناہ انسان اور خدا کے درمیان گویا پردہ تانتا ہے جس کا ایک نشان مقدس کا پردہ تھا جو مسیح کی موت کے وقت اوپر سے نیچے تک پھٹ کر دو حصے ہو گیا۔ اس کے سبب سے خدا کی دعوت قبول کرنا نہایت دشوار ہے اور گنہگار سے سچی توبہ نہیں ہوتی کیونکہ کامل توبہ کا ایک حصہ یہ ہے کہ گنہگار گناہ کی بدی پہچان کر اس کے لائق افسوس کرے پر گنہگار کا دل سخت ہوتا ہے اور اس سے یہ کام نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ جب وہ گناہ کی اہمیت پہچاننے لگتا ہے تو یقین نہیں کر سکتا کہ پاک ترین خدا مجھ کمبخت کو قبول کریگا۔

خداوند یسوع مسیح انھیں باتوں کی خاطر مصلوب ہوا تاکہ گناہ کی برائی پہچانی جائے اس پر خدا کا فتویٰ ظاہر ہو اور پورا کیا جائے۔ انسان کو توبہ کی توفیق حاصل ہو اور خدا سے اس کا میل ملاپ ہو جائے۔

فصل دوم

مسیح کی موت

۱۔ حالانکہ مسیح کی شخصیت اور کام کو ہم ازروئے تواریخ پورے طور پر نہیں سمجھ سکتے تو بھی اس کی موت پر غور کرتے وقت لازم ہے کہ ہم سب سے پہلے دیکھیں کہ تواریخ کے لحاظ سے اس کے کیا کیا اسباب تھے۔ یہودی لوگ وحدانیت کے کٹر ماننے والے تھے جو مناسب طور پر انبیاء اور موسوی شریعت پر فخر کرتے تھے۔ یسوع کے وقت میں وہ ملکی طور پر آزاد نہ تھے۔ کیونکہ یہودیہ میں رومی حاکم تھے اور ہیرودیس انتپاس وغیرہ جو بادشاہی کرتے تھے روم کی اجازت سے کرتے تھے اور قیصر روم کے ماتحت حاکم تھے۔ یہ بات ان کو نہایت ناگوار تھی اور ان میں جو مختلف ملکی اور مذہبی فرقے تھے بعض روم کے بہت خلاف تھے۔ ان میں ایک فرقہ تھا جو "باغی" کہا جا سکتا ہے۔ اس فرقے کے لوگ بغاوت کرنا چاہتے تھے اور کبھی کبھی ڈاکہ بھی مارتے تھے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ بارہ شاگردوں میں سے ایک یعنی شمعون زیلوتیس باغی فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ مذہبی فرقوں میں سے فریسی بھی جو شریعت اور بزرگوں کی روایتوں پر بہت زور دیتے تھے، اور بہت کچھ رسم پرست ہو گئے تھے یہ بھی رومیوں کے سخت خلاف تھے۔ برعکس اس کے صدوقی جن میں سے بڑے بڑے کاہن مقرر ہوئے تھے یہ چاہتے تھے کہ کوئی شخص رومیوں کو ناراض نہ کرے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے عہدوں سے برخاست کئے جائیں۔ زیادہ تر یہ دنیادار اور دولت مند تھے، ان کے ساتھ ہیرودیوں

نے جو ملکی فرقہ اور رہبرِ دیس کے سنبھالنے والے تھے کئی بار پایا گیا۔

فریسی عموماً عام لوگوں کی نظر میں اچھے لوگ تھے۔ بہت جلد خداوند یسوع کے خلاف ہو گئے کیونکہ وہ اُن کی روایات اور رسم پرستی کے خلاف سکھاتا اور کام کرتا تھا (دیکھو۔ مرقس ۲۔۷، ۱۱۔۱۷ ؛ ۲۳ سے ۲۸ تک ، ۳۔۲، ۲۲، ۷، ۱ سے ۱۳ تک ؛ ۱۱۔۱۸۔ جہاں فقیہ سے فریسی مراد ہیں ، لوقا ۶۔۶ سے ۱۱ تک ۔ ۷۔۳۹ ، ۱۳۔۱۴ ، ۱۹۔۷) ۱۹۔۴۷ ، مرقس ۱۲۔۱۲ ، متی ۱۵۔۱ ، ۱۰ سے ۱۲ تک ، ۲۳ ، وغیرہ)

عام لوگ تو خداوند مسیح کی باتیں خوشی سے سنتے اور معجزوں سے دنگ ہوتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسیح ان کا بادشاہ بنے (یوحنا ۶۔۱۵) اور جب وہ آخری بار یروشلیم میں داخل ہوا تو یہ خیال کرنے لگے کہ اب وہ اپنی بادشاہی قائم کرکے رومیوں کو نکال دے گا۔ جب اُس کے دشمنوں نے جزیہ دینے کے بارہ میں سوال کیا تو فوراً یسوع کے جواب کو گرفت نہ کر سکنے پر لوگوں نے معلوم کیا کہ یہ آدمی فوج کشی نہ کرے گا۔ بلکہ اس نے اشارۃً بتایا کہ محصول قیصر کا حق ہے۔ چنانچہ جب یسوع گرفتار ہوا تو عوام نے کوئی کارروائی اختیار نہ کی بلکہ برابّا کو جس نے بغاوت کی تھی مسیح کے بدلے میں مانگا۔

صدوقی خاص کر کائفا سردار کاہن کو ڈر تھا کہ یسوع کے کاموں کے سبب سے بلوا ہو جائے گا۔ اور ہمارا نقصان ہوگا۔ (یوحنا ۱۱۔۴۸ وغیرہ)
فریسی تو اپنی غلط فہمی کی وجہ سے مسیح کے سخت خلاف ہو گئے تھے۔ اور اگرچہ مذہبی آدمی تھے تو بھی صدوقیوں کے ساتھ مل گئے۔ بارہ شاگردوں میں سے

ایک یہوداہ اسکریوتی بے ایمان ہوگیا شاید اس سبب سے کہ اُس نے معلوم کیا کہ مسیح رومیوں کے خلاف کچھ نہ کرے گا۔ شاید محض حسد سے (ہم بتا نہیں سکتے) اور اس نے یسوع کے دشمنوں کو اُسے گرفتار کرنے کا اچھا موقع بتایا۔ صدرِ عدالت کے قریب قریب تمام آدمی حسد اور خوف کے سبب سے یسوع کی موت پہ تلے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ بجز معجزہ بچنے کی اور کوئی صورت نہ تھی۔ پنطیس پیلاطُس، رومی حاکم، یسوع کو بچانا چاہتا تھا کیونکہ اُس نے معلوم کیا تھا کہ یہ کارروائی حسد اور دشمنی کے سبب سے کی گئی تھی مگر وہ لوگوں سے اور خاص کر بلوا ہونے سے ڈرتا تھا۔ آخرکار اُس نے یسوع کو مصلوب کرنے کا حکم دیا۔ بڑے لوگوں نے یسوع کو قتل نہ کرایا۔ وہ کسی بلوے میں یا کسی قاتل یا ڈاکو یا بازاری آدمیوں کے ہاتھ سے نہ مرا بلکہ اُس کے ملک اور دین کے بڑے بڑے شرفا اور دیندار لوگوں نے اس کو مروا ڈالا۔ اس لئے کہ وہ اس کی تعلیم کی سچائی نہ پہچان سکے۔ وہ حسد سے بھر گئے۔ وہ دین میں کوئی تبدیلی برداشت نہ کر سکتے تھے، اور وہ مسیح کے کام اور اُس کی ہر دلعزیزی کے نتیجہ سے ڈر گئے تھے۔

۲۔ اب بہتر ہے کہ ہم پُرانے عہدنامہ کی طرف متوجہ ہوں اور دیکھیں کہ قربانی کی رسم کس طرح سے ادا کی جاتی تھی۔ (دیکھو احبار ۴۔ ۹۔ ۱)۔ پہلے عابد بچھڑا لاتا تھا، اور اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھتا تھا کہ وہ اسی کی قربانی مانی جائے۔ اس کے بعد وہ اسے ذبح کرتا تھا۔ معبد کا کاہن خون میں سے کچھ لیکر قربان گاہ کے سینگوں پر اپنی انگلی سے لگا کر چڑھاتا تھا۔ اُس کے

بعد بھینٹ کے جسم کا ایک حصہ جلایا جاتا تھا اور کھال انتڑیاں اور فضلے باہر جلائے جاتے تھے۔ اکثر قربانیوں کا باقی گوشت کاہن لوگ کھاتے تھے۔ خطا کرنے والا بھینٹ کو ذبح کرتا تھا۔ چنانچہ یہ نہایت موزوں تھا کہ مسیح گنہگاروں کے ہاتھ سے مارا جائے۔ حالانکہ مارنے والوں کو علم نہ تھا جس کو انھوں نے قتل کیا وہ ان کے گناہوں کے لئے قربانی تھا۔

قربانی کے خون کے بارہ میں یوں مرقوم ہے "جسم کی جان خون میں ہے اور میں نے مذبح پر تمھاری جانوں کے کفّارہ کے لئے اُسے تم کو دیا ہے کہ اس سے تمھاری جانوں کے لئے کفّارہ ہو۔ کیونکہ جان رکھنے ہی کے سبب سے خون کفّارہ دیتا ہے۔" (احبار ۱۷-۱۱) پرانے عہد کے ماتحت کفّارہ انسان کا دیا ہوا نہ تھا بلکہ خدا کا، اور اس کا خاص منقصد یہ تھا کہ جان کے بدلے جان دی جائے۔

نیز پرانے عہد نامہ میں ذکر ہے کہ عہد کرتے وقت قربانی ہوتی تھی۔ دو عبارتوں سے (یعنی پیدائش ۱۵-۹ سے ۱۲ تک اور ۱۷ اور یرمیاہ ۳۴-۱۸ اور ۱۹) ظاہر کہ بعض اوقات قربانی کے جانور کے دو ٹکڑے کئے جاتے تھے اور عہد کرنے والے ٹکڑوں کے درمیان گذرتے تھے۔

پھر جب پُرانا عہد قائم ہوا تو قربانیاں چڑھائی گئیں۔ اور ان کے خون میں سے موسیٰ نے کچھ لے کر مذبح پر اور اُمّت کے لوگوں پر چھڑکا بعض یہودی مانتے تھے کہ موسیٰ نے عہد کے طومار پر بھی چھڑکا (عبرانیوں ۹-۱۴) حالانکہ خروج کے موجودہ نسخوں میں اس کا ذکر نہیں۔

یرمیاہ کے ۳۱ ویں باب میں اور عبرانیوں کے آٹھویں باب میں نئے عہد

کا وعدہ ہے۔ خداوند یسوع مسیح نے آخری عشا کے وقت پیالہ لیا اور کہا "یہ میرے خون میں نیا عہد ہے" (۱۔کرنتھیوں ۱۰-۱۵ ۔ دیکھو متی ۲۶-۲۸ ، مرقس ۱۴-۲۴ ، لوقا ۲۲-۲۰)

ایک اور عید تھی جس میں خاص قربانی ہوتی یعنی عید فسح۔ اُس وقت ایک برہ قربان کیا جاتا تھا۔ اس کا خون باہر کے دروازوں کے چوکھٹوں پر لگایا جاتا تھا اور سارا گھرانا کھاتا تھا۔ یا ایک سے زیادہ گھرانے مل کر (خروج ۱۲-۴) اس کو کھاتے تھے۔ نئے عہد نامہ میں اس کی طرف اشارہ ہے۔ مثلاً یوحنا بپتسمہ دینے والے نے کہا" دیکھو یہ خُدا کا برہ ہے" اور پولس لکھتا ہے" ہمارا بھی فسح یعنی مسیح قربان ہوا۔ (یوحنا ۱-۳۵ ، ۱۔کرنتھیوں ۵-۸)

۳۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے کہ خداوند یسوع مسیح کی موت کیا ہے ؟ ضرور ہے کہ ہم پاک کلام سے معلوم کریں کہ ہمارے خداوند نے خود اس کے بارہ میں کیا کیا فرمایا۔

مسیحی لوگ اکثر مبارک جمعہ کو یسعیاہ کے تریپنواں (۵۳) باب پڑھتے ہیں۔ اور اس کو یسوع کی موت اور اس کے دیئے ہوئے کفارہ کی پیشین گوئی سمجھتے ہیں۔ لیکن یہودی اُس باب کو اس معنی میں نہیں سمجھتے۔ اور نہ مسیح کے وقت میں سمجھتے تھے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح نے اس پیشین گوئی کو اپنے سے منسوب کیا۔ ایک بار ہمارے خداوند نے اُس کا اقتباس صاف طور پر کیا" یہ جو لکھا ہے کہ وہ بدکاروں میں گنا گیا۔ اس کا میرے حق میں پورا ہونا ضرور ہے۔ اس لئے کہ جو کچھ مجھ سے نسبت رکھتا ہے، وہ پورا ہوتا ہے (لوقا ۲۲-۳۷ ، یسعیاہ ۵۳-۱۲)۔ یسعیاہ کے اس

باب میں خداوند کے خادم کا ذکر ہے اور یسوع مسیح نے اپنے آپ کو خادم ٹھہرایا۔
"ابن آدم اس لئے نہیں آیا کہ خدمت لے بلکہ اس لئے کہ خدمت کرے اور اپنی جان بہتیروں کے فدیہ میں دے" (مرقس ۱۰-۴۵)، نیز اس میں یسعیاہ ۵۳-۱۰ کی طرف صاف اشارہ ہے۔"اس کی جان گناہ کی قربانی کے لئے گذرانی جائے گی"
یہی وجہ ہے کہ ہمارے خداوند نے بتادیا کہ "ضرور ہے کہ ابن آدم بہت دکھ اٹھائے ..... اور وہ قتل کیا جائے" پھر مسیح نے بتایا کہ وہ رد کیا جائے گا۔ مرقس ۸-۳۱ وغیرہ۔ یسعیاہ ۵۳-۳ میں لکھا ہے "وہ آدمیوں میں حقیر و مردود..... تھا"

جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے، ہمارے خداوند نے آخری عشا کے وقت ایسے الفاظ استعمال کئے جن سے ظاہر ہے کہ اس کے خیال میں اس کی آنے والی موت نیا عہد قائم کرنے کے لئے قربانی تھی۔

یسوع نے بار بار اپنے آپ کو ابن آدم کہا۔ یہ الفاظ دانی ایل میں خاص معنی میں ابن آدم کا پہلا ذکر ہے۔ حالانکہ مفسرین کی رائے یہ ہے کہ اس مقام میں ابن آدم سے قوم اسرائیل مراد ہے تو بھی یہودی اس سے مسیح سمجھتے تھے۔

حنوک کی تمثیل اندعزرا کی چوتھی کتاب میں جو یہودیوں کی دو غیرا لہامی مذہبی کتابیں ہیں، یہ محاورہ مسیح کیلئے استعمال ہوا ہے (۱) اپنے جلال کے متعلق رمتی۔ ۲۵-۳۱، مرقس ۱۴-۶۲ وغیرہ) (۲) اپنے اختیار کے متعلق رمتی۔ ۲۶-۲۴، مرقس ۹-۱۲ وغیرہ)۔ یسوع نے یہ محاورہ کیوں اختیار کیا۔ غالباً اس لئے کہ دنیا کے گناہوں کے لئے اسے اپنی جان دینا ضرور تھا۔ اور یہ محاورہ نہ صرف مسیح کا ایک خطاب ہے بلکہ یہ بھی دکھاتا ہے کہ وہ بنی آدم کا نمائندہ ہے۔ یسوع نے یہ ظاہر کیا کہ وہ "خدا

کا خادم" اُس معنی میں تھا جو یسعیاہ ۵۲، ۵۳ میں پائے جاتے ہیں۔

ہمارے خداوند نے کئی بار بتایا کہ میری موت اور اذیت ضروری اور انبیا کی پیشین گوئیوں کے موافق اور باپ کی مرضی کے مطابق ہے کسی نے لکھا ہے کہ یسوع نے اپنے آپ کو مسیح جانا اور اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اُسے مرنا ضرور تھا۔ یہ نہیں کہ اگرچہ اسے دکھ اٹھانا ہے تو بھی مسیح ہے بلکہ چونکہ اُسے دکھ اٹھانا ہے۔ اسی لئے وہ مسیح ہے۔" باغ گتسمنی میں اُس نے خدا کی مرضی پوری ہونے پر زور دیا۔ (مرقس ۱۴-۳۶)

عیاں ہے کہ مسیح خود اپنی موت کو بنی آدم کے گناہوں کا فدیہ سمجھتا تھا۔ اس نے اپنی موت کو نئے عہد کا وسیلہ قرار دیا جو خدا کے علم سابق اور مرضی کے مطابق تھا۔

۴۔ نئے عہد نامہ کی تعلیم یہ ہے کہ اپنی قربانی میں مسیح کاہن بھی تھا۔ اور بھینٹ بھی۔ عبرانیوں کا خط اس بات پر زور دیتا ہے (۱۰ سے ۱۰-۲۵ تک) نیز یوحنا کی انجیل کا دسواں باب۔ حالانکہ کاہن کا ذکر نہیں کرتا بہرحال اس بات پر زور دیتا ہے کہ یسوع نیک چوپان کی حیثیت سے اپنی مرضی سے اپنی بھیڑوں کے لئے اپنی جان دے گا اور پھر لے لیگا۔ (آیات ۱۱-۱۴ سے ۱۸ تک)

قربانی ایک قسم کی عبادت ہے۔ لہذا عابدوں کا اُس میں شریک ہونا ضرور ہے۔ جو مسیح پر ایمان لاتے ہیں وہ اپنے ایمان سے بپتسمہ اور پاک شراکت کے ذریعہ سے اور اپنی زندگی مسیح کی خدمت میں صرف کرنے سے مسیح کی قربانی میں شریک ہوتے ہیں۔

۵۔ کیا مسیح کی موت میں سزا بھی ہے؟ کیا اُس نے ہمارے لئے سزا

اُٹھائی ۔ اس کا جواب دینا آسان نہیں ۔ سزا صرف جرم کرنے والے کو دینا انصاف ہے ۔
وہ دوسرے کو کیونکر دی جائے ؟ ہاں ، بے شک اگر کچہری میں مجھ پر جرمانہ لگایا جائے
تو دوسرا آدمی اٹھا سکتا ہے لیکن گناہ کی سزا کی حقیقت یہ ہے کہ گناہ کرنے والا گنہگار
بنتا ہے اور اس کا دل سخت اور گناہ آلودہ ہو جاتا ہے ۔ ہم اس بات کا یقین ہرگز نہیں
کر سکتے کہ یسوع مسیح پر اس معنی میں سزا پڑی ۔

بہرکیف یاد رکھیں کہ گناہ کی سزا قانونی نہیں ، اخلاقی ہے ۔ خدا نے ایسا
انتظام کیا کہ گناہ کا نتیجہ تکلیف اور مصیبت پیدا ہو ۔ اور اس سے بُرائی بڑھتی
جائے ۔ جیسا کہ اس کا انتظام ہے کہ نیکی سے انسان کو فائدہ پہنچتا ہے اور اچھی باتیں
پھیلتی جاتی ہیں ۔ ایسی دنیا نہیں ہو سکتی جس میں نیک آدمی دوسروں کو فائدہ پہنچا
سکیں پر بُرے آدمی دوسروں کو نقصان نہ پہنچا سکیں ۔ بے قصور اور معصوم لوگ
گناہ کے سبب سے تکلیف اُٹھاتے ہیں ۔ بیمار پڑ جاتے ہیں ، ظلم سہتے ہیں ،
قتل کئے جاتے رنجیدہ ہوتے اور اذیت برداشت کرتے ہیں ۔ خداوند یسوع مسیح اس
دنیا میں داخل ہوا اور اُس نے اگرچہ بے گناہ تھا گنہگاروں سے اذیت اُٹھائی بلکہ
بے عزتی کے ساتھ موت کا تلخ مزہ چکھا ۔

ہم یہ خیال نہیں کر سکتے کہ باپ بیٹے سے ناراض ہو ۔ کیونکہ وہ ازل سے ابد تک
بیٹے سے خوش اور خوشنود ہے ۔ تو بھی گناہ پر ایک سزا کا فتویٰ ہے ۔ گناہ کی ایک سزا ہے
اور یسوع پورے طور پر اس کے دائرہ کے اندر اپنی اور باپ کی مرضی سے داخل ہوا ۔
اس نے نہ صرف یہ تسلیم کیا کہ بنی آدم گنہگار ہیں ، اور ابنِ آدم اُن کے گناہوں کے
سبب سے اذیت اور موت سہتا ہے ، بلکہ یہ بھی کہ گناہ پر خدا کا فتویٰ ہے ۔ گناہ

سے خداکو جو نفرت ہے وہ واجبی، پاک اور انصاف کے مطابق ہے۔

ہم یہ محض عقلی طور پر مان سکتے ہیں۔ کیونکہ جب ہمارے گناہ کا ذکر ہوتا ہے تو ہمیشہ معذرت اور حیلہ بازی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اور اپنی بدی کو اچھی طرح پہچان نہیں سکتے۔ لازم تو تھا کہ ہم حیلۃً توبہ کرتے پر ہم اس میں قاصر رہتے ہیں۔ اگرچہ ہم لفظ توبہ کو بے گناہ مسیح کے حق میں استعمال نہیں کر سکتے تو بھی اس نے صلیب پر وہ کام کیا جو ہماری توبہ کے بدلے ہے اور درحقیقت صلیب ہی سے انسان میں سچی توبہ پیدا ہوتی ہے۔

۶۔ یاد ہوگا کہ یوحنا کی انجیل میں ذکر ہے کہ یسوع کے پہلو سے جب نیزہ سے چھید اگیا تو "خون اور پانی" دونوں نکلے۔ اس سے بعضوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یسوع کا دل پھٹ گیا۔ اور خون دو حصوں میں تقسیم ہوا۔ لال حصہ کسی قدر ٹھوس اور بے رنگ حصہ (انگریزی میں (serum and clot)

اس میں شک نہیں کہ یسوع نے صلیب کی نہ صرف شرم اور اذیت محسوس کی بلکہ گناہ۔ دنیا بھر کے تمام زمانوں کے گناہ کا بوجھ بھی۔ وہ بے گناہ اور بے قصور تھا، اور اس وقت اس کا کوئی مددگار نظر نہ آیا۔

صلیب پر ہمارے خداوند نے زبور ۲۲ کی پہلی آیت "ایلی۔ ایلی۔ لما سبقتنی" سے اپنی اس روحانی جانکنی کا اظہار کیا، جو جہان کے گناہوں کے سبب سے وہ سہہ رہا تھا۔ خداوند کو مزید یاد رہا ہوگا کہ ۲۲ واں زبور شکر گذاری اور شادیانے سے ختم ہوتا ہے۔ تو بھی اس نے آیت مذکورہ بالا پڑھ کر گناہ کی بدبختی کا پردہ فاش کیا۔ وہ ستایا گیا اور رد کیا گیا۔ اس خاص موقع پر جب اس کی زبان

مبارک سے وہ ہولناک کلمات نکلے وہ انسان کا نمائندہ کے طور پر کل بنی آدم کے گناہوں کا بوجھ اٹھا رہا تھا جیسا پطرس رسول لکھتا ہے " وہ آپ ہمارے گناہوں کو اپنے بدن پر لئے ہوئے صلیب پر چڑھ گیا " (۱۔ پطرس ۲۔ ۲۴) یہ بھی یاد رہے کہ حالانکہ خداوند نے کہا " تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا " تو بھی یہ بھی کہا۔ " اے میرے خدا "

فصل سوم

معافی۔ راستباز ٹھہرایا جانا میل ملاپ پاکیزگی

یہ الفاظ جو فصل کے سرنامہ میں لکھے ہوئے ہیں، کفّارہ کی تعلیم یعنی مسئلہ نجات کی تشریح میں استعمال ہوتے ہیں۔ اکثر کسی مضمون کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے ہم اُسے تقطیع کرتے ہیں۔ لیکن ممکن ہے کہ درحقیقت اصلی چیز جس کا مضمون پیش کیا جاتا ہے واحد ہے مرکبّ نہیں۔ اور یہ سچ ہے کہ مذکورہٗ بالا الفاظ نئے عہد نامہ میں کفّارہ کے متعلق استعمال ہوئے ہیں لیکن یہ خیال کرنا کہ کسی ایماندار کے تجربہ میں یہ سلسلہ وار واقعے ہوتے ہیں غلط ہے۔ بے شک عموماً خدا سے میل ملاپ حاصل کرنے اور پاک بننے میں ترقی ہوتی ہے لیکن یہ فیصلہ کرنا کہ پہلے معافی ہوتی ہے یا راستباز ٹھہرنا یا میل ملاپ آتا ہے ممکن نہیں۔ بہرحال ان چار مضامین کو بہ لحاظ تشریح کے الگ الگ لکھنا پڑے گا۔ مگر ہر ایک کا دائرہ اوروں کے دائروں سے پورے طور پر الگ نہیں۔

۱۔ معافی ۔ ایک معنی میں لفظ معافی مسیحی اصطلاحات میں لفظ کفّارہ سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے ۔

معافی ایسی چیز ہے کہ یک طرفہ نہ ہو سکے ۔ یہ تو ضرور سچ ہے کہ جب کوئی آدمی دوسرے سے نقصان اُٹھاتا یا دو شخصوں میں جھگڑا ہوتا ہے، تو ایک اپنے دل سے سارا غصّہ نکال کر انتقام لینے کا خیال بالکل چھوڑ دے پر جب تک دوسرا اس کی معافی قبول نہیں کرتا وہ معافی پوری نہیں ہو سکتی ۔ گال پھیرنے کے بارہ میں مسیح کے قول (متی ۔ ۵ ۔ ۳۹) کا یہ مطلب ہے کہ دونوں شخصوں میں دوبارہ ایسا میل ملاپ ہو جائے، کہ اگر نقصان کرنے والا پھر وہی بُرا برتاؤ کرنا چاہے تو اُسے ایسا کرنے کا پورا موقع ہوگا ۔ چنانچہ یہ کہنا درست ہوگا کہ مسیح کی موت کا خدا اور انسان دونوں سے رشتہ ہے مگر یہ کہنا درست نہ ہوگا، کہ مسیح کی موت سے خدا میں کچھ تبدیلی واقع ہو گئی ہے ۔ یہ یاد رہے کہ کفّارہ خدا ہی کا کام ہے ۔ وہ اس کام سے انسان میں تبدیلی پیدا کرنا چاہتا ہے کیونکہ وہ انسان سے محبّت رکھتا ہے ۔ اس محبّت میں کبھی تبدیلی واقع نہیں ہوگی ۔ خدا کی محبّت ازلی و ابدی اور لازوال ہے ۔

مسیح کی موت میں دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں ۔

(۱) گناہ کی خرابی ۔ جب کلام مجسّم ہو کر دُنیا میں آیا تو قوم کے بزرگوں اور ہادیوں نے اس کو قتل کرایا ۔

(۲) گناہ کا نتیجہ ۔ بے گناہ خداوند کو اس عظیم گناہ کا بوجھ اُٹھانا پڑا ۔ مگر اُس نے یہ بوجھ اپنے اختیار اور رضامندی سے اُٹھایا (متی ۔ ۱۶ ۔ ۲۱ ، مرقس ۱۰ ۔ ۴۵ ، لوقا ۔ ۱۲ ۔ ۵۰ ، یوحنا ۔ ۱۰ ۔ ۱۷ ۔ اور ۱۸) ۔ وہ اور باپ ایک

ہیں۔ اس نے جہان کے گناہوں کا بار انسان کا نمائندہ ہو کر اٹھایا۔ خداوند کی صلیبی موت پر اس کی قیامت گویا ایک مہر ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ اس کی موت انسان کے لئے ایک پوری، کامل قربانی اور نذر ہے۔ لہٰذا اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ کامل شخص نے کامل کام کیا: جب یسوع نے سرکا پیا تو کہا "تمام ہوا۔" (یوحنا۔ ۱۹۔۳۰)

یوحنا کے پہلے خط میں گناہوں کی معافی کی اچھی تصریح پائی جاتی ہے۔ "اُس کے بیٹے یسوع مسیح کا خون ہم کو تمام گناہوں سے پاک کرتا ہے" (۱۔۷) پھر یہ بھی آیا ہے۔ "اس نے ہم سے محبت کی اور ہمارے گناہوں کے کفّارہ کے لئے اپنے بیٹے کو بھیجا (۴۔۱۰) یوحنا کی انجیل کی ایک مشہور آیت یہ ہے "خدا نے دنیا سے ایسی محبت رکھی کہ اس نے اپنا اکلوتا بیٹا بخش دیا، تاکہ جو کوئی اُس پر ایمان لائے ہلاک نہ ہو بلکہ ہمیشہ کی زندگی پائے"۔ (۳۔۱۶)۔ ان آیتوں کی تعلیم تمام نئے عہد نامہ کی تعلیم کے مطابق ہے۔ یعنی یہ کہ کفّارہ اور معافی خدا کی محبّت اور مسیح کی موت پر منحصر ہے۔ نیز مسیح کی موت انسان کے گناہوں کے لئے معاوضہ تھی۔ معاوضہ سے یہ مراد نہیں کہ جو سزا ہم کو بھگتنا چاہیئے ہوبہو وہی سزا خداوند یسوع پر پڑی بلکہ یہ کہ اس نے صلیب کی اذیّت اس لئے اٹھائی کہ ہم کو گناہوں کے نتیجوں سے آزاد کر دے "یہ میرا وہ عہد کا خون ہے جو بہتیروں کے لئے بہایا جاتا ہے۔" (مرقس ۱۴۔۲۲) "جو روٹی میں جہان کی زندگی کے لئے دوں گا وہ میرا گوشت ہے (یوحنا۔ ۶۔۵۱) "ابنِ آدم اس لئے ... آیا کہ ... اپنی جان بہتیروں کے بدلے فدیہ میں دے۔" (مرقس۔ ۱۰۔۴۵)

پس معافی کے معنی سزا سے بچنا نہیں بلکہ یہ کہ خدا انسان کے گناہوں کو حساب میں نہیں لاتا۔ بعض اصحاب مسیحی مسئلہ مغفرت پر اعتراض کرتے ہیں۔ مثلاً مسلمان کہتے ہیں کہ مسیح نے سب کچھ معاف کر دیا۔ پس گناہ کرتے رہو کیونکہ وہ تو پہلے ہی معاف ہو گئے۔ بعض ہندو کہتے ہیں کہ معافی ناممکن ہے۔ کیونکہ اگر معافی ممکن ہو تو انصاف جاتا رہتا ہے۔ لیکن مسیحی مسئلہ یہ نہیں ہے۔ گناہوں کی معافی یہ ہے کہ گنہگار گناہ سے آزاد کیا جائے۔ بے شک یہ سچ ہے کہ خدا نے کفارہ بخشا لیکن نہ محض اس غرض سے کہ ہم سزا سے چھوٹیں بلکہ اس لئے کہ ہم کو نئی پاک زندگی ملے اور ہم گناہ کے بندھنوں سے آزاد کئے جائیں۔ اور ہماری کمزوری جس کے سبب سے ہم برائی سے پرہیز نہیں کر سکتے اور نیکی کرنے میں بے بس رہتے ہیں، زور سے بدل جائے۔

جب خدا ہم کو معاف کرتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم فوراً راستباز ہو جاتے ہیں۔ بلکہ یہ کہ وہ ہم کو راستباز ٹھہراتا ہے۔ تاکہ ہم اس پر ایمان لا کر راستبازی اور نیکی میں ترقی کرتے جائیں۔ (اس کی مزید تفصیل آگے ملے گی)

بعض لوگوں کو چند آیات کے سمجھنے میں مشکل ہوتی ہے (مثلاً رومیوں ۲: ۱۴ سے ۱۶ تک) یہ سوال کیا جاتا ہے کہ اگر بعض لوگ جو شریعت اور مسیح سے ناواقف ہیں، اور اس شریعت پر چلنے کے سبب سے جو اُن کے دلوں میں لکھی ہے مقبول ہو گئے تو مسیح کی موت کا ایسے لوگوں سے کیا تعلق ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے۔ داؤد جو مسیح کی موت سے صدیوں قبل تھا کیونکر مقبول ہوا؟ (۲ سموئیل ۱۲-۱۳) ایسے سوال کرنے والے یہ غلطی کرتے ہیں کہ خدا اور اس کے کام کو

زمان ومکان کی قید میں سے آتے ہیں۔ خداوند یسوع مسیح کی قربانی اگرچہ زمانہ میں ظاہر ہوئی لیکن اس کی اصلیت ازلی ہے۔ یسوع وہ برّہ ہے "جو بنائے عالم سے ذبح ہوا تھا" (مکاشفہ ۱۳۔۸) خدا کا کامل ظہور خداوند یسوع مسیح کی تاریخی زندگی میں خاص وقت اور خاص جگہ ہوا لیکن خدا تو ازل سے ہے۔ اُس کی ازلی محبّت اور نیک ارادہ اور اُس کے فیض وکرم سے کوئی محروم نہیں۔ مسیح کی موت حالانکہ داؤد کے بعد تاریخ میں واقع ہوئی مگر تو بھی چونکہ اس کی حقیقت ازلی ہے داؤد کے لئے بھی کارگر ہوئی۔

پھر ایک ضروری بات یہ ہے۔ جیسا مارٹن لوتھر نے (Martin Luther) کہا۔

مفت معافی کی منادی خطرناک ہے کیونکہ بعض سُننے والے خیال کرتے ہیں کہ "سب ٹھیک ہے۔ ہمیں فکر کرنا ضروری نہیں۔ خدا ہم کو مسیح کی خاطر معاف ہی کرے گا۔" اور بعض یہ سمجھکر گناہ کرتے ہیں کہ آیندہ ایمان لاکر معافی مانگ لیں گے۔ یہ کریہہ گناہ ہے (رومیوں ۶۔۱۔۱ اور ۲، ۳۔۸، ۲ پطرس ۳۔۱۶) خداوند کی صلیب یہ سکھاتی ہے کہ گناہ ایسی سنگین بُرائی ہے کہ انسان کو اس سے بچانے کے لئے خدا کے بیٹے نے یہ بے عزّتی گوارا کی۔ جب تک صاف طور پر ظاہر نہ کیا جائے کہ معافی دینے کی خاطر خدا کے بیٹے کو اذیت۔ شرم۔ بے عزّتی اور موت سہنا پڑی۔ گناہوں کی منادی کرنا بڑی غلطی اور خطرناک چیز ہے۔ معافی کے اگر محض یہ منفی معنی ہوتے کہ خدا نے انسان کو سزا سے بَری کیا۔ اور یہ مثبت حقیقت شامل نہ ہوتی کہ وہ راستبازی کے لئے نئی زندگی بخشتا ہے

تو بجائے گناہوں کو مٹانے کے خدا گناہ کو اور زیادہ آسان اور وافر بنا دیتا لیکن یہ اُس کی ذات پاک سے بعید ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انسان کی روح اور اس کے دل کے باہر کسی خاص کام کا کیا جانا ضروری نہیں۔ اور صلیب صرف یہ سکھاتی ہے، کہ خدا گنہگار سے محبت رکھتا ہے اور اسے معاف کرنے کے لئے تیار ہے۔ (اصطلاحاً اس کو باطنی کفارہ کہتے ہیں) یہ تو سچ ہے کہ نیا عہدنامہ (خاص کر پولس اور یوحنا کے مکتوبات) سکھاتا ہے کہ مسیح کی موت سے محبت ظاہر ہے (۱۔یوحنا ۴۔۱۰، گلتیون ۲۔۲۰) لیکن بائبل میں اس بات پر کہ خدا نے صلیب سے اپنی محبت دکھائی زور کم دیا گیا۔ اور اس پر بہت زور دیا گیا کہ صلیب سے خدا نے ہماری نجات کے لئے ایک بڑا کام کیا۔ خدا کی محبت ازلی ہے اور ایک معنی میں کفارہ بھی ازلی ہے پر اس کا تواریخ میں واقع ہونا ضروری امر تھا۔ مسیح نے بنی آدم کا نمائندہ ہو کر ان کی نجات خریدی اور بنی آدم کے بدلے (مرقس ۱۰۔۴۵) اپنی جان دی۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ نئے عہدنامہ کی کیا گواہی ہے تو ہم کو اقرار کرنا پڑتا ہے۔ کہ صلیب پر مسیح کا قول "پورا ہوا" بے مطلب نہ تھا۔ اُس وقت اس نے ہماری پیدائش کے سینکڑوں برس پہلے بے ہم سے پوچھے انسان سے صلاح و مشورہ کئے بغیر کفارہ دیا۔ چاہے ہم قبول کریں یا نہ کریں۔ بہرحال مسیح کا یہ کام "پورا ہوا۔" (اس نظریہ کو اصطلاحاً خارجی کفارہ کہتے ہیں)

۲۔ یونانی میں ایک لفظ ہے۔ دِکے اَئون۔ انگریزی حروف میں (dikaioun) جس کا مطلب ہے کسی کو راستباز ٹھہرانا۔ یہ

لفظ نجات کے متعلق نئے عہد نامہ میں بار بار آتا ہے۔ ہمارے خداوند نے اُسے فریسی اور محصول لینے والے کی تمثیل میں استعمال کیا یا یوں کہیں کہ جس علامی لفظ کو یسوع نے استعمال کیا یہ لفظ اس کے ترجمہ میں آیا۔ اُس نے کہا کہ محصول لینے والا فریسی کی نسبت "راستباز ٹھہر کر اپنے گھر گیا"۔ (لوقا ۱۸۔۱۴) ان دو آدمیوں میں سے کوئی بے گناہ نہ تھا۔ فریسی تو مغرور تھا۔ اور محصول لینے والے نے خود اپنے آپ کو گنہگار ٹھہرایا لیکن خدا نے اس کو راستباز ٹھہرایا۔ یہ محاورہ کچہری اور اس کی کاروائی سے تعلق رکھتا ہے مقدمہ میں جو شخص راستباز ٹھہرایا جاتا تھا وہ الزام سے بری بنایا جاتا تھا۔ نئے عہد نامہ میں یہ تمثیلی طور پر استعمال ہوتا ہے۔ آدمی گویا خدا کی کچہری میں حاضر ہے اور خدا جو جج ہے اس کو راستباز ٹھہراتا ہے۔ وہ ہے تو گنہگار پر خُدا اس کو راستباز اس لئے ٹھہراتا ہے کہ وہ خداوند یسوع مسیح پر ایمان رکھتا ہے۔

شاید کوئی کہے کہ یہ ایک قسم کا بہانہ ہے۔ خدا کیونکر گنہگار کو راستباز ٹھہرا سکتا ہے جس حال کہ وہ ناراست ہے۔ بہر حال معافی ہمیشہ ایسی ہی ہوتی ہے۔ ہم انسان بھی جب کسی کو معاف کرتے ہیں تو فیصلہ کرتے ہیں کہ ہم قصوروار کے ساتھ وہ برتاؤ کریں گے کہ گویا وہ بے قصور ہے۔ پولس رسول نے لکھا کہ مسیح نے "ہمارے سب قصور معاف کئے۔ اور حکموں کی وہ دستاویز مٹا ڈالی جو ہمارے نام پر اور ہمارے خلاف تھی۔ اور اس کو صلیب پر کیلوں سے جڑ کر سامنے سے ہٹا دیا۔" (کلسیوں ۲۔۱۳۔۱۴) وہ کتابہ جو صلیب پر لگایا گیا "یسوع ناصری یہودیوں کا بادشاہ" گویا بدل کر شریعت کے احکام اور ضابطے بن گیا جن کو

ہم نے توڑ دیا ہے اور وہ مسیح کے ساتھ مصلوب ہوئے۔ خدا نے یسوع کی صلیبی موت کو قبول کر کے ہماری معافی کی بنیاد ٹھہرائی اور کیوں نہیں؟ کیونکہ کفارہ اسی کا دیا ہوا ہے۔

کتنے مسیحیوں نے یہ تجربہ کیا کہ جب وہ ایمان لائے تو اُن کا یہ تجربہ ہوا کہ خدا نے مجھے معاف کر دیا۔ اور اس کا چہرہ جو غصہ ور معلوم ہوتا ہے، اب نورانی ہو گیا۔ شاعروں نے اکثر اس کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً

"مسیح نے لیا میرا بار، یسوع کی ستائش ہو۔
اب بچا موت سے میں بدکار، یسوع کی ستائش ہو"

"خدا نے قہر نہ فرما کے
رحم سے مجھ کو کیا معاف۔"

"میرے داغ قرمزی جتنے تھے۔
تیرے خونِ پاک سے دُھل گئے۔"

پھر پولس بتاتا ہے کہ راستباز ٹھہرائے جانے کے بعد اور بھی بہتر تجربہ ہے "جن کو راستباز ٹھہرایا ان کو جلال بھی بخشا" (رومیوں ۸۔۳۰)

۳ ۔ راستباز ٹھہرائے جانے کے ساتھ ہم خدا سے میل ملاپ حاصل کرتے ہیں۔ مسیح کے کام کے بارہ میں وہی رسول فرماتا ہے "خدا نے مسیح میں ہو کر اپنے ساتھ دنیا کا میل ملاپ کر لیا" (۲۔کرنتھیوں۔ ۵۔ ۱۹) اور اس سے پہلی آیت میں پولس بتاتا ہے کہ یہ سب خدا کی طرف سے ہے۔ انسان خود اپنی کوشش سے، تکلیف اٹھانے سے، اپنی زندگی کی اصلاح کرنے سے، خدا

کے ساتھ اپنا میل ملاپ نہیں کرسکتا یہ خدا کا کام ہے جو اس نے مسیح میں کیا ہے۔ انسان اپنی بگڑی ہوئی ذات کے سبب سے "مسیح سے جدا...... اور وعدہ کے عہدوں سے ناواقف اور نا اُمید اور خُدا سے جُدا" ہے۔ (افسیوں ۲-۱۲)

جب خدا سے ہمارا میل ملاپ ہوجاتا ہے تو انسان سے بھی ہوجاتا ہے۔ پولس نے افسیوں کے خط میں یہودیوں اور غیر یہودیوں کا جن میں سخت مخالفت تھی ذکر کرکے بتایا کہ مسیح نے "دونوں کو ایک کرلیا۔" اور "دونوں سے اپنے آپ میں ایک نیا انسان پیدا کیا۔" (افسیوں ۲-۱۴-۱۵)۔ دیکھو رومیوں ۵-۱۰-۱۱-

لفظ قربانی ایسے لفظ سے بنا جس کا مطلب نزدیک ہونا ہے۔ جب ہم مسیح کی قربانی میں ایمان اور بپتسمہ سے اپنی راستی پر بھروسا رکھنا چھوڑ کر مسیح پر تکیہ کرنے سے، مسیح کے نقشِ قدم پر چلنے سے، اور پاک شراکت میں شریک ہونے سے، شامل ہوتے ہیں تو اس کے نزدیک آتے۔ بلکہ اس کو پہن لیتے ہیں اور خدا سے ہمارا میل ملاپ پختہ ہوتا جاتا ہے (رومیوں ۶-۴، کلسیوں ۲-۱۲، گلتیوں ۳-۲۷، ۱-کرنتھیوں ۱۰-۱۶، ۱۱-۲۶، یوحنا ۳-۵، ۶-۵۳ سے ۵۷ تک، ۱۵-۱ سے ۷ تک)

۴- خدا سے میل ملاپ حاصل کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اس کی نزدیکی میں رہتے ہیں۔ خدا کی نزدیکی، قربتِ الٰہی۔ ہر ایک کو جو اس میں رہتا ہے، تبدیل کرتی رہتی ہے اور یہ محض تاثیر نہیں بلکہ خدا کا خاص شخصی کام ہے (دیکھو فصل ۵) اس کو ہم پاکیزگی، پاک بننا۔ تقدیس کہتے ہیں۔

لفظ قدس یعنی پاک، پوتر کے یہ اصلی معنی معبود کے لئے مخصوص ہونا ہے۔ چنانچہ بُت پرستوں کے دھرموں میں اس کا تعلق بہت کم نیکی اور راستی سے ہے۔ بلکہ پُرانی یہودیت میں اور نئی زمانہ اسلام میں اس کا تعلق زیادہ طہارت سے ہے۔ پوتر بھوجن لے کا صاف ہونا ستھرا ہونا ضروری نہیں۔ لیکن اس میں گوشت مچھلی پیاز، انڈوں کا نہ پکایا جانا لازمی ہے۔ عبرانی میں جو لفظ فاحشہ کے لئے استعمال تھا، اُس کے اصلی معنی پاک عورت کے ہیں کیونکہ اس زمانہ میں بُت خانوں میں فاحشہ عورتیں رہتی تھیں جو بُت کی بیویاں کہی جاتی تھیں اور جن کے ساتھ عابد حرامکاری کرتے تھے (بعض ہند مندروں میں بھی یہ بات پائی جاتی تھی۔ لہذا وہ پاک کہی جاتی تھیں) چونکہ یہ عورتیں دیوتاؤں کے لئے مخصوص تھیں۔ جب معبود خراب ہے تو جو کچھ اس کے لئے مخصوص ہے، وہ بھی خراب ہوگا۔

لیکن مسیحی اصطلاح میں پاک کا مطلب قریب راستکار۔ نیکوکار۔ نیک چلن کے برابر ہے کیونکہ ہم مسیحی خدا کو بالکل راست مانتے ہیں "خدا نور ہے اور اس میں ذرا بھی تاریکی نہیں۔" (۱۔یوحنا۔۱۔۵)

اگرچہ جس وقت خدا ہم کو معاف کرتا۔ راستباز ٹھہراتا اور اپنے ساتھ ہمارا میل ملاپ کرتا ہے، ہم محض تائب اور ایمان لائے والے گنہگار ہیں تو بھی وہ ہم کو اُس حالت میں نہیں چھوڑتا۔ وہ ہمارے گناہوں کو معاف کرنے اور ہمیں ساری ناراستی سے پاک کرنے میں سچا اور عادل ہے۔ (۱۔یوحنا۔۱۔۹) نیز پولس رسول لکھتا ہے کہ "مسیح یسوع...... ہمارے لئے خدا کی طرف سے حکمت ٹھہرا یعنی راستبازی اور پاکیزگی اور مخلصی۔" (۱۔کرنتھیوں۔۱۔۳۰) اس سے یہ مراد ہے کہ خداوند یسوع کا

ہم میں یہ باتیں پیدا کرتا ہے۔ وہی رسول ہم کو یاد دلاتا ہے کہ مسیح کی زندگی ہم کو بچاتی ہے۔ اور اس کی موت خدا کے ساتھ ہمارا میل ہو جانے کی بنیاد ہے۔ (رومیوں ۵۔۱۰۔۱۱) اور پھر کے ساتھ اس بدعت کو دور کرتا ہے کہ مسیحی گناہ میں زندگی بسر کرسکتا ہے۔ اور اس تعلیم سے سارا نیا عہد نامہ اتفاق کرتا ہے (رومیوں (رومیوں ۶۔۱ سے ۶ تک، ۱۔یوحنا۔۲۔۶۔۳۔۳ سے ۸ تک وغیرہ)

پاکیزگی ایک معنی میں اُس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب خدا سے ہمارا میل ملاپ ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ پوری پاکیزگی نہیں بلکہ ہر روز اس میں ترقی ہونا امر ضروری ہے۔ ہم کو ہر روز از سر نو خدا پر ایمان لانا اور نئی پیدائش حاصل کرنا ہے ورنہ ہماری قدسیت جاتی رہے گی۔ "بدی کا بھید" ہمارے اندر ہے پر ہم رفتہ رفتہ مسیحی تجربہ کرنے سے، اس کی اصلیت پہچانتے ہیں۔ توبہ تو مسیحی زندگی کے شروع ہی سے موجود رہتی ہے ورنہ وہ زندگی شروع بھی نہ ہوسکتی لیکن یاد رکھیں کہ جب ہم خدا کی نسبت ادنیٰ خیال رکھتے ہیں تو ہماری توبہ گہری نہیں ہوسکتی۔ اور جب ہم گناہ کی حقیقت نہ پہچان کر اس کو ہلکی چیز سمجھتے ہیں تو ہماری توبہ بھی ہلکی رہتی ہے۔ پر خدا کی پہچان اور گناہ کی حقیقت کا علم تبدریج ملتا ہے۔ تقدیس اور توبہ کی ترقی ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔

اس کی تشبیہ یوں دی جاتی ہے کہ ہم مسیح کے ساتھ مرتے ہیں۔ یعنی گناہ کے اعتبار سے مردہ ہو جاتے ہیں اور مسیح کے اعتبار سے زندہ ہوتے ہیں (رومیوں ۶) یا دوبارہ پیدا ہونا (یوحنا۔۳۔۳ سے ۱۲ تک)

ایمان لا کر ہم مسیح کے ساتھ یگانگی اور وابستگی حاصل کرتے ہیں۔ یہاں تک

کہ ہم میں مسیح کی خصلت اور طبیعت بلکہ اُس کی موت اور زندگی پیدا ہو جاتی ہے (گلتیوں ۲-۱۹-۲۰) ہم نئے مخلوق ہوتے ہیں (۲-کرنتھیوں ۵-۱۷) (گلتیوں ۶-۱۵)
غرض خدا گنہگار کو اس کی گنہگاری میں معاف کرتا۔ راستباز ٹھہراتا اور اپنے ساتھ اس کا میل ملاپ کرتا ہے۔ تاکہ وہ اس گنہگار کو پاک اور راستباز بنائے۔

فصل چہارم

رُوح القدس اور کفّارہ

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ خدا انسان کو معاف کرتا ہے کہ اگرچہ معاف ہوتے وقت وہ ناراست ہے اور معافی کا مستحق نہیں تو بھی خدا اس کو پاک کرتا ہے۔

۱۔ نئی پیدائش جس سے گنہگار کا دل تبدیل ہوتا ہے، اور وہ روحانی زندگی حاصل کرتا ہے۔ یہ تعلیم انجیل اور رسولوں کے خطوط میں پائی جاتی کہ نئی پیدائش بخشنا روح القدس کا کام ہے "جب تک کوئی آدمی پانی اور روح سے پیدا نہ ہو وہ خدا کی بادشاہی میں داخل نہیں ہو سکتا" (یوحنا ۳-۵)۔ اسی انجیل کے بیسویں باب میں بتایا گیا ہے کہ جب یسوع اپنے جی اٹھنے کے بعد شاگردوں سے ملا اور ان پر ظاہر ہوا تو اس نے "ان پر پھونکا اور ان سے کہا روح القدس لو" (۲۲ویں آیت) پیدائش کی کتاب میں مرقوم ہے کہ خدا نے "انسان... کے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا" (۲-۷) اس عمل سے رسولوں کو نئی پیدائش ملی۔ ان کے دل بدل گئے۔ ان کی مسیحی زندگی شروع ہو گئی یہ روح

کی معموری کا ملنا نہ تھا۔ کیونکہ پینتیکست کے دن روح القدس کی معموری اور طاقت شاگردوں کو ملی۔

۲۔ ایمان سے تائب گنہگار روح القدس پاتا ہے اور روح کی حضوری خدا باپ اور خدا بیٹے کی حضوری بھی ہے۔ عملی طور پر روح القدس خدا ہے جو ثانیر کی طرح نہیں بلکہ شخصی طور پر ایماندار کے دل اور زندگی میں کام کرتا ہے۔ وہ زندگی کا روح ہے (رومیوں ۸-۲) جو ہم میں روحانی زندگی پیدا کرتا۔ قائم رکھتا اور بڑھاتا رہتا ہے۔

خداوند یسوع مسیح سوا اُنیس سو برس پہلے فلسطین میں قربان ہوا نیز اُس نے اپنا یہ کفارہ کا کام ہمارے اندر نہیں کیا۔ بلکہ ہمارے لحاظ سے خارجی طور پر کیا۔ اس کام سے ہم کو فائدہ کس طرح پہنچ سکتا ہے؟ یہ روح القدس کا کام ہے۔ وہی ہم میں وہ مزاج پیدا کرتا ہے "جو مسیح یسوع کا بھی تھا" اسی کے ذریعہ ہم میں گناہ اور نیکی کی پہچان اور سچی توبہ پیدا ہوتی ہے۔ (دیکھو یوحنا۔ ۱۶۔ ۸ سے ۱۰ تک)

اگلے باب میں مسئلہ ثالوث کی بابت اور کچھ لکھا جائے گا۔ یہاں یہ لکھنا کافی ہے کہ عملی طور پر خدا باپ۔ خدا بیٹا جو خداوند یسوع میں مجسم ہوا۔ اور خدا روح القدس شخصی طور پر کام کرتے ہیں لیکن تین خدا نہیں بلکہ ایک۔ خدا ایسا نقطہ ہے جس کی جمع نہیں ہو سکتی۔ دیوی دیوتا بہت ہوں تو ہوں پر خدا ایک ہے "سن اے اسرائیل، خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے۔" (مرقس۔ ۱۲۔ ۲۹ + استثنا۔ ۶۔ ۴) چنانچہ حالانکہ یہ کہنا کہ خدا باپ مجسم ہوا غلط ہے۔ تو بھی ہم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ کفارہ کا کام تینوں اقانیم سے متعلق ہے۔ خدا باپ کی محبت خداوند یسوع

مسیح کی پُرفضل زندگی۔موت۔قیامت اور صعود سے ظاہر ہوئی۔بلکہ روح القدس کے نزول سے بھی۔وہی روح القدس انسان کے دل میں خدا کا کام کرتا ہے۔

۳۔ ایک خیال بعض اوقات لوگوں کو ورغلاتا ہے یعنی یہ کہ خداوند یسوع مسیح نے خدا باپ کے غصہ کو ٹھنڈا کیا۔(نقل کفر کفر نباشد) اور گویا باپ اور بیٹے میں اختلاف ہے! یہ خیال بالکل غلط ہے۔بیٹا ہر وقت باپ کا مورد لطف ہے۔وہ بنائے عالم کے وقت سے ذبح ہوا یعنی جو کام کوہِ کلوری پر کیا گیا، اس کا ارادہ ازل سے ہے بلکہ اس لئے کہ خدا زمانہ کے قیود سے بری اور باہر ہے یوں کہنا چاہیئے کہ خود انکاری اور قربان ہونے کا خاصہ ذاتِ الٰہی میں ہے۔

۴۔ انسان کا ایمان کیا کرتا ہے۔کفارہ میں اور معافی حاصل کرنے میں ایمان کا کیا حصہ ہے۔آرچ بشپ ولیم ٹمپل صاحب مرحوم نے ایک بار لکھا کہ "سب کچھ خدا کی طرف سے ہے۔میری نجات میں میرا حصہ صرف یہ ہے کہ میں نے وہ گناہ کیا جس سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں (Nature, Man and God, p. 401) جان ڈیلی نے بھی اپنے لوگوں کی یہی ہدایت کی کہ وہ اپنے ایمان پر بھروسا نہ رکھیں۔وہ بتاتے ہیں کہ اپنے ایمان پر بھروسا رکھنا ایک حقیقی خطرہ ہے۔بعض واعظ ایمان کی ایسی تعریف کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان میں خاص قوت ہے۔لیکن اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کا بچانے والا اس کا ایمان ہے۔یعنی وہ اپنے ایمان سے اپنے آپ کو نجات دلا سکتا ہے۔یہ خیال غلط ہے۔اس میں خود بینی پائی جاتی ہے۔خود بینی گناہ کا خاصہ ہے۔

جب آدمی بجلی کا بٹن دباتا ہے تو اس کے کمرہ میں روشنی آجاتی یا پنکھا چلنے لگتا

ہے۔ مگر روشنی کا آنا اور پنکھے کا چلنا بغیر کسی بجلی بنانے والے انجن کے ممکن نہیں، بٹن میں ذرا بھی زور نہیں وہ محض بتی یا پنکھے کو بجلی گھر سے ملاتا ہے۔ مسیح نے تو کئی بار فرمایا کہ "تیرے ایمان نے تجھے بچایا۔" لیکن اس وقت اندیشہ نہ تھا کہ کوڑھی یا اندھا یا مفلوج یہ سمجھے کہ میری قوت نے مجھے بچالیا۔

ہم گناہ کے بندھنوں اور برائی سے "ایمان کے سبب سے" "ایمان کے وسیلہ سے" نجات پاتے ہیں (رومیوں۔۵-۲، گلتیوں ۔۳-۲۲، افسیوں-۲-۸) ہم کو اختیار ہے کہ اگر چاہیں تو خدا داد نجات قبول کرنے سے انکار کریں۔ یعنی خدا کی دعوت کو رد کریں (متی ۔۲۲-۱- سے ۱۴ تک) لوقا۔ ۱۴-۱۶- سے ۲۴ تک)

۵ ۔ یہ سوال کہ آیا ہم اعمال یا ایمان سے نجات پاتے ہیں بہت کچھ لفظی سوال ہے۔ اگر ہم نجات کے معنی دوزخ سے بچنے کے سمجھیں تو جواب یہ ہے "نیک اعمال سے" لیکن پھر یہ سوال لازم آتا ہے کہ گنہگار اپنے گناہ اور لاچاری سے بچ کر کیوں کر نیکوکار بنے۔ جس کا جواب یہ ہے "خدا کے فضل سے جو ایمان کے وسیلے سے ہم میں کام کرنے پاتا ہے" ہاں ۔ بے شک جو لوگ یہ تعلیم نہیں مانتے کہ ہم کو لازم ہے کہ کبھی بدی نہ کریں اور کبھی نیکی کرنے میں نہ چوکیں، وہ مان سکتے ہیں کہ ہمارے نیک کام ہمارے بُرے کاموں کا کفارہ ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ خیال بائبل کی تعلیم سے بعید ہے۔

نیک کام کرنے کا ارادہ اور اس ارادہ کو پورا کرنے کی طاقت دونوں خدا کی بخششیں ہیں جو وہ روح القدس کے ذریعہ ہم میں پیدا کرتا ہے۔ وہ تو محض ایک وسیلہ ہے" جو تم میں

نیّت اور عمل دونوں کو اپنے نیک ارادہ کو انجام دینے کے لئے پیدا کرتا ہے۔ وہ خدا ہے۔" (فلپیوں ۲-۱۲،۱۳) مسیح میں قائم رہنے، معافی اور نجات حاصل کرنے اور پاک ہونے کی پہچان نیک کام ہیں۔ نیک اعمال نجات کا سبب نہیں بلکہ نتیجہ ہیں۔ (دیکھو۔ یوحنا۔ ۱۵۔ ۱۔ سے ۹ تک، گلتیوں ۵۔ ۲۲)

۶۔ چاہیئے کہ معاف کیا ہوا شخص اپنی معافی کو پہچانے اور یہ روح القدس کی مدد سے ہوسکتا ہے (رومیوں ۸۔ ۱۲۔ سے ۱۷۔ تک) یہ تو ممکن ہے کہ بعض اوقات ہم میں خدا کی فرزندی کا احساس دھیما ہو۔ جس وقت ہمارا احساس کمزور ہوتا ہے۔ اُس وقت ہم ایمان سے اس بات پر قائم رہتے ہیں کہ ہم خدا کے یہاں مقبول ہیں۔ چاہے ہم کسی خاص وقت پہچانیں یا نہ پہچانیں یہ ہر حالت میں سچ ہے کہ خداوند لیسوع مسیح نے صلیب پر اپنے آپ کو ایک ہی بار نذر چڑھا کر کل جہان کے گناہوں کے لئے ایک پوری کامل اور کافی نذر اور معاوضہ دیا"

۷۔ بعض لوگ مُسرف بیٹے کی تمثیل پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ خداوند لیسوعؑ نے معافی کی بابت تین تمثیلیں اسی موقع پر (جہاں تک معلوم ہوتا ہے) کہیں۔ لوقا کے پندرھویں باب کی دو پہلی تمثیلیں خدا کے کام پر زور دیتی ہیں۔ کیونکہ کھویا ہوا سکہ اور کھوئی ہوئی بھیڑ اپنے بچاؤ کے لئے کچھ کرنے کے قابل نہیں۔ مُسرف بیٹے کی تمثیل میں انسان کے جواب اور آسمانی باپ کی محبّت پر زور دیا گیا ہے۔ لیکن ضروری ہے کہ تینوں تمثیلوں کو مدِ نظر رکھنا چاہیئے۔ ورنہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنی توبہ سے اپنی نجات خود کما لیتا ہے۔ یہ خیال غلط ہے کیونکہ توبہ روح القدس کا کام ہے۔

فصل پنجم
برگزیدگی

۱۔ اس بات میں شبہ نہیں کہ ذیل کی تعلیم بائبل میں ملتی ہے:۔
اوّل ۔خدا نے انسان کو کسی قدر خود مختاری بخشی ہے ورنہ انسان کو حکم دینا اور اس کو توبہ کرنے اور ایمان لانے کے لئے بلانا بے معنی ہوتا۔
دوم ۔خدا نے ایمانداروں کو برگزیدہ کیا ہے ۔
سوم ۔ خدا پیش علمی رکھتا ہے ۔

نیز اس میں بھی شک نہ ہونا چاہیئے کہ نئے عہدنامہ میں ہر کہیں سکھایا نہیں جاتا کہ خدا نے بعض شخصوں کو ابدی ہلاکت کے لئے مقرر کیا ہے۔ البتہ بعض علمائے فلسفہ بذریعہ فلسفہ اس نتیجہ کو پہنچے ہیں۔ لیکن ہم نہیں کہہ سکتے کہ بائبل میں اس مسئلہ کی سند پائی جاتی ہے ۔

۲۔ ممکن نہیں کہ محدود انسان جو زمانہ کا کیڑا ہے یہ سمجھ سکے کہ خدا نے انسان کو قوتِ ارادہ کیونکر بخشی جس حال کہ وہ اپنے علم پیشین سے سب کچھ جانتا ہے ۔ مگر ذیل کے خیالات شاید فائدہ سے خالی نہ ہوں ۔

خدا کا علم پیشین محض عقل کا کام نہیں جیسا آدمی عقل دوڑانے سے آئندہ کا حال بار بار سچّے طور پر بتاتے ہیں ۔ اُستاد کا یہ کہنا کہ فلاں طالب علم ضرور امتحان میں فیل ہو جائے گا، اس علم کی مثال نہیں۔ علم پیشین صرف خدا میں ہے خدا خالق ہے اور زمانہ مخلوق ۔ فرض کیجئے کہ ایسی ہستیاں ہوں جن میں صرف

لمبائی اور چوڑائی ہو، پر موٹائی نہ ہو۔ اگر وہ عقل بھی رکھیں تو بھی وہ ابعاد ثلاثہ کو کبھی نہ سمجھہ سکیں گے۔ اسی طور پر ہم جو زمانہ کے اندر مقید ہیں ابدیت نہیں سمجھہ سکتے ہیں۔

خدا اس دنیا میں کام کرتا ہے لیکن وہ اپنا کام اس ماہیت یا حقیقت کے موافق کرتا ہے جو اُس نے دنیا کو عنایت کی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ جب اس نے صاف طور پر اپنے پاک کلام میں دکھایا ہے کہ انسان نیکی و بدی میں امتیاز کر کے اُن میں سے ایک کو اختیار کر سکتا ہے، تو اس کی پیش علمی اور جو کچھ اس نے ٹھہرایا ہے وہ سب کچھ انسان کی آزادی، خود مختاری اور قوتِ ارادہ کی حقیقت کے موافق ہے (انسان کی یہ صفتیں محدود ہیں) اگر سچ مچ خدا نے ہم کو خود مختاری بخشنے سے اپنی قدرت اور پیش علمی کو کسی قدر محدود کیا ہے تو یہ اس کی مرضی کے موافق ہے۔

نیا عہد نامہ صاف بتاتا ہے کہ خدا نے تمام بنی آدم کے گناہوں کی معافی کا انتظام کیا ہے" اس نے دنیا سے محبّت رکھی" (یوحنا۔۳۔۱۶) اُس نے سب کو گنہگار ٹھہرایا" تاکہ سب پر رحم فرمائے" (رومیوں ۱۱۔۳۲) وہ سب کو توبہ کرنے کا حکم دیتا ہے (اعمال ۱۷۔۳۱)" وہ چاہتا ہے کہ سب آدمی نجات پائیں اور سچّائی کی پہچان تک پہنچیں" (۱تمیتھیس ۲۔۴) نیز ہمارے خداوند نے کہا کہ جو کوئی بوجھ سے دبا ہو اور اس کے پاس آئے وہ اس کو قبول کرے گا۔ (متی ۱۱۔۲۸) اور کسی کو رد نہ کرے گا۔ (یوحنا ۶۔ ۳۷) اور یوحنا کی انجیل میں یہ بھی مرقوم ہے" جو کوئی اس پر ایمان لائے

ہلاک نہ ہو بلکہ ابدی زندگی پائے ۔" (یوحنا ۳-۱۶) مذکورہ بالا آیات کافی ہیں۔ لیکن اور بہت سی آیات اس مضمون کی چُنی جا سکتی ہیں۔

۳۔ پھر اس میں شک نہیں کہ نیا عہد نامہ برگزیدگی کی تعلیم دیتا ہے۔
اول خاص کاموں اور عہدوں کے لئے برگزیدگی۔ رومیوں کے خط کے آٹھویں باب میں اسی قسم کی برگزیدگی کا ذکر ہے۔ خدا نے اسرائیلی قوم کو اپنی رحمت سے چُنا کہ وہ دونوں عہدوں کا وسیلہ بنے۔ اس کے باپ دادا میں سے بعض کو اسی غرض سے چُنا۔ اس باب میں اسمٰعیل اور عیسو، اضحاق اور یعقوب کی شخصی نجات کی طرف کوئی اشارہ نہیں۔ اسرائیلی قوم ایمان نہ لانے کے سبب سے بہ حیثیت قوم کے نامقبول ٹھہری۔ پولس اپنی برگزیدگی کا ذکر کرتا ہے۔ اپنے اکثر خطوط کے شروع ہی میں اپنی رسالت کو خدا کی مرضی سے منسوب کرتا ہے۔ بلکہ ایک موقع پر لکھتا ہے "خدا نے مجھے میری ماں کے پیٹ ہی سے مخصوص کیا"

دوم:۔ انفرادی شخصی برگزیدگی کا ذکر ہے۔ یہ برگزیدگی خدا کی بلاہٹ سے تعلق رکھتی ہے "کوئی میرے پاس آ نہیں سکتا جب تک باپ........ اُسے کھینچ نہ لائے۔" (یوحنا ۶-۴۴۔) خدا کھینچتا ہے پر انسان آتا ہے خدا سب کو بُلاتا اور رغبت دلاتا ہے پر سب نہیں سنتے جو نہیں سنتے وہ کھنچے نہیں۔ یسوع نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ "تم نے مجھے نہیں چُنا بلکہ میں نے تمھیں چُن لیا اور تم کو مقرر کیا۔" (یوحنا ۱۵-۱۶) پر تمہیں یاد ہے کہ یسوع نے ان کو بلایا اور وہ اس کے پیچھے ہو لینے پر راضی ہوئے۔ (مرقس ۱-۱۶، متی ۹-۹، یوحنا ۱-۳۹) پولس کرنتھیوں سے کہتا ہے "اپنے بلانے

جلال پر نگاہ کرو" (۱۔کرنتھیوں ۔۱۔۲۶) وہ اُس اُمید کا ذکر کرتا ہے جس کی بنیاد بلاہٹ ہے (افسیوں ۔۱۔۱۸) عبرانیوں کے خط میں بلاہٹ میں شریک ہونے کا ذکر ہے۔خداوند مسیح میں سب کو بلاتا ہے۔

ایماندار کی برگزیدگی کی بابت بتایا گیا ہے کہ وہ ازل سے ہے۔خداوند یسوع مسیح نے خدا کے برگزیدوں کا ذکر کیا (متی ۔۲۴۔۲۲۔۲۱ اور ۳۱ ، لوقا ۔۱۸۔۷۔ وغیرہ) تھسلنیکیوں کے نام کے پہلے خط کے پہلے باب میں ظاہر کیا جاتا ہے کہ تھسلنیکی کی برگزیدگی اس وقت وقوع میں آئی جب دینِ حق اُن تک پہنچا (آیات ۴ اور ۵) پطرس بتاتا ہے کہ برگزیدگی خدا کے پیش علمی کے مطابق ہوئی (۱۔پطرس ۔۱۔۲) کلسیوں کے خط میں پولس ناظرین کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ اپنی برگزیدگی کے موافق چال چلیں۔(۳۔۱۲)

برگزیدہ کون ہیں؟ وہ جو خدا کی دعوت سن کر قبول کرتے اور ایمان رکھتے ہیں خدا نے اپنی پیش علمی سے ان کو شروع ہی سے چنا ہے۔اس کی پیش علمی یہ نہیں کہ سب کچھ ٹھہرایا گیا ہے۔بلکہ جو وقوع میں آتا ہے جیسا آدمی ارادہ سے اور غفلت سے کرتے ہیں، خدا کی پیش علمی اسی کے مطابق ہے۔

۴۔بعض کا قول ہے کہ اگر ہم مرضیٔ الٰہی پر ایمان رکھتے ہیں تو یہ ماننا پڑے گا۔ کہ خدا نے سب کچھ ٹھہرایا ہے۔ممکن ہے کہ از روئے فلسفہ (اگر ہم پاک کلام کی تعلیم کو نظر انداز کریں تو) ایسا معلوم ہوگا۔لیکن خدا نے صاف طور پر ظاہر کر دیا ہے۔کہ اس امر کے متعلق اس کا ارادہ کیا ہے۔وہ چاہتا ہے کہ انسان آزادی حاصل کرے۔ ایک فلسفی عمانوائیل کانٹ لکھتا ہے "فلاں کام کرنا مجھ پر فرض ہے۔لہٰذا

میں وہ کام کرسکتا ہوں۔" مگر درحقیقت انسان کا تجربہ وہ ہے جو پولس نے رومیوں کے ساتویں باب میں لکھا۔" مجھے کرنا چاہیئے مگر میں نہیں کرسکتا۔" اور خداوند یسوع نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا" جو کوئی گناہ کرتا ہے گناہ کا غلام ہے۔" اور یہ بھی " اگر بیٹا تم کو آزاد کرے گا تو تم واقعی آزاد ہوگے۔" (یوحنا۔ ۸۔ ۳۴ اور ۳۶، نیز دیکھو رومیوں ۷۔ ۲۴ اور ۲۵، ۸۔ ۲ وغیرہ) خدا کی مرضی ظاہر ہوئی کہ وہ سب کو بلاتا، اور سب کو نجات بخشنا چاہتا ہے لیکن بہتیرے اس نجات کو قبول نہیں کرتے اور اس سے محروم رہتے ہیں۔

۵۔ کیا آخر" تمام بنی آدم نجات پائیں گے۔ نئے عہد نامہ کی تعلیم قریب قریب ہر کتاب میں یہ ہے کہ بہت سے لوگ ایمان نہ لائیں گے اور نجات نہیں پائیں گے۔ بعض نے گمان کیا ہے کہ دوسرے جہان میں بہت تکلیف سہنے اور یوں تربیت پانے کے بعد آخر کار سب ایمان لائیں گے۔ یہ فیصلہ کرنا کہ ایسی بات ناممکن ہے مشکل ہے۔ اس کی طرف بائیبل میں اشارہ بھی نہیں۔ یہ ہم مان تو سکتے ہیں کہ جب تک آدمی توبہ کرسکے گا اور ایمان لا سکے گا۔ اس کا بچنا ممکن رہے گا۔ جو کچھ خدا کی رحمت کے بارے میں کلام الٰہی میں مرقوم ہے۔ اس خیال کی کافی بنیاد ہے۔ نیز ہم خدا پر بھروسا رکھتے ہیں کہ کوئی بے انصافی نہ ہوگی۔ ہر ایک روح کو موقع دیا جائے گا۔ لیکن یہ محض خیال ہیں۔ نئے عہدنامہ کی یہ تعلیم نہیں مسیح کو قبول نہ کرنا جب قبول کرنے کا کافی موقع ملتا ہے اپنے آپ کو اس کے مصلوب کرنے والوں کے ساتھ شامل کرنا ہے۔ جیسا عبرانیوں کے خط میں مندرج ہے:" اتنی بڑی نجات سے غافل رہ کر ہم کیونکر بچ سکتے ہیں"؟ (عبرانیوں ۲۔ ۳)

باب پنجم

پاک ثالوث

فصل اول

دیباچہ

لفظ ثالوث لفظ تثلیث سے اس لئے زیادہ موزوں ہے۔ کہ تثلیث سے تقسیم مراد ہو سکتی ہے کہ گویا اس مسئلہ کے ماننے والے ذات الٰہی کو تقسیم کرتے ہیں۔ مسئلہ ثالوث کی تکمیل رفتہ رفتہ ہوئی۔ یہ الفاظ ثالوث اور تثلیث نئے عہدنامہ میں نہیں ملتے اور بعض اوقات یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ایسے الفاظ کو استعمال کرنا جو پاک کلام میں نہیں ہیں غیر مناسب ہے۔ پر جب ایسی حقیقتیں معلوم ہو جاتی ہیں، جن کا تعلق زندگی اور خیال سے وسیع ہو، تو وہ شروع ہی میں پورے طور پہ سمجھی نہیں جاتیں۔ رسولوں اور قدیم کلیسیا کے دیگر شرکا نے معلوم کیا کہ یسوع ناصری سچ مچ مسیح موعود ہے۔ وہ خدا کے ساتھ ایک ہے۔ اُس کے وسیلہ سے گناہوں سے

نجات، روحانی اطمینان اور طاقت حاصل ہوتی ہے۔ وہ خدا کو اس طرح سے ظاہر کرتا ہے کہ اس کو الہی ہستی ماننا پڑتا ہے۔ نیز اس پر ایمان لانے سے ایماندار کو پاک روح کی بخشش حاصل ہوتی۔ اور پاک روح شخصی طور پر ایماندار میں سکونت کرتا وہ اس کی ہدایت کرتا۔ اسے پاک کرتا۔ اور اس کو یسوع کی تعلیم اور کام کو سمجھنے کی توفیق بخشتا ہے۔

حالانکہ یہ ایک نیا تجربہ تھا جو یسوع ناصری کی دنیوی زندگی سے شروع ہوتا ہے۔ تاہم اس میں بڑی ترقی واقع ہوتی ہے۔ مسیح کے جی اُٹھنے اور آسمان پر صعود فرمانے کے بعد مسیحیوں کے ایمان میں ترقی و پختگی پیدا ہوجاتی ہے۔ یہاں تک کہ لفظ خداوند (یونانی (Kurios)) جو خدا تعالیٰ کے لئے مستعمل ہے، اس کی شان میں استعمال ہونے لگا۔ لہذا مسئلہ ثالوث خدا کی وحدانیت پر مبنی ہے یا بالفاظ دیگر مسئلہ ثالوث وحدانیت ماننے کا ایک طریقہ ہے۔ تمام مسیحیوں کا ہمیشہ یہی عقیدہ رہا ہے۔

پھر یہ تجربہ کی بات ہے کہ جب کلیسیا کہیں ثالوث ماننے میں کمزور ہوجاتی ہے تو اس کی روحانی طاقت کم ہوجاتی ہے۔ بلکہ معدوم ہوجاتی ہے۔ کلیسیائے روم، انگلکانی کلیسیا، میتھوڈسٹ کلیسیا وغیرہ وغیرہ کی بشارتی خدمت تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن کیا کسی نے یونیٹیرین (Unitarian) کلیسیا کی مشن بھی دیکھی ہے؟ نہیں!

یونٹیرین کلیسیا ایک ایسی کلیسیا ہے جو ثالوث کی تعلیم چھوڑ کر وحدت محض کو مانتی ہے۔ اس مسئلہ پر ہی کلیسیا کی زندگی کا دارومدار ہے۔ لیکن یہ ضرور مشکل ہے۔

کہ ثالوث کو وحدانیت کے ساتھ مانیں اور جب مسیحی لوگ خاص کر علما اس پر غور کرتے ہیں، تو مشکلیں پیش ہوتی ہیں۔ تاریخ میں یہی ہوا۔ رفتہ رفتہ ایسے الفاظ چنے گئے، جن سے وحدانیت بھی ظاہر ہو۔ اور باپ، بیٹے، پاک روح تینوں کی شخصیت اور الوہیت بھی۔ بعض اوقات سنگین غلطیاں واقع ہوئیں طرح طرح کی تعلیمیں پیش ہوئیں جو درحقیقت مسیحی تجربہ، پاک کلام کی تعلیم اور مسئلہ نجات کے خلاف ہیں۔

۱۔ ایک شخص بنام سبیلیس (Sabellius) نے یہ سکھایا کہ خدا واحد ہے پر تین صورتوں میں کام کرتا ہے۔ یعنی باپ، بیٹا، پاک روح۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس نقطہء نگاہ سے تجسم الٰہی ناممکن ہے۔ خدا بہروپیا کی طرح اپنے آپ کو کبھی ایک صورت میں ظاہر کرتا ہے، جیسا بہروپیا کبھی بادشاہ بنتا ہے، کبھی فقیر۔ اس تعلیم میں خدا کی بے عزتی ہے۔ اور نجات کا کام اس کے رو سے محض دکھاوا ہے۔ پھر نیا عہدنامہ میں بیٹے اور روح دونوں کی شخصیت صاف ظاہر ہے

۲۔ کئی معلموں کی یہ تعلیم ہے کہ یسوع ناصری ایک کامل شخص تھا۔ جو اپنی فرماں برداری اور پاکیزگی کے سبب سے الٰہی بنایا گیا۔ مگر یہ تو محض شرک ہے اس تعلیم کا سبب سے مشہور اور سب سے کامیاب اُستاد ایرئس (Arius) تھا۔ اُس نے یہ سکھایا کہ بیٹا مخلوق ہے پر تمام مخلوقات سے اسکو الوہیت بخشی گئی۔ اتھنیسیئس (Athanasius) نے اس کا کامیابی سے سامنا کیا۔ مگر بہت تکلیف اٹھانے کے بعد کیونکہ بعض اوقات قیصر روم ایرئس کے پیروؤں کی حمایت کرتا تھا۔ اگر ایرئس کی تعلیم صحیح ہے یعنی یہ کہ یسوع مسیح بیک وقت حقیقی خدا

اور حقیقی انسان نہیں تو ظاہر ہے کہ ہماری نجات ناممکن ہے۔ اگر مسیح خدا نہیں تو وہ ہمیں کیونکر نجات دے سکتا ہے۔ اور بقول پولس "ہم اب تک اپنے گناہوں میں گرفتار ہیں"۔ اس بدعت میں حقیقت کے ایک پہلو (انسانیت) پر اس قدر زور دیا گیا، کہ دوسرا پہلو (الوہیت) مفقود ہو گیا۔

۳۔ بعض نے خداوند کی الوہیت پر اس قدر زور دیا کہ اس کی انسانیت کو کھو دیا۔ مثلاً ایک صاحب کی یہ تعلیم تھی کہ قلب لیسوع میں بجائے انسانی روح کے الٰہی روح تھی۔ یہ بدعت اپولی نیریزم (Apollinarianism) کہلاتی ہے۔ مگر اس صورت میں مسیح حقیقی انسان نہیں بلکہ ایک عجیب شے تھا۔

بعض کہتے تھے کہ مسیح میں قوتِ ارادہ الٰہی تھی انسانی نہیں۔ یہ بدعت (Monothelitism) (یعنی "ایک مرضی") کہلاتی ہے بعض نے کہا کہ مسیح میں ذات (*phusis*) ایک تھی اور وہ الٰہی تھی۔ (Monophysitism) یہ تینوں شکلیں خداوند کے حقیقی انسان ہونے کو ضرر پہنچاتی ہیں۔ لہٰذا کلیسیا نے ان کو یک لخت رد کر دیا۔

بہت بحث کے بعد بالآخر ایک عقائد نامہ منظور ہوا جو آج کل نکایہ (Nicaea) کا عقیدہ کہلاتا ہے جس میں تمام ضروری باتوں پر زور دیا گیا۔ میں ایمان رکھتا ہوں...... ایک خداوند لیسوع مسیح پر جو خدا کا اکلوتا بیٹا ہے۔ کل عالموں سے پیشتر اپنے باپ سے مولود۔ خدا سے خدا۔ نور سے نور۔ حقیقی خدا سے حقیقی خدا۔ مصنوع نہیں بلکہ مولود۔ اس کا اور باپ کا ایک ہی جوہر ہے...... وہ ہم آدمیوں کے لئے اور ہماری نجات کے واسطے آسمان

پر سے اُٹھایا اور روح القدس کی قدرت سے کنواری مریم سے مجسّم ہوا...... اور ہمارے
لئے مصلوب بھی ہوا .... اور روح القدس پر جو خداوند اور زندگی بخشنے والا ہے"۱۴

بعض اصحاب معترض ہیں کہ اس عقیدے کی تمام باتیں بعید از عقل ہیں۔ راسخ
الاعتقاد کلیسیا خوب جانتی ہے کہ الہٰی مسائل کے سمجھنے میں عقل انسانی قاصر ہے لیکن
کسی بات کا عقل سے برتر ہونا ایک بات ہے اور عقل کے خلاف ہونا دوسری بات
ہے۔ معترض اصحاب غلطی بھی کرتے ہیں کہ وہ "برتر از عقل" اور "خلاف عقل" میں تمیز
نہیں کرتے۔ ایک عالم اب تک زندہ ہیں، جنہوں نے ابعاد ثلاثہ اور زمانہ کے بارے
میں ایسی نئی تعلیم دی ہے، جسے اب ریاضی اور علم ہیئت کے علماء تسلیم کرتے ہیں کیونکہ
سائنس کے تجربہ سے ان کی سچائی ثابت ہوتی ہے۔

اس کو انگریزی میں (Relativity) رشتیت کہتے ہیں۔

اس مضمون پر متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن معمولی آدمی کے سامنے وقت یہ درپیش
ہے۔ کہ جو کتابیں سمجھ میں آتی ہیں وہ انشٹائن صاحب کے اصلی مسئلہ کے سمجھانے
میں ناکامیاب ہوتی ہیں۔ اور جو مسئلہ کو صحیح طور پر بیان کرتی ہیں وہ سمجھ میں نہیں آتیں!

ہم نے جانا تھا کہ اس علم سے کچھ سیکھیں گے
جب یہ جانا تو یہ جانا کہ نہ جانا کچھ بھی !

خدا کی ذات کا پورے طور پر سمجھنا ممکن نہیں۔ اور جو دینی عقائد آسانی سے
سمجھ میں آتے ہیں وہ عقائد ہونے کے قابل نہیں۔ کیونکہ ان میں کوتاہی پائی جاتی ہے۔
جو کچھ ہم کو ذات الہٰی کے بارے میں معلوم ہے وہ خدا کے الہام اور مکاشفہ سے
ہے۔ خدا نے اُسے مسیح کی زندگی اور کام سے، بائبل سے اور انسان کے روحانی

تجربہ سے ظاہر کیا ہے۔ بہر حال ہماری عقل کی کمی کے سبب سے وہ کبھی پورے طور پر ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا۔ لیکن ہم اس کو پہچان سکتے ہیں۔ ہم عقل سے خدا کے بھیدوں کو نہیں پاسکتے۔ لیکن جب خدا مکاشفہ بخشتا ہے تو ہم اُسے اپنی عقل سے پہچان سکتے ہیں۔

فصل دوم

اقنوم ثانی۔ بیٹا

۱۔ مسیحی دعاؤں اور حمد کے گیتوں سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ کلیسیا مسیح کو حقیقی الٰہی ہستی، نجات دہندہ اور خدا کا بیٹا مانتی ہے۔ مثلاً

"اے مسیح ذوجلال کا بادشاہ۔ تو باپ کا ازلی بیٹا ہے۔"

"تو ہی قدوس ہے۔ تو ہی خداوند ہے۔"

"الحمد الحمد مسیح۔ جہان کا شاہنشاہ۔"

"یسوع چوپان ہے۔ شفیعِ خاص۔

کاہن، نبی اور شاہ۔

تو راہ اور حق، تو ہے حیات۔

میں تیرا ہوں مدّاح۔"

"میرا بارِ عصیاں اُٹھاتا مسیحا۔

خطائیں میری سب مٹاتا مسیحا۔

"خداوند ہم پر رحم کر۔ مسیح ہم پر رحم کر۔"

۲۔ اس لفظ "بیٹا" پر غیر مسیحی صاحبان اعتراض کرتے ہیں۔ وہ بیٹے کو جسمانی معنوں میں لیتے ہیں۔ لیکن کوئی مسیحی یہ بتا دے گا کہ ہم "بیٹا" جسمانی معنوں میں نہیں سمجھتے بعض لوگ خدا کے بارے میں اس لفظ کا استعمال کرنا خدا کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ عبرانی لوگ اس لفظ کو بطور صفت کے استعمال کرتے تھے۔

مثلاً اکثر پرانے عہدنامہ میں خبیث آدمیوں کا ذکر ہے۔ عبرانی میں یہ بنی بلی عل کہلاتے ہیں یعنی ہلاکت یا خباثت کے بیٹے۔ نئے عہدنامہ میں یوسف لاوی جو کپرس کا باشندہ تھا، برنباس کہلاتا ہے۔ رسولوں نے اسے یہ لقب دیا جس کا مطلب ہے نصیحت (یا تسلی) کا بیٹا یعنی نصیحت کرنے والا۔ پرانے عہدنامہ میں اسرائیل بادشاہ کبھی کبھی خدا کا بیٹا کہلاتا تھا۔ مثلاً داؤد کے بارے میں ناتن نبی نے کہا "میں اس کا باپ ہوں گا۔ اور وہ میرا بیٹا ہوگا۔" (۲ سموئیل ۷: ۱۴) نیز فرشتے خدا کے بیٹے کہلاتے ہیں (ایوب ۱: ۶)

لفظ "بیٹا" کے اس استعمال سے یہ مطلب ہے کہ جس کے بارے میں وہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے وہ خدا کا منظور نظر یا اس کی طرف سے مقرر کیا ہوا معزز شخص ہے چنانچہ جب ہم مسیح کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ تو اول اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک الہٰی شخص اور خدا کا مقرر کیا ہوا بادشاہ اور نمائندہ ہے۔ لیکن یہ معانی محض اس محاورہ کا مصدر ہے نئے عہدنامہ کی تلاوت سے ظاہر ہے۔ کہ اس کے معنی اور زیادہ گہرے ہیں۔ عبرانیوں کے خط میں بیٹے کا جیسا اور فرشتوں سے مقابلہ کیا جاتا ہے اور یہ دکھایا جاتا ہے کہ بیٹا ان پر فوقیت رکھتا ہے۔ (باب ۱-۲-۳-۴ وغیرہ) اور تمام نئے عہدنامہ کی تعلیم اس سے متفق ہے۔ پس یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خدا اور بیٹا ایک ہیں؟ اور ایک ہی ماہیت رکھتے ہیں۔

۳- پولس ایک مقام پر لکھتا ہے "خدا ہی ہے جس نے فرمایا کہ تاریکی میں سے نور چمکے اور وہی ہمارے دلوں میں چمکا تاکہ خدا کے جلال کی پہچان کا نور یسوع مسیح کے چہرہ سے جلوہ گر ہو" (۲- کرنتھیوں -۴- ۶) یہی وجہ ہے (جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے) کہ یسوع کے شاگردوں نے وحدانیت کے کٹر ماننے والے ہوتے ہوئے اس کو الہٰی ہستی مانا اور اس کی ایسی تعظیم اور تمجید کی جو صرف خدا ہی کے شایانِ شان ہے۔

یوحنا اپنی انجیل کے دیباچہ میں بتاتا ہے کہ بیٹا (کلام) ازلی نور الہٰی ہے تخلیق اسی کے وسیلے سے ہوئی اور وہ مجسّم ہو کر انسان کے درمیان رہا۔ اور اس نے ان دیکھے خدا کو ظاہر کیا۔ (باب ۱-۱-۲-۳-۱۴-۱۸) پولس اس کو خدا کی حکومت کا شریک بتاتا ہے (رومیوں -۸- ۳۴) تخلیق کا وسیلہ (کلسیوں -۱- ۱۵-۱۶) خدا اور انسان کے بیچ بیں درمیانی (۱- تمتھیس -۲- ۵) ممکن ہے کہ یہ پرانے مسیحی گیت یا عقائد نامہ کا حصہ ہو) یعقوب مسیح کو ذوالجلال کہتا ہے اور یہ خدا تعالیٰ کا خطاب ہے۔ (یعقوب ۲- ۱) پطرس کا پہلا خط یا تو خود اسی کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا یا جیسا کہ بعض کی رائے ہے سلوانس نے اسے پطرس کے لئے لکھا۔ بہرحال اس خط میں کوئی ایسی آیت نہیں ملتی جس میں یسوع مسیح کی الوہیت خاص طور سکھائی گئی ہو۔ لیکن اس خط کا پڑھنے والا فوراً محسوس کرے گا کہ لکھنے والا اسے الہٰی ہستی تسلیم کرتا ہے۔

فلپیوں کے نام لکھا ہوا خط بطور الہیاتی رسالے کے نہیں لکھا گیا۔ تو بھی اس میں الہیاتی حقیقتوں کا صاف ذکر ہے۔ مثلاً ملاحظہ ہو باب ۲ آیات ۵ تا ۱۱۔ انہیں کو پڑھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ "فلپیوں" کو مسیح کے الہٰی ہستی ہونے کی تعلیم دی گئی تھی۔ پولس کی دلیل یہ ہے کہ جب یسوع مسیح نے جو کہ خدا تھا حلیمی اور خاکساری اختیار

کرنے سے گریز نہ کیا تو چاہیئے کہ مسیح کے پیرو ایک دوسرے کے ساتھ حلم اور بردباری سے پیش آئیں۔

یہوداہ بھی اپنے خط میں یسوع مسیح کو خداوند کہتا ہے۔ (حوالہ: آیات ۴ تا ۲۵)

۴۔ اب تک یہ بتایا گیا کہ مسیح کی ذات کی نسبت اس کے پیروؤں اور شاگردوں کا کیا خیال تھا۔

اب ہم دیکھیں گے کہ اس امر میں مسیح کا کیا دعویٰ تھا۔ ظاہر ہے کہ مسیح نے اپنی نسبت بڑے بڑے دعوے کئے۔ اسی سبب سے یہودیوں نے اس کو مصلوب بھی کیا۔ یوحنا کی انجیل میں تو اس کے الٰہی ہستی ہونے کا صریح بیان ہے۔ مگر دیگر اناجیل میں بھی اس کی الوہیت مسلم ہے۔ (دیکھو یوحنا۔ ۵: ۱۸۔ وغیرہ۔ مرقس ۔ ۱۴: ۶۱ اور ۶۲۔ متی ۔ ۱۶: ۱۳ سے ۲۰ تک۔)

مقدس اتھنیسیس (Athanasius) لکھتا ہے کہ "جس کلام کے وسیلے سے خلقت شروع ہوئی اسی نے اس کو بحال بھی کیا"۔ اس فقرہ میں مقدس یوحنا کی انجیل کی طرف اشارہ ہے۔ (یوحنا ۱: ۳) مسئلہ تثلیث پر غور کرنے وقت سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ کلام الٰہی کی گواہی کیا ہے

ماہرینِ الٰہیات مسئلہ خدا کو سب سے پہلے پیش کرتے ہیں اور اسے مسئلہ مسیح سے وابستہ کرتے ہیں۔ یہ اس غرض سے کہ اہل ایمان وحدتِ الٰہی اور الوہیتِ مسیح کو مضبوطی سے یکجا رکھیں۔ مسیحی ایمان کا مدار اسی پر ہے۔ اس کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے بھی مناسب سمجھا کہ مسئلہ ابنِ خدا کو سب سے پہلے پیش کریں۔

۵۔ خداوند یسوع مسیح کا یہ کلام مرقوم ہے "میرے باپ کی طرف سے سب

کچھ مجھے سونپا گیا اور کوئی بیٹے کو نہیں جانتا سوا باپ کے اور کوئی باپ کو نہیں جانتا سوا بیٹے کے اور اس کے جس پر بیٹا اُسے ظاہر کرنا چاہے۔" (متی ۱۱-۲۷) اسی انجیل میں درج ہے کہ ابن آدم یعنی مسیح خود دنیا کی عدالت کرے گا (متی ۲۵-۳۱ سے ۴۶ تک - دیکھو یوحنا ۵-۲۷) یوحنا کی انجیل کی بھی گواہی اس سے مختلف نہیں۔ "میں اور باپ ایک ہیں" (یوحنا ۱۰-۳۰) "جس نے مجھے دیکھا اس نے باپ کو دیکھا ..... میں باپ میں ہوں اور باپ مجھ میں ہے۔" (۱۴-۹-۱۰) (یہ بھی دیکھنا چاہیئے۔ یوحنا ۸-۵۸ + ۱۷-۵) قیصریہ فلپی میں شمعون نے اقرار کیا "تو زندہ خدا کا بیٹا مسیح ہے۔ اور اس اقرار کے سبب سے یسوع نے اس کی تحسین کی۔ (متی ۱۶-۱۶-۱۷ اور ۱۷)

جب خداوند یسوع صدرِ عدالت کے سامنے کھڑا تھا اور سردار کاہن نے یہ سوال کیا - "کیا تو اُس ستودہ کا بیٹا مسیح ہے"؟ تو یسوع نے اقرار کیا کہ ایسا ہی ہے حالانکہ اُس کو ضرور معلوم تھا کہ اس اقرار کا نتیجہ موت ہوگا۔

رسولوں کے خطوط اور مکاشفہ کی کتاب بھی ہم آواز ہیں۔ مثلاً فلپیوں کے دوسرے باب میں مرقوم ہے "اس نے اگرچہ خدا کی صورت پر تھا، خدا کے برابر ہونے کو قبضے میں رکھنے کی چیز نہ سمجھا بلکہ اپنے آپ کو پست کیا .... اور یہاں تک فرماں بردار رہا۔ کہ موت بلکہ صلیبی موت گوارا کی۔ اسی واسطے خدا نے ..... اُسے وہ نام بخشا جو سب ناموں سے اعلیٰ ہے تاکہ یسوع کے نام پر ہر ایک گھٹنا جھکے" (۶ سے ۱۰ تک) "وہ اَن دیکھے خدا کی صورت اور تمام مخلوقات سے پہلے مولود ہے۔ کیونکہ اُسی میں سب چیزیں پیدا کی گئیں ..... اور وہ سب چیزوں سے پہلے

ہے اور اُسی میں سب چیزیں قایم رہتی ہیں" (کلسیوں ۱-۱۵ سے ۱۷ تک نیز دیکھو رومیوں ۹-۵، عبرانیوں ۱-۲ اور ۳) نیز نئے عہدنامہ میں لفظ (Kurios) یعنی خداوند، برابر یسوع مسیح کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اور پرانے عہد کے یونانی ترجمہ میں یہ لفظ خدا تعالیٰ کا نام ہے۔ ہر حصے میں نیا عہدنامہ خداوند یسوع مسیح کو الہٰی بتاتا ہے۔ اور یہ بھی کئی مقاموں میں صاف طور پر بتایا جاتا ہے۔ کہ کلام۔ بیٹا، تخلیق کا وسیلہ اور خلقت کا سنبھالنے والا ہے اور ازل سے، خلقت کی پیدائش سے بیٹا موجود ہے۔

۶۔ ان باتوں کو ہم یوں دکھا سکتے ہیں۔

(۱) خداوند یسوع روح القدس کی قدرت سے مجسم ہوا (لوقا ۱-۳۵، متی ۱-۱۸ سے ۲۰ تک)

(۲) خدا نے خاص طور پر اس کو مقرر کیا (یوحنا ۱-۳۲ سے ۳۴ تک، مرقس ۱-۱۱، ۹-۷)

(۳) وہ مُردوں میں سے زندہ کیا گیا (چاروں اناجیل۔ اعمال۔ ۱-۲۲ سے ۳۲ تک وغیرہ)

(۴) وہ تمام کائنات کا وارث اور خداوند ہے (عبرانیوں ۱-۳ سے ۵ تک، رومیوں ۱۴-۹، اعمال ۱۰-۳۵ وغیرہ)

(۵) اس میں ساری الوہیت ہے (کلسیوں ۲-۹)

۷۔ اس بات پر زور دینا ضروری ہے کہ یسوع نے خود الوہیت کا دعویٰ کیا تھا کیونکہ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ ہم یسوع ناصری کو نہایت بڑا شخص، نبی،

مذہبی پیشوا اور اوتار مانتے ہیں۔ مثلاً مہاتما گاندھی مرحوم یہی کہتے تھے۔ اور کسی ہندو نے مسیح کی تعریف میں ایک کتاب لکھی جس کو اُس نے مہاتما عیسیٰ کہا۔ ایسے ایسے لوگ جب مسیح پر ایمان نہیں رکھتے تو یا تو اُس کے الفاظ کو جو اس نے اپنے بارے میں کہے نظرانداز کرتے ہیں یا یہ کہتے ہیں کہ یسوع کے شاگردوں نے خاص انجیل کو بگاڑ کر یسوع کے لئے ایسا دعویٰ کیا جو اُس نے خود نہیں کیا۔

اول۔ متی کے گیارھویں باب میں یسوع کے ایسے ایسے الفاظ درج ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ خدا سے ایسا تعلق رکھنے کا دعویٰ کرتا تھا جو صرف الٰہی ہستی کا ہو سکتا ہے۔ (یوحنا کی انجیل میں بھی اسی طرح کے کئی ایک مقام ہیں۔ (دیکھو مذکورہ بالا حوالجات)

دوم۔ متی کے پانچویں باب سے ظاہر ہے کہ ہمارے خداوند نے شریعت کے احکام کو زیادہ روحانی اور وسیع بنانے کا دعویٰ کیا۔ "تم سُن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا تھا۔۔۔۔۔" "لیکن میں تم سے کہتا ہوں۔" (آیات ۲۱-۲۲، ۲۷، ۲۸۔ وغیرہ) کہا گیا تھا۔ ان الفاظ سے یہ مراد ہے کہ خدا نے موسیٰ کی زبانی کہا تھا۔

سوم۔ وہ انسان پر خاص اختیار رکھتا ہے اور اس کا منصف ہوگا۔ (اوپر دیکھو)

چہارم۔ وہ انسان کے لئے خاص خدمت کرنے آیا جس سے نیا عہد قائم ہوگا۔ اور انسان کو نجات ملے گی۔ (مرقس ۱۰-۴۵، ۱۴-۲۴+ ۱۔کرنتھیوں ۱۱-۲۵۔ وغیرہ)

پنجم۔ وہ خدا کو اپنا باپ کہتا تھا (متی ۱۰-۳۲ اور ۳۳، ۲۶-۵۳، لوقا ۲۲-۲۹ وغیرہ وغیرہ)

خداوند یسوع کا ایک قول لوگوں کو بہت پسند ہے "اے محنت اٹھانے والو اور بوجھ سے دبے ہوئے لوگو، سب میرے پاس آؤ۔ میں تم کو آرام دوں گا۔" پر ان الفاظ میں بڑا دعویٰ مقدر ہے کیونکہ تمام مصیبت اٹھانے والوں کو صرف خدا ہی آرام بخش سکتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ خداوند کے ایسے دعووں کو نظر انداز کیا جائے کیونکہ یہ دعویٰ انجیل کا ضروری حصہ ہیں۔

۸۔ نئے عہدنامہ کی صریح تعلیم ہے کہ خداوند یسوع مسیح حقیقی انسان ہے۔ وہ تھکتا تھا۔ (یوحنا۔۴۔۶ + مرقس۔۴۔۳۸) اسے بھوک لگتی تھی (متی ۴۔۲ + ۱۱۔۱۲) اس کے آنسو بہے (یوحنا۔۱۱۔۳۵ + لوقا ۱۹۔۴۱)۔ یوحنا کی انجیل کے دیباچہ میں مندرج ہے۔ کہ وہ مجسم ہوا (۱۔۱۴) اور اسی آیت میں اس کے الٰہی جلال کا بھی ذکر ہے۔ وہی لکھنے والا اپنے پہلے خط میں اس بات پر زور دیتا ہے کہ مسیح درحقیقت انسان ہے (۱۔یوحنا۔۴۔۲۔اور ۳، ۵۔۶)۔ نیز پولس کے خطوط میں اس کی انسانیت کا ذکر ہے (فلپیوں ۲۔۷، گلتیوں ۴۔۴، دیکھو اتھسیس ۲۔۵ جہاں غالباً لکھنے والا کسی عقائدنامہ یا گیت سے جو اس وقت مروج ہوگیا تھا اقتباس کرتا ہے) یسوع کھاتا پیتا تھا۔ اس کے سب دیکھنے والے اس کو انسان سمجھتے تھے۔ اس کے رسول اس کی انسانیت اور الوہیت دونوں کے ماننے والے تھے۔

یسوع اپنے آپ کو بار بار ابن آدم کہتا تھا خاص کر جب وہ اپنے اختیار کا ذکر کرتا تھا۔ مثلاً "ابنِ آدم سبت کا بھی مالک ہے" (مرقس ۲۔۲۸) یا اپنی موت۔ انسان کے لئے فدیہ دینے مصیبت اٹھانے اور جی اٹھنے کا ذکر کرتا تھا۔ (مرقس۔ ۱۰۔۳۳ اور ۳۴، نیز ۴۵، لوقا۔۹۔۸۔۵، وغیرہ) نیز جب یسوع اپنی عظمت اور

اختیار کا دعویٰ کرتا تھا تو بعض اوقات یہ محاورہ استعمال کرتا تھا "تم ابنِ آدم کو قادرِ مطلق کی داہنی طرف بیٹھے اور آسمان کے بادلوں کے ساتھ آتے دیکھو گے" (مرقس ۱۴-۶۲، نیز دیکھو متی ۱۳-۴۱، ۲۵-۳۱) اس میں شک نہیں کہ فقرہ "ابنِ آدم" مسیح کے لئے استعمال ہونے لگا۔ تو بھی اس میں یہ اشارہ موجود ہے، کہ خداوند حقیقی انسان یا انسانیت کا نمائندہ ہے۔ پولس بتاتا ہے کہ وہ آسمانی آدمی ہے جو ایمانداروں کو زندگی بخشتا ہے (۱۔کرنتھیوں ۱۵-۴۵ اور ۴۹)

خداوند یسوع کے کاموں کو دیکھنے اس کی با اختیار تعلیم سننے، اسکی طبیعت اور خصلت معلوم کرنے اور اس کی صحبت میں رہنے سے خاصکر اس کی موت اور جی اٹھنے سے مسیح کے پہلے شاگردوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ اس انسان میں ہم خدا تعالیٰ سے دوچار ہوتے ہیں (اگر یہ محاورہ استعمال ہو سکتا ہے)

۹۔ مسیح کس طرح سے خدا کا بیٹا یا یوں کہیں ازلی و ابدی باپ کا بیٹا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ازلی صدور سے بیٹا ہے۔ مگر یہ لفظ صدور یہاں تک خطرناک ہے کہ چونکہ مادی دنیا میں صدور سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو شے صادر ہوتی ہے وہ زمانہ کے لحاظ سے اس کے مخرج سے ادنیٰ درجہ پر ہے۔ یعنی پہلے مخرج وقوع میں آتا ہے، اور پھر وہ چیز جو اس سے صادر ہے۔ اس لئے بعضوں نے خیال کیا کہ ازل سے باپ ہے اور بعد کو بیٹا اور پاک روح پیدا ہوئے یعنی درحقیقت اقانیم ثانی اور ثالث مخلوق ہیں۔ یہ انجیل کی تعلیم نہیں۔ سب سے مشہور بدعتی جس نے یہ تعلیم پیش کی وہ آرئس ہے (Arius) پر یہ دکھایا ہے کہ اس کی تعلیم کا یہ نتیجہ ہے کہ ہمارا نجات دہندہ درحقیقت خدا نہیں۔ پھر ہم کو نجات ملی ہی نہیں۔

یہ امر ضروری کہ انسان کا نجات دہندہ خود خدا ہو۔

۱۰۔ مسیح کی ذات کو سمجھنے کیلئے ہمیں لفظ "شخص" استعمال کرنا پڑے گا ہم کہینگے کہ مسیح شخص تھا۔ بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ اس میں شخصیت تھی۔ اس لفظ شخص کے استعمال میں ایک علم غلطی کا امکان ہے وہ یہ کہ ہم مسیح کو اسی معنی میں شخص کہلنے دیں جس میں کہ ہم ہر دو انسان کو شخص سمجھتے ہیں لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ عام انسان میں کامل شخصیت نہیں پائی جاتی ہے۔ کامل شخصیت خدا میں پائی جاتی ہے۔ اور ہم جو ناکامل بلکہ بگڑی ہوئی شخصیت رکھتے ہیں شخصیت کے کمال کو جو ذات الٰہی میں ہے کیونکر متصور کر سکتے ہیں۔ بہرحال خدا کو منظور ہوا کہ اپنا اعلیٰ ترین مکاشفہ انسان کو بخشے تو اسے شخصی صورت میں بخشے۔ ورنہ انسان نجات بخش علم سے محروم رہتا۔ یسوع کی قوت ارادہ اور اس کی خواہشیں برعکس ہمارے بالکل راست اور درست تھیں۔ ہم خدا کی مرضی کا اندازہ نہیں لگا سکتے لیکن پہچان ضرور سکتے ہیں اور جس طرح سے خدا اپنے ارادوں کو پورا کرتا ہے، اسی طرح سے مسیح اپنے ارادوں کو پورا کرتا تھا اور اس کے ارادے اعلیٰ تھے جیسے خدا کے ارادے (جہاں تک اس نے ان کو ہم پر ظاہر فرمایا ہے) عقائد نامہ میں بتایا گیا کہ "اس کا اور باپ کا ایک ہی جوہر ہے۔" یہ جوہر مسیح کے ارادوں اور کاموں میں پہچانے جاتے ہیں۔ (دیکھو۔ یوحنا۔ ۵۔ ۱۷۔ سے ۲۲ تک)

۱۱۔ یہ خیال کرنا غلط ہے کہ تجسم سے الٰہی ماہیت یا ذات میں کمی واقع ہوتی ہے۔ بائبل کی تعلیم ہے کہ خدا نے بنی آدم کو اپنی صورت اور شبیہ پر بنایا۔ اس سے ظاہر ہے کہ کامل انسانیت اور الوہیت میں مخالفت نہیں۔ البتہ یہ فرق ضرور ہوگا کہ انسانیت اگرچہ از روئے انسان کامل بھی ہو تو بھی از روئے خدا غیر مکمل اور کوتاہ

ہے پر خدا بالکل کامل اور لامحدود ہے۔ بہرکیف حقیقی انسانیت جو گناہ سے مبرا ہو اور الوہیت میں اختلاف نہیں۔ چنانچہ خدا کا بیٹا مجسم ہونے پر بھی گناہ سے مبرا تھا۔

جس حال کہ ہمیں یہ ماننا ضروری ہے کہ ہماری نجات کا بانی حقیقی انسان تھا۔ تو بھی ہمیں کبھی یہ خیال نہ کرنا چاہیئے۔ کہ انسان بن کر اس نے الوہیت کو چھوڑ دیا تھا۔ انسان ہوتے ہوئے بھی وہ عالمین کو سنبھالتا تھا اور باپ میں تھا۔ (ملاحظہ ہو یوحنا ۱؍۱۸، ۱۴، ۹سے ۱۱تک عبرانیوں ۱-۳) یہ خیال ہماری سمجھ میں پوری طور سے نہیں آسکتا کیونکہ ہم زمان ومکان کے کبڑے ہیں۔ لیکن اتنا تو ضرور سمجھ سکتے ہیں کہ یہ مسئلہ اگرچہ عقل انسانی سے برتر ہے۔ مگر عقل کے خلاف نہیں چونکہ خدا قادر مطلق ہے، اس لئے وہ ایسا کام کرسکتا ہے، جس سے ہماری عقل حیران تو ہو مگر معدوم نہ ہوجائے۔

دوبارہ پادری تھورنٹن (Thornton) صاحب کی مثال اختصار کے ساتھ لکھنا خالی از فائدہ نہیں۔ نباتات ویسی ہی مادی ہیں جیسی جمادات۔ پودا اور پتھر دونوں مادی ہیں۔ پر پتھر کی ہستی کا قاعدہ محض مادی ہے۔ پودے کی ہستی کا قاعدہ نباتی ہے۔ اسی طرح سے انسان مادی بھی ہے اور حیوانی بھی۔ انسان کے جسم کا پیدا ہونا۔ بڑھنا۔ حرکات کرنا۔ مرنا سب حیوانات کی طرح ہیں (کیا وہ حیوان ناطق نہیں کہلاتا) لیکن اس کی زندگی کا قاعدہ محض حیوانی نہیں بلکہ انسانی۔ علیٰ ہذا القیاس خداوند یسوع مسیح انسان بھی ہے اور خدا بھی۔ پر خداوند کی زندگی کا قاعدہ الٰہی ہے۔ نہ کہ محض انسانی۔ وہ انسان کے طور پر حقیقی انسانی زندگی بسر کرتا تھا۔ بحیثیت کلام کے عالمین کو سنبھالتا تھا۔ اور بحیثیت بیٹے کے باپ کے ساتھ

ایک تھا اور ہے۔ اپدالآباد اس کی تمجید ہو۔ کہ اس نے گنہگار انسان کے درمیان زندگی بسر کرنا اختیار کیا بلکہ خود انسان بنا اور گنہگاروں کے ہاتھ سے تکلیف اُٹھانا۔ بلکہ مصلوب ہونا گوارا کیا۔

(نوٹ: حصہ ۱۱۔ زیادہ تر مقدس اتھنیشیس کی تصنیفات سے لیا گیا ہے)

فصل سوم

اقنوم ثالث ۔ روح القدس

۱۔ مسیحیوں کو روح القدس کی الوہیت سمجھنے میں کچھ مشکل نہیں ہوتی۔ کیونکہ ہم خدا کو روح مانتے ہیں۔ خداوند نے یہی تعلیم دی تھی۔ (ملاحظہ ہو یوحنا $\frac{4}{24}$)

مسلمانوں کو البتہ اس مسئلہ کے سمجھنے میں دقت ہوتی ہے کیونکہ وہ روح کو ایک لطیف مادہ تصور کرتے ہیں۔

نئے عہدنامہ میں روح کے متعلق یہ آیا ہے:۔

ا ۔ متی $\frac{3}{16}$ ۔ روح مسیح پر اُترا۔

ب ۔ رومیوں $\frac{8}{14}$ ۔ جو "خدا کے روح کی ہدایت سے چلتے ہیں...."

ج ۔ ۱۔ کرنتھی $\frac{3}{16}$ ۔ خدا کا روح تم میں بسا ہوا ہے۔

د ۔ ۱۔ پطرس $\frac{4}{14}$ ۔ خدا کا روح تم پر سایہ کرتا ہے۔

(جہاں کہیں لفظ روح اقنوم ثالث کے لئے مستعمل ہے وہاں وہ مذکر لکھا گیا ہے)

۲۔ روح القدس کی الوہیت ہر ایک مسیحی مانتا ہے لیکن بہتیرے روح کو محض اثر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ شاید خود اس غلط فہمی کو نہ بھی پہچانتے ہوں۔ بہرکیف نیا عہدنامہ صاف طور پر روح القدس کی شخصیت سکھاتا ہے۔ یوحنا کی انجیل کے ۱۴۔ ۱۵۔ اور ۱۶ بابوں میں جہاں کئی بار روح القدس کا ذکر ہے، وہاں اس کے ایسے کام بتائے جاتے ہیں۔ جو کسی شخص کے کام ہیں۔ وہ مددگار کہلاتا ہے (۱۴۔ ۲۶) وہ سکھائے گا اور یاد دلائے گا۔ (ایضاً) وہ گواہی دیتا ہے (۱۵۔ ۲۶) وہ تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ (۱۶۔ ۱۳)

پولس بتاتا ہے کہ روح ہماری سفارش کرتا ہے۔ (رومیوں۔ ۸۔ ۲۶) نیز کرنتھیوں کے پہلے خط کے بارھویں باب میں روح القدس کی بخششوں کا ذکر ہے۔ اور یہ لکھا ہوا ہے:" جس کو جو چاہتا ہے بانٹتا ہے" (آیت ۱۱۔) افسیوں کے نام کے خط میں روح القدس کے رنجیدہ ہونے کا ذکر ہے (۴۔ ۳۰) اعمال میں بتایا گیا کہ حننیاہ نے روح القدس سے جھوٹ کہا۔

۳۔ یوحنا کی انجیل کے بیسویں باب میں بتایا گیا ہے۔ کہ خداوند یسوع نے جس روز وہ جی اُٹھا اپنے رسولوں کو روح القدس بخشا:" روح القدس لو" (آیت ۲۲) نیز یہ بتایا گیا کہ بعد کو اس نے شاگردوں کو یروشلیم میں رہنے کا حکم دیا۔ اور کہا:" تم تھوڑے دنوں کے بعد روح القدس سے بپتسمہ پاؤ گے" اور یہ بھی بیان ہے کہ پینتکست کے دن روح القدس بڑے زور کے ساتھ سب پر نازل ہوا۔ ان دو واقعات کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انجیل میں روح القدس کا محض وعدہ کیا گیا۔ یہ وعدہ اعمال کی کتاب میں پورا ہوتا ہے۔ مگر دراصل جو الفاظ

یوحنا کی انجیل میں استعمال ہوئے ہیں۔ ان کا یہ مفہوم نہیں ہے۔ وہاں یہ نہیں لکھا کہ تم روح القدس پاؤ گے۔ بلکہ یہ کہ "روح القدس لو" اس کے معنی یہ ہوئے کہ خداوند نے جی اٹھنے کے بعد اور صعود سے پیشتر روح کا بیعانہ دیا اور اس کی معموری پنتیکست کے وقت عنایت کی۔

نئے عہدنامہ کی تعلیم یہ ہے کہ روح القدس انسان پر اثر ڈالتا ہے، تاکہ وہ راستبازی کو اور اپنی گنہگاری کو پہچانے (یوحنا ۱۶-۸) نیز جیسا اوپر مذکور ہے وہ مسیح کی گواہی دیتا ہے۔ روح القدس ہر مسیحی کے حقیقی مسیحی بننے کا وسیلہ ہے۔ یہاں تک کہ پولس کہتا ہے کہ "جس میں مسیح کا روح نہیں وہ اس کا نہیں۔" (رومیوں ۸-۹) نیز پاک روح ایماندار کو پاک بناتا ہے یعنی اس کو خدا کے لئے مخصوص کرتا ہے تاکہ وہ ہر بات میں خدا کے تابع ہو (دیکھو۔ رومیوں ۱۵-۱۶، ۱-پطرس ۱-۲) خدا انسان کے دل میں اور انسان کی نجات کے متعلق کل کام روح القدس کے ذریعہ سے کرتا ہے۔

ہر سچے مسیحی کو روح القدس ملتا ہے لیکن بہتیرے روح کی معموری سے واقف نہیں۔ گویا پوری قیمت نہیں ملی پر محض بیعانہ۔ یہ معموری بعض اوقات پل بھر میں ملتی ہے۔ جیسا کہ پنتیکست کے روز اور بعض وقت رفتہ رفتہ لیکن ہر ایک ایماندار کو اس معموری کا جویاں رہنا چاہیئے۔ تاکہ پوری روحانی فتح اور قوت حاصل ہو۔

۴۔ پاک کلام کی تعلیم یہ ہے کہ کلیسا روح کی بھرپوری کا ظرف ہے۔ دہی مورد روح ہے۔ اعمال کی کتاب میں ذکر ہے کہ پاک روح تمام شاگردوں پر نازل ہوا۔ اور نیز وہ پاک آگ جو اس کے نزول کا نشان تھا ہر ایک پر ٹھہری۔ روح

کا مسکن کلیسا ہے ۔ ۱۔ کرنتھیوں ۔۳۔ ۱۶ ۔ جہاں لکھا ہے ۔" تم خدا کا مقدس ہو" غور کرنے کی بات ہے کہ لفظ مقدس واحد ہے ۔ اور یہ نہیں لکھا گیا کہ" تم خدا کے مقدس ہو" اور نہ یہ" تم میں سے ہر ایک خدا کا ایک مقدس ہے ۔" یعنی اس آیت میں کلیسا کا ذکر ہے ۔ حالانکہ یہ بھی سچ ہے کہ ہر مسیحی روح کا مسکن ہوسکتا ہے (۱ ۔ کرنتھیوں ۔۶ ۔ ۱۹) اور اعمال کی کتاب میں بار بار کسی شخص کے روح سے معمور ہونے کا ذکر ہے ۔ بہر حال یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ نئے عہدنامہ کی تعلیم ہے کہ انفرادی طور پر مسیحی روح کی حضوری میں اس لئے حصہ پاتا ہے کہ وہ کلیسا میں شریک ہے ۔ (نیز دیکھو ۲۔ کرنتھیوں ۔۶ ۔ ۱۶ + افسیوں ۔۲ ۔ ۲۲)

۵ ۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ روح القدس کی حضوری باپ اور بیٹے دونوں کی حضوری ہے ۔ اس لئے روح القدس کو نہ صرف خدا کا روح کہا جاتا ہے ۔ بلکہ مسیح کا روح بھی ۔ یوحنا کی انجیل میں خداوند کا یہ قول ہے :" روح جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا ۔" (باب ۱۴ ۔ آیت ۲۶) ۔ اور یہ بھی بتایا کہ مددگار باپ سے صادر ہوتا ہے (۱۵ ۔ ۲۶) تمام مسیحی کلیسیلں اس بات پر متفق ہیں کہ روح القدس باپ سے صادر ہے پر مغربی کلیسیا اور مشرقی کلیسیا میں اس بات پر اختلاف ہے کہ آیا یہ کہنا چاہیئے جیسے مغربی عقائد نامہ میں مذکور ہے :" وہ باپ اور بیٹے سے صادر ہے" یا محض" وہ باپ سے صادر ہے ۔" یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ مغربی کلیسیا گویا دو الٰہی مخرج مانتی ہے ۔ (یہ تو شرک ہوگا) اور نہ یہ کہ مشرقی کلیسیا اس بات کا انکار کرتی ہے کہ بیٹا روح کو بھیجتا ہے ۔ لیکن ماننا پڑتا ہے کہ پاک کلام میں روح القدس کے محض باپ سے صادر ہونے کا ذکر ہے ۔ مگر یہ ایسی بات ہے کہ جس کا فیصلہ کسی ایک

آیت کے اقتباس سے نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دیکھنا چاہیئے کہ پاک کلام کی کیا تعلیم ہے۔ نئے عہدنامے کی مجموعی تعلیم یہ ظاہر کرتی ہے کہ روح القدس نہ صرف باپ بلکہ بیٹے سے بھی صادر ہے۔ روح نہ صرف باپ کا بلکہ بیٹے کا بھی ہے۔ مثلاً اعمال کی کتاب میں روح القدس کو "مسیح کا روح" کہا گیا ہے بعض لوگوں نے ایک "بہتر" جملہ تجویز کیا ہے یعنی یہ "وہ باپ سے۔ بیٹے کے وسیلے۔ صادر ہے۔" اس جملہ کو کسی جنرل کاونسل نے تسلیم نہیں کیا۔ ہم یہ بات کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ روح القدس الٰہی شخصیت ہے۔ وہ باپ اور بیٹے کے ساتھ واحد خدا ہے۔ انسان کے دل میں روح القدس کا کام کرنا باپ اور بیٹے کا کام کرنا ہے۔ مقدس اتھینس کے عقیدے میں یہ الفاظ آئے ہیں "روح القدس باپ اور بیٹے سے۔ نہ مصنوع۔ نہ مخلوق۔ نہ مولود۔ بلکہ صادر ہے۔" اور خدا بہتر جانتا ہے!

فصل چہارم

پاک ثالوث

مذکورۂ بالا فصلوں میں کوئی فصل خدا باپ کے بارے میں نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کے باپ ہونے پر کسی مسیحی کو شک نہیں۔ حالانکہ وہ وحدانیت محض کو مانتا اور ثالوث کا انکار بھی کرتا ہو۔ لیکن جو شخص ثالوث کا انکار کرتا ہے اُسے درحقیقت خدا کو باپ نہیں کہنا چاہیئے۔ خدا کی ہر صفت ازلی و ابدی ہے۔ پس ذات الٰہی کے اندر باپ کی صفت موجود ہونا لازمی ہے ورنہ وہ صفت

مخلوق پر مبنی ہوگی یعنی خدا بغیر خلقت کے نامکمل ہوگا۔

۱۔ مسئلۂ ثالوث وحدانیت پر موقوف ہے۔ ہمارے خداوند نے خود وحدانیت کی سچائی کی تصدیق کی جبکہ اس نے فرمایا کہ حکموں میں اوّل یہ ہے "اے اسرائیل سُن خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے ...." (مرقس۔ ۱۲۔ ۲۹) ثالوث وحدانیت کے ماننے کا ایک طریقہ ہے۔

وحدانیت کیا چیز ہے؟ وحدانیت دو قسم کی ہوتی ہے اول تو ہندسوں کی وحدانیت یعنی ایک ۱۔ یہ وحدانیت محض ہے۔ اگرچہ ایک شے کے حصّے ہوسکتے ہیں۔ مگر نمبر ایک کے حصے نہیں اور اگر اشیا تقسیم نہ ہوسکتیں۔ تو غالباً کسر کا خیال کبھی پیدا نہ ہوتا کیونکہ انسان کے خیالات جن میں منطق، فلسفہ اور ریاضی شامل ہیں، تجربہ پر موقوف ہیں اور تجربہ سے نکلے اور نکلتے ہیں۔ دوم۔ اشیا اور اشخاص کی وحدانیت پر تقریباً ہر شے اور ہر شخص ایک معنی میں مرکب ہے۔ حالانکہ کسی نے اس کو دو یا دو سے زیادہ حصّوں سے مرکب نہ لکھا کیا ہو۔ مثلاً انسان میں جسم اور جسم کے اعضا عقل۔ حواس خمسہ۔ وغیرہ ہیں۔ پر ایک انسان واحد شخص ہے۔ اسی طرح سے انسان کی عقل میں حواس خمسہ مانے جاتے ہیں۔ تو بھی انسان کی عقل واحد عقل ہے۔ نیز ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عناصر بھی مرکب ہیں یعنی پروٹان اور ایلیکٹران۔ ان کے ہر ذرے میں موجود ہیں (electron) اور (proton) لیکن عناصر۔ لوہا۔ گندھک۔ آکسیجن وغیرہ یہاں تک غیر مرکب ہیں کہ ریڈیم (radium) کے دریافت ہونے سے پہلے ان میں وحدانیت کل مانی جاتی تھی۔ علاوہ اس کے خلقت میں جو مخلوق

اعلیٰ درجہ کا ہے وہ اور مخلوقات سے زیادہ مرکّب ہے۔ یعنی اُس کے اندر طرح طرح کی ہستیاں پہچانی جاتی ہیں۔ انسان "اشرف المخلوقات سب سے زیادہ مرکّب ہے [لفظ مرکب اس معنی کو ادا کرنے کے لئے غیر مکمل ہے اور خادم دوبارہ اس بات پر زور دینا چاہتا ہے۔ کہ اس سے یہ مراد نہیں کہ کسی نے الگ الگ شیا سے انسان کو بنایا]

علیٰ ہذا القیاس یہ خیال کرنا کہ خدا تعالیٰ کی وحدانیت ہندسوں کی وحدانیت کی طرح سمجھنا لازم ہے غلط معلوم ہوتا ہے۔ جملہ "خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے" کا یہ مطلب ہے کہ اول اور کوئی خدا یا معبود نہیں۔ دوم کسی اور کو اس کے ساتھ شریک نہ کرنا چاہیئے۔ سوم۔ وہی تمام دیگر ہستیوں کا خالق ہے، وہی تمام ہستی کا مخرج ہے۔ مسئلہ ثالوث کے رو سے ہم کسی غیر کو ذات الٰہی میں شریک نہیں کرتے پر یہ مانتے ہیں کہ ازل سے ابد تک ذات الٰہی میں جو واحد ذات بے شراکت ہے اور تین متفرق الٰہی ہستیاں ذات الٰہی میں پہچانی جاتی ہیں۔ جو ازل سے ابد تک ایک واحد خدا ہے۔ ایک پرانے عقائدنامہ میں یوں مرقوم ہے۔

"ہم واحد اللہ کی پرستش تثلیث میں اور ثالوث کی پرستش توحید میں کریں نہ اقانیم کو مخلوط کریں نہ جوہر کو تقسیم۔ کیونکہ اقنومیت باپ کی اور ہے بیٹے کی اور روح القدس کی اور۔ لیکن باپ بیٹے اور روح القدس کی الوہیت ایک ہی ہے۔ ...... تاہم تین ازلی نہیں بلکہ ایک ازلی ہے"...... ایک ہی غیر مخلوق اور ایک ہی غیر محدود ہے"

مسلم جو مسئلہ ثالوث پر اعتراض کرتے ہیں وہ اس لئے کرتے ہیں کہ اُن کی دانست میں خداوند یسوع مسیح 'بیٹا' مخلوق ہے اور روح القدس بھی جس کو وہ اکثر فرشتہ سمجھتے ہیں مخلوق ہے۔ ان کا اعتراض ایسے عقیدہ پر ہے جس کو مسیحی کلیسیا نہیں مانتی اور جس کو اُس نے کبھی نہیں مانا۔ مخلوق کو خالق کے ساتھ شریک کرنا گناہ اور بے وقوفی ہے۔ ایک ہی خدا ہے جس کے حضور اور کسی کی عبادت کرنا خلاف عقل ہے۔ بلکہ خدا کے حکم کے خلاف (خروج ۲۰ باب ۳ اور ۵)

۲۔ خادم اوپر لکھ چکا کہ انسان کے تمام خیالات تجربہ سے پیدا ہوتے ہیں اور علم الٰہی خدا کے مکاشفہ پر موقوف ہے جو انسان کے عقلی تجربہ میں داخل ہے اور جس کا اثبات عملی زندگی کے تجربہ سے ہوتا ہے۔

اگر مسئلہ ثالوث محض ایک کتاب سے جس کو لوگ الہامی کہتے تھے نکلتا تو اس کو ماننا دشوار ہوتا۔ پر یہ مسئلہ کلیسیا اور اس کے شرکیوں کے تجربہ پر مبنی ہے خداوند یسوع مسیح نے خدا کے ساتھ ایک ہونے کا دعویٰ کیا جیسا اوپر بیان ہو چکا اور اس نے انسانی زندگی میں خدا کو شخصی طور پر ظاہر کیا۔ اُس نے خدا اور انسان کے بیچ میں درمیانی ہونے کا بھی دعویٰ کیا "کوئی باپ کو نہیں جانتا سوا بیٹے کے اور اس کے جس پر بیٹا اُسے ظاہر کرنا چاہے۔" (متی ۱۱۔ ۲۷) نیز "کوئی میرے وسیلے کے بغیر باپ کے پاس نہیں آسکتا۔" (یوحنا ۱۴۔۶) مسیح کے شاگردوں نے اس کی تعلیم کو پہچانا کہ الٰہی تعلیم ہے "ہمیشہ کی زندگی کی باتیں ۔۔۔۔۔ تیرے ہی پاس ہیں" (یوحنا ۶۔ ۶۸) پھر انھوں نے مسیح کے بڑے بڑے کام دیکھے اور حالانکہ اس کے مصلوب ہوتے وقت وہ بھاگ

گئے اور اس پر سے اُن کا ایمان جاتا رہا (لوقا ۲۴: ۲۱-۲۰، متی ۲۶: ۵۶) تو بھی جب وہ جی اٹھا تو اُس پر ان کا ایمان دوبارہ پختہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ اُن میں سے ایک نے اقرار کیا "اے میرے خداوند۔ اے میرے خدا" (یوحنا ۲۰: ۲۸) پھر جب خداوند یسوع مسیح صعود فرما چکا اور ان پر پاک روح نازل ہوا، تو انھوں نے معلوم کیا کہ سچ مچ اُن کی خدا باپ تک رسائی ہوئی اور روح القدس جس کو بھیجنے کا مسیح نے وعدہ کیا (یوحنا ۱۵: ۲۶ وغیرہ) شخصی طور پر ان کی تقدیس، ہدایت اور تقویت کرتا رہا۔ یہ اعمال کی کتاب کی ایک خاصیت ہے کہ اُس میں قدیم کلیسیا کا یہ تجربہ ظاہر کیا جاتا ہے۔ روح القدس اس میں اور اس کے شرکا میں سکونت کرتا تھا (نیز دیکھو فصل سوم) ان تجربوں کے سبب سے مومنین نے بیٹے اور روح کی الوہیت پہچانی ......

بہرحال اگر یہ تجربہ پہلی صدی ہی کے مسیحیوں پر ختم ہوجاتا تو مسئلہ ثالوث کبھی نہ مانا جاتا۔ وہ صرف پہلی ہی صدی تک مانا جاتا۔ یہ غور طلب بات ہے کہ یہ دقیق مسئلہ اب تک مانا جاتا ہے۔ بلکہ ہر پشت کے مسیحیوں میں اس کا یقین تازہ ہوتا ہے۔ اور چند بدعتی فرقوں کو چھوڑ کر تمام کلیسیا اس کو پختہ طور پر مانتی آئی ہے۔ نیز مسئلہ ثالوث کو چھوڑنا کسی مسیحی فرقہ کے تنزل اور رخنے کے آثار میں سے ہے۔ یعنی اب تک ایماندار مسیحی مسیح پر ایمان لاکر خدا باپ کو پہچانتا ہے۔ اپنے میں گناہوں کی معافی کا احساس کرتا ہے۔ بدی سے بچنے کی توفیق اور طاقت حاصل کرتا ہے۔ اور روح کی تقدیس ہدایت اور تسلی حاصل کرتا ہے۔ یہ مسئلہ کلیسیا کے دائمی تجربہ پر موقوف ہے نیز یہ مسئلہ بتاتا ہے کہ کل کام

واحد خدا کا ہے اور کلیسیا کا اقرار یہ ہے "اے مسیح تو باپ اور روح القدس کے ساتھ ہمیشہ واحد خدا ابدالآباد زندہ اور سلطنت کرتا ہے۔"

۴۔ مسئلہ ثالوث یہ بھی بتاتا ہے کہ خدا تعالیٰ ازل سے ابد تک واحد خدا ہے۔ جس کی توحید فی التثلیث ہے۔ جیسا اوپر مذکور ہوا سبیلیس (Sabellius) نے یہ بدعت ایجاد کی کہ درحقیقت یہ کہنا کافی ہے کہ خدا نے اپنے آپ کو تین صورتوں میں ظاہر کیا گویا وہ اپنے آپ کو کبھی باپ، کبھی بیٹا، کبھی روح القدس کی صورت میں ظاہر فرماتا ہے۔ پر جو کوئی غور سے نئے عہدنامے کی تلاوت کرتا ہے وہ یقیناً معلوم کرتا ہے، کہ باپ اور بیٹے میں حقیقی فرق ہے حالانکہ وہ ایک بھی ہے اور اس کے سوا روح القدس کی شخصیت مانی جاتی ہے۔ دراصل اس بدعت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو کچھ خدا نے مسیح میں ہو کر کیا وہ محض نمائشی طور پر کیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری نجات کی خاطر خدا نے کوئی حقیقی کام نہیں کیا۔ پھر مسیح کا تجسم ہندوؤں کے اوتار کے برابر کر دیا جاتا ہے۔

اوروں نے یہ سمجھا کہ انجیل یہ سکھاتی ہے کہ بیٹا بھی اور روح القدس بھی باپ سے صادر ہیں۔ اور انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ایک وقت تھا کہ بیٹا نہ تھا اور روح بھی نہ تھا۔ پر یہ نئے عہدنامہ کی تعلیم کے زیادہ خلاف ہے۔ (مثلاً دیکھو یوحنا ۱ سے ۱۷ تک) اور اس کا یہ مطلب ہے کہ اقنوم ثانی اور اقنوم ثالث مخلوق ہیں۔ مقدس اتھنیسئس نے دکھایا کہ اول جو کچھ خدا نے مسیح میں اور روح القدس سے ظاہر فرمایا۔ یہ عارضی نہیں۔ بلکہ ازل سے ابد تک خدا کی ذات ایسی ہے جو اس نے تواریخ کے اندر ظاہر کی۔ بیٹے اور روح کا صدور ازلی و ابدی

ہے یعنی پاک ثالوث ازلی وابدی ہے۔ نیز اس بزرگ نے اس بات پر زور دیا کہ تین الٰہوں نے یوں اپنے آپ کو ظاہر نہیں کیا۔ بلکہ ایک ازلی وابدی خدا نے۔ اس کے لئے اُردو میں لفظ جوہر استعمال ہوا نہ صرف تین اقانیم ہیں۔ جن میں شخصیت ظاہر ہے پر ایک ہی جوہر ہے۔ انسانی شخصیت سے مثال لیجئے۔ مجھے (یا ناظر کو) ظاہر ہے کہ میرا ایک سلسلہ وار تجربہ ہے۔ عقلی بھی اور عملی بھی اور یہ کہ اس کا سلسلہ حافظہ کے زور سے قائم رہتا ہے۔ پر نہ صرف یہ میرا تجربہ ہے۔ بلکہ میں خود ہوں۔ علیٰ ہذا القیاس نہ فقط اقانیم ہیں خدا کا جوہر ہے جو تینوں اقانیم کا ہے۔

۴۔ ایک چھوٹی کتاب کو کسی صاحب نے رسولوں کے عقیدہ کے بارے میں تصنیف کیا ہے۔ اُس میں ایک خوبی یہ ہے کہ ہر مسئلہ کو سمجھانے کے بعد مصنف نے یہ سوال کیا "مجھے اس کے متعلق کیا کرنا ہے"؟ مسئلہ ثالوث کے بارے میں بھی یہ سوال لازم آتا ہے۔ ہم اس کے متعلق کیا کریں؟ اول ہم یاد رکھیں کہ فطرت کا خالق وہی ہے جس نے اپنی محبت کو مسیح کی زندگی میں ظاہر کیا پھر ہم یاد رکھیں کہ صلیب کی تکلیفوں کا یہ مطلب نہیں کہ گویا بیٹے نے محبت دکھائی جس سے باپ کا انصاف ٹھنڈا ہوا (نقل کفر کفر نباشد) خدا باپ ہم سے محبت رکھتا ہے اور تینوں اقانیم انسان کی نجات کے کام میں شریک ہیں۔ پھر دُعا کرتے وقت یاد رکھیں کہ خداوند یسوع مسیح بیچ ورمیانی ہے اور صرف اُسی کے وسیلہ سے ہم خدا سے دعا کر سکتے ہیں نیز ہم روح القدس کی ہدایت اور پاک کرنیوالی قدرت کو مانیں۔ مقدس پیٹرک نے لکھا ہے: آج میں ثالوث کا زور آور نام بطور زرہ بکتر کے اپنے سے باندھتا ہوں۔ آمین۔

"میں ایک کیتھولک رسولی کلیسیا پر ایمان رکھتا ہوں۔"

فصل اوّل

کلیسیا کی حقیقت

۱۔ مسیحی کلیسیا اسرائیلی کلیسیا کی قائم مقام ہے (فلپیوں ۳-۳، رومیوں ۲-۲۸ اور ۲۹؛ کلسیوں ۲-۱۱ اور ۱۲) چنانچہ ظاہر ہے کہ جب ہم کلیسیا پر غور کرتے ہیں تو ہمیں اسرائیلی کلیسیا کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔ کلیسیا ابراہام سے شروع ہوئی ہے۔ خدا نے جب اس کو حکم دیا کہ "تو اپنے وطن اور اپنے ناتے داروں کے بیچ سے اور اپنے باپ کے گھر سے نکل کر اس ملک میں جا جو میں تجھے دکھاؤں گا۔" تو کلیسیا کا آغاز ہوا۔ (پیدائش ۱۲-۱) خدا نے ابراہام کے ساتھ عہد باندھا (پیدائش ۱۵-۱ سے ۲۱ تک) اور اس کے نشان کے لئے ختنہ کی رسم مقرر کی۔

(پیدائش ۱۷-۹-۱۰ سے ۱۴ تک) اسرائیلیوں کے یہاں ہر مختون مرد کلیسیا یعنی اُمّت میں داخل ہوتا تھا۔ سینکڑوں برس تک بنی اسرائیل کبھی عہد پر قائم رہتے کبھی عہد شکنی کرتے تھے۔ پر وعدہ ہوا کہ ہمیشہ ایک بقیّہ رہے گا جو وفادار ہوگا۔ (یرمیاہ ۲۳-۳، ۳۱-۷، حزقی ایل ۶-۸، یوایل ۲-۳۲، عاموس ۵-۱۵، میکاہ ۲-۱۲ زکریاہ ۸-۱۲)

خداوند یسوع مسیح کو یہودیوں نے منظور نہ کیا اور خداوند نے اپنے خاص شاگردوں یعنی بارہ رسولوں کو چُنا کہ وہ اسرائیل کا حقیقی بقیّہ ہوں۔ متّی کی انجیل کے سولھویں باب میں مرقوم ہے، کہ اُن کو خاص تعلیم دینے کے بعد جب یسوع نے سوال کیا۔ تم مجھے کیا کہتے ہو تو شمعون پطرس نے اقرار کیا کہ "تو زندہ خدا کا بیٹا مسیح ہے۔" اس پر خداوند نے فرمایا "تو پطرس ہے اور میں اس پتھر پر اپنی کلیسیا بناؤں گا۔ اور عالم ارواح کے دروازے اس پر غالب نہ ہوں گے۔" (یعنی ملک الموت اس کو ناپید اور نابود نہ کر سکے گا۔) پروفیسر گوج صاحب مرحوم یوں لکھتے ہیں۔ کہ یسوع نے گویا یہودی کلیسیا کے کھنڈروں میں اپنا پھاوڑا مارا۔ اور وہ حقیقی اور وفادار بقیّے کے پتھر پر لگا جس پر وہ دوبارہ کلیسیا کو جو آئندہ مسیحی کلیسیا ہوگی تعمیر کر سکے۔ جب مسیح کی گرفتاری اور موت کے وقت یہی شاگرد بھاگ گئے۔ اور اس کو اکیلا چھوڑ گئے تو اپنے جی اُٹھنے اور شاگردوں کے دوبارہ ایمان لانے کے روز تک یسوع خود وہ وفادار بقیّہ تھا گویا حقیقی اسرائیل ایک ہی شخص میں مجسّم تھا۔

۲۔ کلیسیا انسان کی بنائی ہوئی جماعت نہیں بلکہ مسیح کی قائم کی ہوئی ہے۔ یہ نہیں کہ مسیحی لوگوں نے کہا کہ ہم اکٹھے ہو کر ایک انجمن بنائیں گے۔ بلکہ خداوند

نے اُن کی جماعت قائم کی۔ کلیسیائے جامع مقامی کلیسیاؤں کا مجموعہ نہیں بلکہ ہر جگہ مقامی کلیسیا کلیسیائے جامع کی شاخ ہے جس میں عالمگیر کلیسیا کا اظہار ہے۔ محکمۂ ڈاک کی مثال لیجئے۔ ہر گاؤں یا قصبہ یا شہر کا ڈاکخانہ محکمۂ ڈاک کی شاخ ہے۔ یہ نہیں کہ لوگوں نے متفرق مقاموں میں ڈاک خلنے قائم کرکے پھر آپس میں بندوبست کیا کہ یہ سب مل کر ایک سرکاری محکمہ ہو۔ علیٰ ہذا القیاس خداوند مسیحیوں کو بلا کر اپنے پاک روح سے اُن کی ہدایت فرماتا ہے کہ وہ اکٹھے ہوں۔ اور ان کو روح القدس کی بخششوں میں شریک کرتا ہے۔

یہ ضروری امر ہے کہ مسیحی دین شخصی ہو مگر انفرادی نہ ہو۔ پولس نے لکھا ہے کہ "خدا کے بیٹے ..... نے مجھ سے محبت رکھی اور اپنے آپ کو میرے لئے موت کے حوالہ کر دیا۔" لیکن یہ بھی لکھا۔ "مسیح نے ..... کلیسیا سے محبت کرکے اپنے آپ کو اس کے واسطے موت کے حوالہ کر دیا۔" (گلتیوں ۲-۲۰ ؛ افسیوں ۵-۲۵) ان دو باتوں میں اختلاف نہیں۔ پطرس کے پہلے خطِ عام میں ایک جملہ ہے جو برمحل ہے "تم زندہ پتھروں کی طرح روحانی گھر بنتے جاتے ہو تاکہ کاہنوں کا مقدس فرقہ بن کر ایسی روحانی قربانیاں چڑھاؤ جو یسوع مسیح کے وسیلے سے خدا کے نزدیک مقبول ہوتی ہیں۔" (۱-پطرس-۲-۵)۔ نیز کرنتھیوں کے پہلے خط کے بارھویں باب میں اور دیگر مقاموں میں پولس نے دکھایا ہے کہ ہر مسیحی کا خاص حصہ کلیسیا میں ہے اور کلیسیا مسیح کا بدن ہے (نیز۔ افسیوں ۔۴-۱- سے ۱۶- تک ، ۱-۲۲ اور ۲۳ -) جیسا اینٹ بھٹے میں پک کر چکنی مٹی سے تبدیل ہو کر پختہ اور استعمال کے لائق ہوتی ہے۔ پہ بغیر اور اینٹوں کے کام نہیں آسکتی

ویسا ہی ایک مسیحی اکیلا کوئی بڑا کام نہیں کرسکتا۔ علاوہ اس کے کلیسیا کے ذریعہ سے ہم کو خوشخبری پہنچتی ہے۔ اس کی شراکت میں ہم مضبوط ہوتے اور ترقی کرتے اور دیگر شرکا سے مل کر مسیح کی خدمت کرسکتے ہیں۔

۳۔ کلیسیا مسیح کا بدن کہلاتی ہے اور اس کا سر مسیح ہے۔ ۱۔کرنتھیوں ۱۲ میں پولس نے مفصل تمثیل لکھی جس میں اُس نے شرکا کو اعضا سے تشبیہ دی ہے اور دکھایا کہ ضرور ہے کہ سب مسیحی اپنے آپ کو مسیح بلکہ ایک دوسرے کے اعضا سمجھیں اور ہر ایک وہ کام کرے جو خدا نے اپنے روح القدس سے اس کے لئے مقرر کیا ہے۔ اور کوئی اپنے کو اوروں سے بڑا یا زیادہ ضروری نہ سمجھے اور دعویٰ نہ کرے کہ صرف میں ہی خاص اور بڑے بڑے کام کروں گا۔

نیز کلیسیا کو عمارت سے تشبیہ دی گئی ہے جیسا اوپر مذکور ہے۔ جس کی بنیاد مسیح ہے (۱کرنتھیوں۔۳۔۱۱)۔ پران مثالوں میں ہر وقت موافقت نہیں۔ کیونکہ کبھی کبھی انسان بنیاد کہا جاتا ہے۔ اگر رسول اور نبی شیوں (افسیوں۔۲۔۲۰) تو مسیح وہ مضبوط چٹان ہے جس پر پہلا ردا رکھا گیا ہے تمثیلوں میں ہمیشہ یہ کمزوری رہتی ہے کہ ہر شے جس کا تمثیل میں ذکر آتا ہے ہمیشہ ایک ہی معنی نہیں رکھتی مثلاً ہمارے خداوند نے لفظ خمیر کو اچھے اور بُرے دونوں معنوں میں استعمال کیا۔ (متی ۱۳۔۳۳+ ۱۶۔۶)

۴۔ کلیسیا شاہی کاہنوں کا فرقہ ہے۔ (۱۔پطرس۔۲۔۹)۔ اس کا یہ مطلب ہے۔ کہ ساری کلیسیا میں کہانت ہے اور خداوند یسوع مسیح کے وسیلے سے ہر ایماندار کی خدا باپ تک رسائی ہے۔ کلیسیا خداوند کی قائم مقام ہو کر دنیا میں

کاہن کا کام کرتی ہے۔ وہ کام یہ ہے روحانی قربانیاں چڑھانا یعنی شکر و تعریف کی قربانیاں۔ اپنے شکر کی دعائیں خداوند تعالیٰ کے حضور پیش کرنا۔ خداوند یسوع مسیح کے لئے سکرامنٹ ادا کرنا۔ انسان تک پاک کلام پہنچانا۔ دنیا کے لئے مناجات کرنا۔ اس کہانت کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہر مسیحی کا حق ہے۔ کہ کلیسیا کے ہر ایک کام کو انجام دے۔ غالباً یہ غلطی کرنتھس میں پیدا ہوئی۔ اور کرنتھیوں کے پہلے خط کے بارھویں باب میں پولس رسول نے اس کی اصلاح کی ہے۔ تو بھی بعض لوگ جب "تمام ایمانداروں کی کہانت" کا ذکر کرتے ہیں تو اب تک اس غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ (دیکھو فصل چہارم۔ باب ہذا)

۵۔ کلیسیا روح القدس کی سکونت گاہ ہے۔ (۱۔ کرنتھیوں ۳۔ ۱۶)۔

روح القدس پنتکست کے دن کلیسیا کو بخشا گیا۔ نیز کلیسیا کو بالکل پاک اور بے عیب ہونا چاہیئے (افسیوں ۵۔ ۲۷) شروع شروع میں یہ خیال کیا گیا تھا کہ ہر ایک مسیحی بالکل بے گناہ ہوگا۔ پر رسولوں کے اعمال میں ہمکو دکھایا گیا ہے کہ بہت جلد جھوٹ اور فریب (۵۔ ۱۔ سے ۱۱۔ تک) ایک دوسرے کی شکایتیں (۶۔ ۱)۔ اور علم الٰہی اور کلیسیائی کارروائی کی بابت اختلاف (۱۱۔ ۲۔ اور ۳ + ۱۵۔ ۱۔ ۱ اور ۲) ہونے لگا اور پولس کے خطوط اور دیگر خطوں سے ظاہر ہے کہ کلیسیا میں سے گناہ پورے پر نہیں مٹا۔ بار بار رسول مسیحیوں کی پاکیزگی کا ذکر کرنے کے بعد ایسے ایسے گناہوں سے پرہیز کرنے کی نصیحت کرتے یا ایسے ایسے گناہوں پر تنبیہ کرتے ہیں جن سے ظاہر ہے کہ رسولی زمانہ میں بھی کلیسیا بے عیب نہ تھی (۱۔ کرنتھیوں۔ باب ۱۔ ۵۔ ۸۔ ۱۱ — افسیوں۔ ۴۔ ۲۵ سے ۳۲ تک) یوحنا نے اپنے پہلے خط میں مسیحیوں کی بے گناہی پر

زور دیا ہے لیکن یہ بھی لکھا کہ "اگر ہم کہیں کہ ہم بے گناہ ہیں تو اپنے آپ کو فریب دیتے ہیں (۱-۸) حقیقت یہ ہے کہ جیسا بارہ رسولوں میں ایک یہوداہ اسکریوتی تھا، اور سب مسیح کو چھوڑ کر بھاگ گئے ویسا ہی کلیسیا کے شرکا ایسے گنہگار ہیں۔ جن کا فدیہ مسیح نے دیا اور جن کے گناہ بخشے گئے۔ پر اب تک وہ پورے طور پر گناہ سے نہیں بچے۔ نیز دیدنی کلیسیا میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو درحقیقت ایمان نہیں لائے اور جنہوں نے حقیقی توبہ نہیں کی۔ اس لئے کلیسا ہمیشہ غیر مکمل بلکہ ناقص ہوتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ رسولوں کے خطوط کی نصیحت یہ ہے "جو ہونے کے لئے تم بلائے گئے ہو وہی بنو۔"

بعض اوقات کلیسیا کسی نہ کسی ملک میں ایسی ناقص ہو جاتی ہے کہ روح القدس کی سکونت گاہ ہونے کے بجائے وہ جائے لعنت ہو جاتی ہے۔ پاک کلام ہم کو سکھاتا ہے کہ مقامی کلیسیاؤں کا مٹ جانا ممکن ہے۔ (مکاشفہ ۲-۵) اسی طرح سے خدا کی بادشاہی اسرائیلی کلیسیا سے لے لی گئی۔ (متی ۲۱-۴۳)

۶۔ ایک معنی میں کلیسیا اُن لوگوں کی برادری ہے جو مسیح پر ایمان رکھتے ہیں اور "مسیح میں" ہیں۔ ان لوگوں کے فرائض اور حقوق مسیح سے صادر ہیں۔ یا یوں کہیں کہ وہ مسیح کی بخشش ہیں۔ کلیسیا کا سر دسردار خداوند یسوع مسیح ہے اور مسیح کے حقوق شاہی حقوق ہیں۔ شرکا کے حقوق مسیح کے حقوق کے ماتحت ہیں۔ بلکہ کلیسیا کے خادمان دین کے حقوق بھی شاہی حقوق کے ماتحت ہیں۔ از روئے زمانہ وازروئے ترتیب کلیسیا اپنے شرکا سے پہلے ہے۔ اسی نے کلام الٰہی کو محفوظ رکھا اور اسی کی تعلیم سے مسیحی ایمان لانا سیکھتا ہے۔ اور اسی کی شرکت میں وہ یہ طاقت حاصل کرتا ہے۔ جس سے ایمان پر قائم رہے اور اس کو عمل میں لائے۔

اس لئے دو باتیں ضروری ہیں۔ اول یہ کہ کلیسیا کی خدمت کرتے وقت اس کے افراد کو فراموش نہ کریں ورنہ وہ نقصان اٹھائیں گے۔ اور کلیسیا کمزور ہو جائیگی۔ اور نہ ہمارے مذہب میں انفرادیت ہونی چاہیئے۔ ورنہ کلیسیا کی شراکت جاتی رہیگی اور وہ اپنے فرائض ادا نہ کرسکے گی۔

۷۔ دعائے عام کی کتاب میں بتایا گیا ہے (مسائلِ دین نمبر ۱۹) کہ "مسیح کی ظاہری کلیسیا مومنین کی ایسی جماعت ہے جس میں خدا کا خالص کلام سنایا جاتا ہے اور سکرامنٹ سب ضروری لوازمات کے ساتھ مسیح کے ضابطہ کے بموجب درستی سے عمل میں آتے ہیں"۔ اگرچہ عالمگیر کلیسیا کی بہت سی شاخیں ہیں۔ تاہم تقریباً سب میں یہ باتیں پائی جاتی ہیں۔ پاک کلام کا علانیہ پڑھا جانا اور اس کی منادی۔ تقرر شدہ اور باقاعدہ خادمانِ دین جن کے تقرر کی یہ نیت ہوتی ہے کہ وہ کلیسیائے جامع میں مسیح کے کلام اور سکرامنٹوں کے خادم ہوں۔ ہر اتوار کو عبادت کرنا تاکہ دنیا پر ظاہر ہو۔ کہ خداوند مسیح مردوں میں سے جی اٹھا ہے بپتسمہ اور عشائے ربانی کے سکرامنٹ اور کلیسیائی سیاست۔ کلیسیا کا انحصار اس بات پر ہے کہ یسوع مسیح اور خدا میں یگانگی ہے۔ اور اُس نے صلیب پر جان دی۔ پھر جی اٹھا اور اس نے صعود فرما کر اپنے ایمانداربندوں پر روح القدس نازل کیا اور کرتا رہتا ہے۔ جس سے مسیحی تجربہ متواتر تازہ ہوتا ہے۔ کلیسیا کا تواتر طرح طرح کا ہے (۱) گناہوں کی معافی۔ روحانی طاقت اور ایک دوسری کی شراکت کا تجربہ (۲) مسیحی بشارت کی خدمت جاری رکھنا۔ (۳) مسیحی تعلیم قائم رکھنا (۴) خادمانِ دین کا سلسلہ وار باقاعدہ مقرر ہونا۔ (دیکھو فصل چہارم۔ باب ۱۰) لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ نئے عہد نامہ میں خادمانِ

دین کے سلسلہ وار تقرر کا ذکر پانا دشوار ہے۔

۸۔ کلیسیا بجنسہ ایک ہے پر فی زمانہ ظاہری طور پر منقسم ہے۔ یہ کلام الٰہی کی تعلیم کے خلاف ہے۔ اور اس کے اسباب کا یہاں ذکر کرنا ضروری نہیں۔ (دیکھو فصل چہارم اور فصل پنجم) نیز وہ رسولی ہے۔ اس کی تعلیم۔ اس کے سکرامنٹ۔ اس کی عبادت۔ اس کی سیاست۔ اس کی بشارتی خدمت اور کسی نہ کسی طرح سے اس کے خادمان دین کی خدمت سب رسولوں کے وقت سے چلے آئے ہیں۔ وہ کیتھولک بھی کہلاتی ہے۔ اس لفظ کے کئی معنی ہیں ۱۔ عالمگیر۔ ۲۔ پورا ایمان رکھنے والا اور پوری تعلیم سکھلانے والا۔ ۳۔ پرانے خیالات اور انتظام قائم رکھنے والا یعنی سکرامنٹوں پر اور تواریخی اسقفی سلسلہ پر زور دینے والا۔ تمام کلیسیائیں دعویٰ کرتی ہیں کہ ہم عالمگیر کلیسیا میں شامل ہیں اور رسولی ایمان اور تعلیم قائم رکھتے ہیں اور عام طور پر یہ دعویٰ درست ہے۔ لیکن بعض کلیسیائیں سکرامنٹوں پر بہت زور نہیں دیتیں اور اسقفی سلسلہ کو ضروری نہیں سمجھتیں۔ (دیکھو چوتھی اور پانچویں فصلیں)

۹۔ کلیسیا کا اختیار اور سیاست دنیاوی نہیں۔ حالانکہ مشرق میں کلیسیا نے اکثر ملکی حکومت سے قریبی رشتہ قائم کیا یہاں تک کہ بعض اوقات ایک سرکاری محکمہ معلوم ہوتی تھی۔ اور مغرب میں کلیسیا نے بار بار دنیاوی حکومتوں کے نمونہ پر عمل کر کے اپنی سیاست دنیاوی نمونہ پر بنائی اور دنیاوی بادشاہوں اور حاکموں کی مدد سے زبردستی کر کے بدعت کو دور کرنے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ بدعتی اشخاص قید کئے گئے بلکہ ان کو ایذا پہنچائی گئی اور بہت سے آدمی

قتل بھی کئے گئے ۔ ایسے ایسے طریقے غلط ہیں۔ بلکہ مسیح اور اس کے رسولوں کی تعلیم سے بہت دور۔ کلیسیا کا اختیار اس بات پر موقوف ہے کہ خداوند یسوع مسیح کے وعدہ کے موافق روح القدس کلیسیا کی ہدایت کرتا ہے۔ جب کبھی کلیسیا اور اس کے ہادی خلوص نیت سے شخصی مقصدوں کو بالائے طاق رکھ کر روح القدس کی ہدایت کے لئے دعا کرتے ہیں، تو ان کو وہ ہدایت ملتی ہے چاہے وہ ہادی انفرادی اشخاص ہوں یا کمیٹیاں۔ لیکن بہت دفعہ ایسا بھی ہوا ہے۔ کہ کلیسیا کے پیشواؤں نے گویا اپنی خود غرضی اور انسانی خواہشوں سے صلاح و مشورہ کیا۔ ایسے موقعوں پر کلیسیا غلط راہ پر چلنے لگتی ہے بلکہ گناہ میں مبتلا ہوتی ہے اور اس کا اختیار باطل ٹھہرتا ہے۔ بہر حال کسی مسیحی کا ہلکے طور پر اپنی کلیسیا کے قاعدوں اور فیصلوں سے غفلت کرنا یا اُن کے خلاف چلنا اکثر گناہ میں داخل ہوتا ہے۔

آخر کار یہ بات مدِنظر رہے کہ کلیسیا کا بادشاہ خداوند یسوع مسیح ہے۔ کلیسیا کی بنیاد مسیح اور مسیح کی تعلیم اور اس کا کام ہے۔ کوہِ کلوری کو ہمیشہ یاد رکھنا پڑتا ہے، ورنہ کلیسیا مسیح کی دی ہوئی نجات اور اس کی شفاعت کو بھول جاتی ہے۔ اور وہ بدلتے بدلتے اور بگڑتے بگڑتے انسانی جماعت بن جاتی ہے۔

فصل دوم
کلیسیا۔ ظاہر اور مخفی

۱۔ کلیسیا نہ صرف خدا کی بنائی ہوئی جماعت ہے بلکہ انسانی جماعت بھی ہے۔ اس لئے شروع ہی سے ظاہری کلیسیا میں ایسے بھی لوگ شامل ہوئے ہیں، جو حقیقی ایماندار نہیں۔ یہ آج کل کا تجربہ ہے جیسا ہر پاسبان اور کلیسیا کا ہر عہدہ دار جانتا ہے۔ بلکہ ممکن ہے کہ پاسبانوں اور عہدہ داروں میں بھی کچھ ایسے اشخاص ہوں جو حقیقی مسیحی نہیں۔ نیز یہ بات نئے عہدنامہ سے بھی ظاہر ہے (مرقس ۔۳۔ ۱۹، اعمال ۔۵۔ ۱۔ سے ۱۱ تک، ۲۔کرنتھیوں ۱۱۔ ۲۶، ۱۔کرنتھیوں ۔۵۔۱۔، فلپیوں ۔۳۔ ۱۸۔ ۱۹، وغیرہ)۔ حقیقت یہ ہے کہ "خداوند اپنوں کو پہچانتا ہے،" (۲تمتھیس ۔۲۔ ۱۹) اور ہم آدمی نہیں جانتے۔ اس لئے ایک معنی میں کلیسیا مخفی ہے یعنی حقیقی کلیسیا ان لوگوں کا مجموعہ ہے جن کو خدا نے بُلایا اور چُنا اور جو وفادار رہے ہیں۔ ان کو خدا کے سوا اور کوئی پورے طور پر نہیں جانتا۔ ان کے نام برّہ کی کتاب حیات میں لکھے ہیں۔ (مکاشفہ ۔۲۱۔ ۲۷) ان میں سے جو اب تک روئے زمین پر ہیں اکثروں کے نام کلیسیا کی فہرستوں میں بھی لکھے ہیں ۔

باوجودیکہ کلیسیا متفرق شاخوں میں منقسم ہے پر مخفی طور پر ایک ہے۔ جو اس کے حقیقی شرکا رہیں وہ کلیسیائے واحد کے شرکا ہیں۔ حالانکہ خدا ہی جانتا ہے کہ وہ کون کون ہیں۔ خدا کے چنے ہوئے لوگ مخفی کلیسیا کے شرکا ہیں۔ کلیسیا نہ فقط ایک ظاہری انجمن یا جماعت ہے جس کو انسانوں نے قائم کیا، اور جس پر تواریخ

کے واقعات کا اثر پڑا، یہاں تک کہ وہ ان واقعات کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے، بلکہ تمام برگزیدوں کی جماعت ہے۔ اس کا ایک حصہ روئے زمین پر روحانی جنگ کر رہا ہے اور دوسرا فتحیاب ہوکر آسمان پر گیا ہے۔

۲۔ لیکن اتنا کہنا کافی نہیں، ورنہ کلیسیا ایک غیر مجسّم روح کی مانند ہوتی اور ہم اس کو دنیا میں نہ پہچان سکتے۔ امر ضروری ہے کہ کلیسیا جو مسیح کا بدن ہے۔ ظاہری بھی ہو گویا مجسّم ہو۔ کلیسیا "ایک عجیب اور مُقدّس بھید ہے پر دنیا میں ظاہر ہے"۔ حالانکہ ہر ایک جو ظاہری کلیسیا میں شریک ہے وہ اصلی کلیسیا میں شریک نہیں۔ یہ بھید ہم پر طرح طرح سے ظاہر ہوتا اور تاثیر کرتا ہے۔ اس کے متعلق اور اس کے اندر پاک نوشتے، پاک رسوم، اور سکرامنٹ جو اندرونی روحانی حقیقتوں کے نشان اور وسائل ہیں مسیحی خدمت کے پاک اعمال، پاک عبادتیں، پاک عمارتیں، پاک موسم اور دن وغیرہ سب موجود ہیں۔ ان کے ذریعہ سے خدا کا شاہانہ فضل پھیلایا جاتا ہے۔ مسیحی کلیسیا شراکت بھی ہے اور انتظامیہ انجمن بھی۔ پس جیسا اوپر مذکور ہو چکا ہے۔ (فصل اول) "ظاہری کلیسیا مومنین کی ایسی جماعت ہے، جس میں خدا کا خالص کلام سنایا جاتا ہے اور سکرامنٹ سب ضروری لوازمات کے ساتھ مسیح کے ضابطہ کے بموجب درستی سے عمل میں آتے ہیں۔" (دعائے عام۔ مسائل دین ۱۹) وہ تو خود اور اس کے رسوم اور لوازمات "مٹی کے برتن" (۲۔کرنتھیوں۔۴۔۷) ہیں۔ پر ان میں آسمانی خزانہ ہے۔

یہ گمان کرنا کہ کلیسیا، اُس کے سکرامنٹ، اُس کی عبادت، اُس میں پاک

کلام کی منادی، اس کی شراکت، دین میں محض مددگار ہیں غلط ہے۔ ہم انسان کے لئے جو روح و جسم دونوں سے مرکب ہیں یہ خود دین ہیں۔

۳ ۔ یہ بھی سچ ہے کہ اگر ظاہری کلیسا مخفی کلیسیا کا مجسمہ ہے تو اس کی زندگی خداداد زندگی ہے۔ اُس میں روح القدس کی تاثیرات ظاہر ہوتی ہیں۔ اس کے اکثر شرکا ایماندار ہیں اور گناہوں کی معافی اور مسیحی محبت کا تجربہ کرتے اور خدا کی خوشخبری کی بشارت دیتے ہیں۔ "روح کی یگانگی" اور روح القدس کی شراکت " وہ یگانگی اور شراکت ہیں جو خدا کا روح پیدا کرتا ہے اور وہ باہمی مسیحی خدمت، مریضوں کی دیکھ بھال، غریبوں، بیواؤں اور یتیموں کی خدمت وغیرہ میں ظاہر ہوتی ہیں۔ ان سے خدا کی مرضی پوری ہوتی ہے۔

۴ ۔ یونانیوں اور رومیوں نے کلیسیا کو نقصان پہنچایا ہے۔ جب یہودیوں نے مسیح کو رد کیا تب بھی ممکن تھا کہ اُس کے جی اُٹھنے کی خبر پاکر ایمان لاتے پر حالانکہ ہزاروں ایمان لائے تو بھی اکثر رد کرتے رہے۔ بلکہ ہوتے ہوتے مسیحیوں کو اپنی جماعت اور عبادت خانوں سے خارج کیا۔ چنانچہ مسیحی پرانے عہدنامہ سے جس کو وہ الہامی تو مانتے تھے غفلت کرنے لگے۔ اب بھی ہند میں بہت سے مسیحی صرف نئے عہدنامے کی کتابیں پڑھتے ہیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ مسیحی کلیسیا پر پہلے یونان اور پھر روم کا اثر پڑا۔ یونانیوں سے بڑھ کر کوئی قوم عقلمند کبھی نہ ہوئی۔ یونانیوں نے مسیحی دین کو جیسا مسیحی مانتے تھے؛ زیادہ عالمانہ بنایا اور خدا کی محبت اور ارادہ کو کسی قدر فراموش کر دیا۔ نیز مسیحی چال چلن پر زور کم دیا گیا، اور صحیح عقیدوں پر زیادہ۔ رومیوں کی خاصیت

یہ تھی کہ وہ قانون دانی اور حکمرانی میں یکتا تھے۔ اور مغربی کلیسیا میں قوانین پر زیادہ زور دیا گیا، اور مسیحی دین نئی شریعت بن گیا نیز کلیسیائی حکومت اور سیاستِ دُنیا آلودہ ہوئیں۔ اب تک عبرانیوں کا میلان جو خدا کے ارادہ اور اس کی راستی اور دلی ایمان کی طرف ہے مسیحی کلیسیا پر کافی اثر نہیں کرتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ظاہری کلیسیا میں انسانی باتوں کی زیادہ آمیزش ہے۔

پرانے زمانہ کی اسرائیلی کلیسیا ایک اُمت تھی۔ بنی اسرائیل تو انفرادی ذمہ داری کو بعض اوقات بھول جاتے تھے، اور نبی نے اُن کو یاد دلایا کہ اُمت میں داخل ہونا کافی نہیں بلکہ ہر فرد بشر خود اپنے کاموں کا ذمہ دار ہے (یرمیاہ ۳۱۔ ۲۹۔ اور ۳۰، حزقی ایل ۱۸) لیکن بہت سے مسیحی بھول جاتے ہیں، کہ مسیحی دین انفرادی نہیں۔ وہ "بدن کو نہیں پہچانتے" (۱۔ کرنتھیوں ۱۱۔ ۲۹) خاص کر وہ ظاہری کلیسیا کی قدر نہیں کرتے اور خیال کرتے ہیں کہ آدمی کا دین اُس کے اور خدا کے درمیان ایک رشتہ ہے اور یہ نہیں یاد رکھتے کہ مسیحی دین سے وہ رشتہ بھی مراد ہے جو ایماندار ایک دوسرے سے رکھتے ہیں۔

۵۔ اکثر مسیحی یہ مانتے ہیں کہ ظاہری کلیسیا میں خداوند مجسم ہے حالانکہ دیدنی کلیسیا غیر مکمل بلکہ ناقص ہے۔ پاک کلام صاف طور پر بتاتا ہے کہ کلیسیا مسیح کا بدن ہے (۱۔ کرنتھیوں ۱۲، افسیوں ۱۔ ۲۲۔ ۲۳، ۴۔ ۱۲ سے ۱۶ تک) کلیسیا کے وسیلے سے مسیح اس کو روح القدس بخش کر دُنیا میں کام کرتا ہے۔ پر اگر کلیسیا ایمان میں کمزور ہو کر دُعا اور خدمت میں سُست ہو جاتی ہے، تو محض برائے نام دکھاوے کے لئے مسیح کا بدن ہوتا ہے۔

۶۔ الغرض زمان و مکان کی اس دُنیا میں ضرور ہے کہ مخفی کلیسیا ایک ظاہری کلیسیا میں مجسّم ہو۔ خُدا کی یہ مرضی پاک کلام ظاہر کرتا ہے اور نیز یہ تواریخ اور متواتر تجربہ سے بھی ظاہر ہے کہ کلیسیا دُنیا میں مسیح کا کام کرے اور ظاہری کلیسیا انجیل کی بشارت دے۔ اپنے شرکا کے لئے روحانی طاقت کا ذریعہ ہو، خُدا کی عبادت کرے اور دُنیا کو سُدھارے۔ ان باتوں کا مفصّل بیان اگلی فصل میں ملیگا۔

فصل سوم

کلیسیا کے فرائض

۱۔ جب لوگوں سے دریافت کیا جاتا ہے، کلیسیا کے کیا فرائض ہیں ہم تو بہتیرے کہتے ہیں بشارت یا دُنیا کا سُدھار۔ لیکن جو یہ کہتے ہیں وہ بھول جاتے ہیں کہ جب کبھی فرائض کا سوال ہوتا ہے تو سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئیے کہ خدا تعالیٰ کے لحاظ سے کیا کیا فرائض ہیں۔ کلیسیا کے تین مقاصد ہیں (۱) خدا کے لحاظ سے، عبادت (۲) اپنے شرکا کے لحاظ سے اُن کی پاسبانی (۳) دُنیا کے لحاظ سے بشارت اور سُدھار۔

عبادت خُدا کا حق ہے یہ نہیں کہ خُدا کو کسی چیز کی کمی ہے۔ بلکہ اس نے پاک کلام میں عبادت کا حکم دیا اور چاہتا ہے کہ انسان اس کی صحبت میں رہے اور اس کی رفاقت و قربت حاصل کرے کیونکہ وہ بنی آدم سے محبّت رکھتا ہے۔ نیز کلیسیا کے دیگر فرائض صرف اُس وقت پورے کئے جاسکتے ہیں، جبکہ وہ الٰہی

طاقت حاصل کرے۔ اور یہ صرف عبادت سے حاصل ہو سکتی ہے۔ چاہیئے کہ ہم خدا کی رفاقت کے طالب ہوں اور اُس سے طاقت پائیں لیکن ہم عبادت محض اِس لئے نہ کریں کہ اُس سے ہم کو فائدہ ہوتا ہے۔ ایسی غرض خود غرضی میں داخل ہے۔ ہم اپنے لئے اور اپنے مقاصد پورے کرنے کے واسطے خُدا کی عبادت نہ کریں۔ خُدا کی عبادت ہم پر اس لئے فرض ہے کہ خدا عبادت کے لائق ہے۔ اور اس کی عبادت بذاتہ ایک مقصد ہے۔ حالانکہ بڑی جماعت کے ساتھ حمدُ تعریف کرنا اور عبادت میں شریک ہونا نہایت اچھا ہے۔ تو بھی تھوڑے سے آدمیوں کا عبادت کرنا اس بات سے بدرجہا بہتر ہے کہ خدا کی عبادت نہ کی جائے۔

نیز وہ کلیسیائیں جو خدا کی عبادت کی قدر کرتی ہیں اپنے دیگر فرائض ادا کر سکتی ہیں۔ ہند میں پنچ ذات والے لوگ جو مسیحی ہو گئے ہیں، اُن اطراف میں زیادہ ترقی پذیر ہوئے ہیں، جہاں انھوں نے صحیح خُدا کی عبادت کرنا سیکھا ہے۔ عبادت سے کلیسیا خدا کے نزدیک پہنچتی ہے۔ عبادت طرح طرح کی ہوتی ہے۔ لیکن عبادت کا بہترین مرکز عشائے ربانی ہے۔ کالون چاہتا تھا کہ ہر اتوار کو پاک شراکت عمل میں آئے۔ لیکن لوگوں نے عام طور پر اسے نہیں مانا۔ عبادت میں مناجات اور پاک کلام کی تلاوت اور وعظ بھی شامل ہیں لیکن خاص بات یہ ہے کہ کُل جماعت اور اُس کا ہر فرد خدا کی عظمت، پاکیزگی، قدرت اور محبت نیز اپنی ادنیٰ حالت کو مانے اور خُدا کی طرف اپنا دل اُٹھائے۔

۲۔ کلیسیا اپنے شرکا کے لئے ذمّہ دار ہے کہ اُن کی حفاظت کرے۔ اُن میں مسیحی طبیعت اور سیرت پیدا کرے۔ اُن کو اپنے پاک دین کے مسائل سکھائے

اُن کو نجات کا کلام سُنائے ۔ خاص کر کم لکھے پڑھے اور بچّوں کو تعلیم دینا اس کا فرض ہے ۔ کلیسا کے اندر بچّے کلیسیا کی آئندہ بہبودی اور ترقّی کی بنیاد ہیں ۔ اگر جماعت میں بچّے مسیح کی محبّت اور مسیحی ایمان نہیں سیکھتے اس کا حشر ہولناک ہوگا اور اس کے مٹ جانے کا بڑا اندیشہ ہے ۔ خداوند یسوع مسیح نے خود ان لوگوں کی سخت ملامت کی ہے، جو بچّوں سے بے پرواہ یا اُن کی ٹھوکر کا باعث ہوتے تھے (مرقس ۹ - ۴۲) اور جو کلیسیا بچّوں سے غفلت کرتی ہے وہ اُن کو دُنیا پھندوں میں پھنسنے دیتی ہے، اور یوں ان کو ٹھوکر کھلاتی ہے ۔ بے شک بچوں کی تربیت کرنا والدین پر فرض ہے لیکن کلیسیا کا یہ بھی کام ہے کہ والدین کو ان کے فرائض سکھائے اور انھیں پورا کرنے کی متواتر ترغیب دیتی رہے ۔

اس بات کا اندیشہ ہر وقت رہتا ہے کہ مسیحی لوگ دُنیا دار اور منکر اور بُت پرست لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے اُن کا سا چال چلن اختیار کریں ۔ اپنے بیٹوں کے لئے اُن کی بیٹیاں لیں اور اپنی بیٹیاں اُن کے بیٹوں کو دیں ۔ جس کا نتیجہ یہ ہو کہ کلیسیا میں اور دُنیا میں کوئی فرق نہ رہے لیکن بہت سے گرجاؤں میں وعظ کے ذریعہ لوگوں کو ان آزمائشوں کے خطرے سے آگاہ نہیں کیا جاتا ۔ لوگوں کو نجات کی ضرورت، اور ان کو دُنیا، شیطان، اور نفس کی بُرائیوں سے آگاہ کرنا امر ضروری ہے ۔ ورنہ وہ نجات کے طالب نہ ہوں گے ۔

نیز جب مسیحی شہر کا بُرائی میں مُبتلا ہو جاتے ہیں تو بعض اوقات سیاست کی ضرورت ہوتی ہے ۔ سیاست کے دو مقاصد ہیں (۱) کلیسیا کی پاکیزگی (۲) گنہگار کی اصلاح اور نجات ۔ کبھی کبھی اس بات کی ضرورت پڑتی ہے، کہ گمراہ

مسیحی عشائے ربانی کی شرکت سے معطل کیا جائے۔

الغرض کلیسیا کا دوسرا بڑا فرض اس کے شرکا کی حفاظت ہے۔

(۳) یہ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں کلیسیا نوحؑ کی کشتی کی مانند ہے۔ یہ ایک معنی میں درست ہے لیکن پورے طور پر نہیں۔ کلیسیا میں دنیا کی برائی اور جھگڑے بکھیڑے سے پناہ ملتی ہے۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ مسیحی کو دنیا سے الگ رہنا چاہیئے (یوحنا ۱۷۔ ۱۵، ۱۔کرنتھیوں ۵۔ ۱۰) ہمیں دنیا سے علیحدہ نہیں بلکہ دنیا سے بے داغ رہنا چاہیئے۔ (یعقوب ۱۔ ۲۷) لیکن دنیا کے لحاظ سے کلیسیا کے ایسے ایسے فرائض ہیں جن کو اس کے شرکا صرف دنیا کے اندر پورا کر سکتے ہیں۔ مسیح کا بدن ہونے کے سبب سے کلیسیا اس کا وسیلہ ہے، جس سے وہ دنیا میں کام کرتا ہے۔ کلیسیا اپنے ہی زور سے کچھ نہیں کر سکتی۔ جب تک کلیسیا اپنے ایمان، اپنی خود انکاری، اپنی دولت اپنی یگانگی پر بھروسا رکھتی ہے، اس کے تمام کام محض انسانی ہوتے۔ اور دیگر انسانی کاموں اور انتظاموں کی طرح ناقص ہوتے ہیں جن کا انجام ناکامیابی ہے۔ کلیسیا کا فرض ہے کہ نجات کا پیغام (جو میل ملاپ کا پیغام بھی ہے) دنیا کو سنائے یعنی وہ شخصی طور پر جس میں تمام شرکا حصہ لیں) مسیح کی گواہی دیں۔ اور یہ گواہی گفتگو سے، نیک کاموں سے اور دنیا کی خدمت کرنے سے ہوتی ہے۔ یہ امر ضروری ہے کہ جو لوگ نجات کا پیغام سناتے ہیں وہ خود نجات یافتہ ہوں۔ جو کوئی خداوند یسوعؑ کی گواہی دیتا ہے ضرور ہے کہ وہ خود مسیح کے کاموں کا تجربہ جانتا ہو۔

پر اگرچہ کلام سنانا امر ضروری ہے، جس کے بغیر دنیا میں مسیح کی خدمت

نہیں کرسکتی تو بھی کلیسیا کے فرائض اسی پر ختم نہیں۔ غریبوں اور لاچاروں، مریضوں، بیواؤں اور یتیموں کی مدد کرنا لازمی ہے۔ تواریخ اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ دنیا میں کلیسیا ہی نے اسپتال، کوڑھی خانے، یتیم خانے وغیرہ شروع کئے اور حالانکہ اس وقت شائستہ ملکوں میں سرکار ان کو چلاتی ہے، لیکن صدیاں تک جب دُنیا کی سرکاریں ان سے غافل تھیں تو کلیسیا ہی نے ان کاموں کو جاری رکھا۔ نیز تعلیم میں بھی کلیسیا نے بادشاہوں اور ملک کے والیوں کو راہ دکھائی ہے۔

بعض مسیحی یہ نہیں پہچانتے کہ مسیحیوں کو ملکی معاملوں میں حصّہ لینا چاہیئے۔ جب ملکی معاملات دنیاداروں پر چھوڑ دیئے جاتے ہیں تو بہت سی غلطیاں پیدا ہوتی ہیں، اور طرح طرح کی بے انصافی، رشوت اور ظلم وغیرہ نمودار ہوتے ہیں۔ مسیحی کو ووٹ دینا چاہیئے اور اس بات کی بھی ضرورت ہے، کہ مسیحی اشخاص موقع ڈھونڈھ کر دکھائیں کہ مسیحی سرکاری ملازم، ملک کے وزیر وغیرہ کس طرح اپنے فرائض منصبی کو انجام دیتے ہیں۔ اسی میں دُنیا کے سُدھرنے کی امید ہے۔ حالانکہ دنیا کا پورا سُدھار اس وقت ہوگا، جب دنیا مسیح کو مان لے گی، اور اس کے باشندے ایماندار مسیحی بن جائیں گے۔

میل ملاپ کا پیغام نہ فقط یہ ہے کہ انسان کو خُدا سے میل ملاپ حاصل کرنا چاہیئے، بلکہ یہ بھی کہ بنی آدم آپس میں میل ملاپ رکھیں۔ اس لئے نہایت ضروری ہے کہ مسیحی لوگ آپس میں میل ملاپ رکھیں۔ اگرچہ فی زمانہ کلیسیا ظاہری طور پر منقسم ہے تو بھی جب متفرق کلیسیا کے مسیحی آپس میں محبّت ظاہر کرتے ہیں تو

اس تقسیم کے بُرے نتیجے بہت کچھ مٹ جاتے ہیں۔

۴۔ اپنے فرائض پورا کرنے کے لئے کلیسیا کے پاس تین اوزار ہیں۔ (۱) کلام (۲) سکرامنٹ اور اور عبادتیں (۳) خدمت۔ فرائض کی ادائیگی میں کلام الٰہی بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور کلیسیا کے تمام کاموں کے لئے وہ ایک ناگزیر کسوٹی ہے۔ کلیسیا کو چاہیئے کہ بار بار پاک کلام کی تعلیم سے اپنے کاموں کو جانچے ورنہ اس کے کام پر خدا کی برکت نہیں ہوگی۔ تواریخ گواہی دیتی ہے کہ بعض اوقات کلیسیا نے لوگوں کو دُنیاوی فائدوں کا سبز باغ دکھا کر ان کو مسیحی بنانے کی کوشش کی یا دُنیاوی جبر سے مسیحی دین کا اقرار کرنے پر مجبور کیا یا بدعت اور بدعتیوں کو دنیاوی سزاؤں سے دور کرنے کی کوشش کی۔ یہ سب باتیں مسیحی دین کے خلاف ہیں۔

پھر اگر کلیسیا اور اس کے شرکا رعبادت سے غافل ہو جائیں گے۔ تو اُن کی قوت جاتی رہے گی۔ کامیابی کے لئے لازم ہے کہ کلیسیا کے شرکا رپاک کلام کی تلاوت، خدا کی عبادت، خاص کر پاک شراکت اور دُنیا کی خدمت کو مدِنظر رکھیں۔ دُنیا کی خدمت کلیسیا پر اس غرض سے فرض ہے کہ مسیح نے خود اس کا نمونہ دکھایا تھا۔ اگر لوگ ایمان لائیں تو از یں چہ بہتر لیکن ہمیں اولاً اُن کی ضرورت، اُن کی تکلیف اور مصیبت، اُن کی لاچاری کو مدِنظر رکھتے ہوئے اُن کی خدمت کرنا چاہیئے (اعمال ۱۰-۳۸)

۵۔ کلیسیا کی اندرونی زندگی محبت، عبادت اور شراکت ہے۔ اور ان سے اُس کی روحانی طاقت قائم رہتی ہے۔ یہاں تک کہ اُس کے شرکا دنیا میں

ایسی مسیحی زندگی بسر کر پاتے ہیں، جس کا نیک اثر اس دُنیا پر پڑتا ہے۔ دُنیا تو خدا کی ملکیت ہے پر وہ بگڑی ہوئی ہے، اور خدا سے دور ہے بلکہ اُس کی مخالف ہو گئی ہے۔ باوجود اس کے خدا اُس سے محبت رکھتا ہے (یوحنا ۳-۱۶) مسیحی کو گنہگاروں پر ترس کھانا اور اُن سے محبت رکھنا چاہیئے۔ دُنیا کی بُرائی سے نفرت رکھنا اور اس کے لوگوں سے محبت رکھنا ہر مسیحی کا فرض ہے۔ کلیسیا کی کمزوری کا ایک سبب یہ ہے کہ اُس کے شرکا اپنی محبت محض اپنی مقامی کلیسیا تک محدود رکھتے ہیں اور جو باہر ہیں اُن کی بُری حالت کی بہت کم پروا کرتے ہیں۔

جب مسیحی دُنیا کی بُرائی سے بے پروا ہوتا ہے تو وہ قائن کی مانند بنتا ہے جس نے کہا "کیا میں اپنے بھائی کا محافظ ہوں" (پیدائش ۴-۹)۔ ہر اسرائیلی پیدائشی طور پر اُمت میں داخل ہوتا تھا پر اس کا یہ نتیجہ نہ تھا کہ اس کی شخصی نجات ضروری تھی۔ مسیحی پاک بپتسمہ کے ذریعہ سے نئے اسرائیل یعنی کلیسیا میں جو خدا کا گھرانا ہے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن ضرور ہے کہ وہ اپنے نجات دہندہ کے نقش قدم پر چلے۔ اس کے لئے خدا اپنے پاک روح سے اُسے طاقت اور قابلیت بخشتا ہے۔ پر جو مسیحی ان فرائض سے غافل رہتے ہیں وہ خدا کو رنج پہنچاتے اور اپنے آپ کو نجات سے محروم رکھتے ہیں۔ مسیح نے کلیسیا کے لئے اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دیا تاکہ کلیسیا جلال والی کلیسیا ہو یعنی خدا کا جلال ظاہر کرے۔ یہ خدا کے کام انجام دینے سے ہوتا ہے۔

۶۔ کلیسیا اور خدا کی بادشاہی ایک ہی نہیں۔ کیونکہ خدا کی بادشاہی یا آسمان کی بادشاہی سے خدا کی حکومت مراد ہے۔ قدیم زمانے میں یہ خیال

کیا جاتا تھا کہ کلیسیا خدا کی بادشاہی ہے لیکن پہلی چار مسیحی صدیوں میں نہیں ۔ اگر یہ مانا جائے کہ کلیسیا خدا کی بادشاہی ہے تو چند تمثیلوں کے سوا وہ مضامین جن میں خدا کی بادشاہی کا ذکر ہے زیادہ مشکل معلوم ہوں گے ۔ لیکن جب ہم بادشاہی سے حکومت یا عملداری یا کبھی کبھی طرزِ حکومت سمجھتے ہیں تو بادشاہی کی تعلیم صاف ہو جاتی ہے ۔ " خدا کی بادشاہی کو فلاں سے تشبیہہ " دینے سے یہ مُراد ہے کہ خدا فلاں طریقہ سے حکومت کرتا ہے ۔ " آسمان کی بادشاہی میں داخل ہونا " خدا کی اطاعت قبول کرنا اور اس کی رعایا میں شمار کیا جانا ہے ۔ پس جن تمثیلوں میں بادشاہی کا ذکر ہے ، اس کو کلیسیا کے معنیٰ میں نہیں لینا چاہیئے

کلیسیا کا خدا کی بادشاہی سے یہ تعلّق ہے کہ وہ بادشاہی کے آنے کا وسیلہ ہے ۔ کلیسیا کے فرائض کا مقصد یہ ہے کہ خدا کی بادشاہی آجائے اور اندرونی اور بیرونی فرائض دونوں کا یہی مقصد ہے ۔ ہم دعا کرتے ہیں " تیری بادشاہی آئے " اور اس کا پہلا مطلب یہ ہے " تیری بادشاہی مجھ میں اور کلیسیا میں آئے ۔ تو میرے اوپر اور کلیسیا کے اندر حکمران ہو ۔ " اگر ایسا ہوگا تو کلیسیا خدا کی بادشاہی کو نزدیک لانے کا لائق ذریعہ بن جائے گی ۔

فصل چہارم

کلیسیا کی حکومت اور اس کے خادمانِ دین

۱ ۔ عام طور پر مسیحی کلیسیا کی شاخوں میں ایسے ایسے اشخاص پائے جاتے

ہیں۔ جو کلیسیا میں خدا کے کلام کی منادی کرتے اور اُس کی تعلیم دیتے ہیں۔ دیگر مسیحیوں کی دیکھ بھال کرتے، خاص خاص رسموں کو ادا کرتے اور عام عبادت کے ہادی ہوتے ہیں اور خاص طور پر کلیسیا کی حکومت اور سیاست میں حصّہ دار ہوتے ہیں۔ یہ خادمانِ دین کہلاتے ہیں۔ بعض فرقے بار بار برپا ہوتے ہیں؛ جو کوشش کرتے ہیں کہ کلیسیا کے کاموں کو خادمانِ دین کے بغیر چلائیں۔

خادمانِ دین کی کیوں ضرورت ہے ؟ اوّل لازم ہے کہ کلیسیا کے اندر ایسے اشخاص ہوں جو کلام الٰہی کا خاص علم حاصل کریں اور جن کو دنیاوی کاموں سے اتنی فرصت ہو کہ کافی وقت پاک کلام کی تلاوت میں صرف کر سکیں تاکہ کلیسیا کو اُس کا صحیح مطلب سکھا سکیں۔ نیز جب کلیسیا کے شرکا کا شمار بڑھ جاتا ہے، تو ان کی دیکھ بھال غریبوں اور بیماروں کی جسمانی اور خاص کر روحانی مدد میں اتنا وقت لگتا ہے کہ خادمانِ دین کے بغیر ان کاموں کو انجام نہیں دیا جا سکتا ہے۔

نیز کلیسیا کے سب شرکا مل کر تنظیم اور ترتیب کے ساتھ اس کی کہانت کے کاموں کو خاص کر پاک شراکت بپتسمہ اور استحکام کو انجام نہیں دے سکتے۔ بلکہ خاص اشخاص کو ان کاموں کے لئے مقرر کرنا پڑتا ہے۔ کرنتھیوں کے نام کے پہلے خط کے گیارھویں باب میں ہم دیکھتے ہیں کہ جب کوئی خادمِ دین نہیں ہوتا، تو کیسی بے ترتیبی اور بُرائیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس لئے قریب قریب شروع ہی سے "بزرگ" مقرر ہوتے تھے جو خادمِ دین کا کام کرتے تھے۔ (اعمال۔ ۱۴۔ ۲۳۔ وغیرہ)

۲۔ خداوند یسوع مسیح نے کلیسیا کے طرزِ حکومت کے بارے میں کوئی مفصل انتظام نہیں کیا لیکن رسولوں کو چن کر مقرر کیا اور اُن میں پطرس کو صدر پاسبان بنایا۔ (یوحنا۔ ۲۱۔ ۱۳۔ سے ۱۷۔ تک، متی۔ ۱۶۔ ۱۸) رسولوں نے روح القدس کی ہدایت سے کلیسیا میں بزرگ اور خادم (اعمال۔ ۶۔ ۵) مقرر کئے۔ وعدہ یہ ہے کہ روح القدس کلیسیا کی ہدایت کرے گا (یوحنا۔ ۱۴۔ ۲۶۔ ۱۵۔ ۲۶ + ۱۶۔ ۸۔ سے ۱۴ تک) اور اس لئے کلیسیا کو اختیار تھا کہ اپنا انتظام خود قائم کرے۔

نوٹ: ۔ کلیسیائے روم بتاتی ہے کہ متی ۱۶۔ ۱۸ میں مسیح نے پطرس کو دنیا میں اپنا قائم مقام بنایا۔ واقعی شمعون پطرس نے کلیسیا کے قائم کرنے میں اور اُس کی ہدایت میں بڑا حصہ لیا بلکہ شروع میں سب سے بڑا حصہ لیکن بائیبل میں کہیں پتہ نہیں چلتا کہ وہ رسولوں کا سردار تھا۔ یعقوب اور پولس کے حصے اس کے برابر معلوم ہوتے ہیں۔ نیز کہیں اس بات کا پتہ نہیں ملتا کہ پطرس کا اختیار روم کے بشپ کو ملے گا۔ یہ دعویٰ کہ وہ بشپ جس کو پوپ کہتے ہیں، پطرس کا قائم مقام اور مسیح کا خاص نمائندہ ہے از روئے بائیبل بے بنیاد ہے۔ اگر کلیسیا کا یہ یا کوئی اور انتظام ضروری ہوتا تو یقیناً اس کی ہدایت کلامِ الٰہی میں ہوتی۔

۳۔ جیسا اوپر مذکور ہو چکا رسولوں نے بزرگ مقرر کئے۔ تمتھیس کے خطوں سے ظاہر ہے کہ یہ نگہبان بھی کہلاتے تھے۔ (نیز دیکھو اعمال۔ ۲۰۔ ۱۷۔ اور ۲۸)

افسوس کی بات ہے کہ نئے عہد نامہ کی کتابوں کے لکھے جانے کے بعد کچھ عرصہ تک جو کتابیں کلیسیا کے اندر لکھی گئیں۔ اُن میں سے اکثر جاتی رہیں۔ یہاں تک کہ اُن کا پتہ ہی نہیں۔ روم کے کلیمینٹ اور اگنیشیس (Ignatius) کے خطوط کو چھوڑ کر باقی سب جاتی رہیں۔ یہاں تک کہ ہمیں پتہ نہیں ملتا کہ کون کونسی کتابیں لکھی گئیں۔ کلیمینٹ خادمانِ دین اور عام شرکا میں فرق قائم کرتا ہے۔ اگنیشیس بشپ، پریزبیٹر اور ڈیکن (نگہبان۔ بزرگ اور خادم) کا ذکر کر کے دکھاتا ہے کہ ان میں فرق تھا علاوہ ازیں وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ مقامی کلیسیا میں بشپ کی صدارت امر ضروری ہے تاکہ اتحاد قائم رہے۔ کلیمینٹ نے غالباً قریب قریب ۹۵ء میں اپنے خط لکھے اور اگنیشیس نے قریب بیس برس بعد لکھا۔ پس ظاہر ہے کہ پہلی صدی کے آخر کے قریب خادمانِ دین کلیسیا میں ایک خاص درجہ رکھتے تھے اور بشپ۔ پریزبٹر اور ڈیکن الگ الگ درجہ رکھتے تھے۔ بہرحال ہم کو معلوم نہیں کہ یہ کس طرح ہوا کہ تیس۳۰ چالیس۴۰ برس کے اندر پریزبٹروں میں سے جو پیشتر نگہبان یا بشپ کہلاتے تھے ایک خاص مقامی بشپ مانا گیا۔ اندازہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالباً پریزبٹروں میں سے ایک شخص عشائے ربانی کے ادا ہوتے وقت صدر ہوتا تھا۔ اور چونکہ یہ ایسا شخص ہوا کرتا تھا جو اوروں پر فوقیت رکھتا تھا، یہ دستور قائم ہوا کہ اس کی صدارت دائمی ہو۔ پھر وہی تھوڑے عرصہ میں دیگر خادمانِ دین کا تقرر کرنے لگا۔ اگرچہ شروع میں تقرر کا کام بزرگوں کے ہاتھ میں تھا (۱۔ تمتھیس ۴۔ ۱۴)۔ پرانے زمانہ کے بعض عالموں مثلاً جیروم اور خرسستم (Jerome & Chrysostom) نے بشپوں کو خاص درجہ

کے خادم نہیں بتلاتے۔ حالانکہ بعض نے ان کو خاص درجہ کا بتایا (پر بعض کہتے ہیں کہ یہ پریزبٹر ہیں جس کو عمر بھر کے لئے خاص عہدہ دیا گیا اور بعض یہ کہ بشپ ہی پورا پریزبٹر ہے)

۴۔ مسیحی کلیسیا یہودی کلیسیا کی قائم مقام ہے اور وہ کام جو دینِ یہود کے مذہبی پیشوا اور خادمانِ دین کرتے تھے، اُن کو مسیحی خادمانِ دین کو بھی انجام دینا چاہیئے۔ دینِ یہود کے خادمانِ دین کاہن، نبی اور فقیہ تھے پاسبانی کا کام خاص طور پر کاہنوں کے سپرد تھا۔ (یسعیاہ ۵۶۔ ۱۱، یرمیاہ ۲۳۔ ۱۔ سے ۴ تک، حزقی ایل ۳۴۔ ۲ سے ۱۰ تک) تعلیم دینا فقیہوں کا کام تھا۔ چنانچہ مسیحی خدمت کاہنی، پاسبانی، نبوی اور تعلیمی ہونا چاہیئے۔ کہانت کُل ایمانداروں کا عہدہ ہے (۱۔ پطرس۔ ۲۔ ۵۔ اور ۹) لیکن اس کو باقاعدہ اور باترتیب انجام دینے کے لئے خاص اشخاص مقرر ہوتے ہیں۔ کاہن کا کام قربانی چڑھانا (حمد و شکر کی روحانی قربانی) مذہبی رسوم کو عمل میں لانا اور شفاعت کرنا ہے۔ سب مسیحی اور اُن کے خادمانِ دین خاص طور پر مسیح کی حقیقی شفاعت کا واسطہ دے کر مناجاتیں پیش کرتے ہیں۔

خداوند یسوع مسیح نے خاص طور پر پاسبانی پر زور دیا (یوحنا ۲۱۔ ۱۵۔ سے ۱۷ تک، ۲۰۔ ۲۳) اور اس کے رسولوں نے بھی ایسا ہی کیا (۱۔ پطرس ۵۔ ۲، اعمال ۲۰۔ ۲۸، نیز دیکھو تمتھیس اور ططس کے نام کے خطوط) خادم اس بات کا ذمہ دار ہے کہ اپنے لوگوں کی نگہبانی اور حفاظت کرے۔ تاکہ وہ راہِ راست سے بھٹک نہ جائیں اور غلط تعلیم، بُرے نمونوں اور شیطان، دُنیا

اور نفس کے پھندوں سے بچیں۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی پاسبانی امر ضروری ہے ۔ (یوحنا ۲۱-۱۵) یہ پاسبانی کام ایسا ضروری ہے کہ خداوند یسوع خود سردار چوپان کہلاتا ہے (عبرانیوں ۱۳-۲۰ ۔ ۱ ۔ پطرس ۵-۴) اور بعض کلیسیاؤں میں خادمانِ دین عموماً پاسبان کہلاتے ہیں (دیکھو نذ بور اور گیت حصہ D.4 ۱۹۳۲ء)

پھر خادمانِ دین کو نبوت کرنا یعنی خدا کی مرضی مسیحیوں اور غیر مسیحیوں پر ظاہر کرنا ہے۔ خدا اپنی مرضی اپنی کلیسیا پر ظاہر کرتا ہے، اور اس کے خادم وعظوں میں اُس کو پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ ہر خادم دین کو یہ کام سپرد نہ بھی ہو تو بھی جس کلیسیا میں ایسے واعظ نہیں جو نبوی خدمت کریں۔ وہ کلیسیا کمزور ہو جاتی ہے بلکہ بشارت کا کام نبوی کام ہے۔

تعلیم وعظوں میں اور نیز چھوٹے چھوٹے ٹولوں اور انجمنوں میں اور گھروں میں (اعمال ۲۰-۲۰) دین کی باتیں سکھانا خادمِ دین کا ایک ضروری کام ہے۔ اور وہ الٰہیات اس طور پر سکھائے کہ چال چلن اور روزمرہ کی زندگی سے اُن کا تعلق ظاہر ہو۔ گھر گھر جا کر لوگوں کی مشکلوں اور مصیبتوں، اُن کی اُمیدوں اور فکروں اور اُن کے خیالات سے واقفیت حاصل کرنا نہ صرف پاسبانی کام کا ایک بڑا حصہ ہے، بلکہ تعلیم سے خاص تعلق رکھتا ہے۔ کیونکہ جب تک خادمِ دین نہ صرف اپنے لوگوں کی صورت سے بلکہ اُن کے خیالات سے واقف نہ ہو وہ ان کو ایسی باتیں نہیں سکھا سکتا، جن کے جاننے اور معلوم کرنے کی اُن کو خاص ضرورت ہے۔

۵ - خادمانِ دین مسیح کی بخشش ہیں (افسیوں ۴-۸ سے ۱۶ تک)

چنانچہ یہ امر ضروری ہے کہ خدا ہی آدمیوں کو خادمِ دین ہونے کے لئے بُلائے۔
چنانچہ تقرر کی ترتیبوں میں اکثر اُس شخص سے جو خادمِ دین ہونا چاہتا ہے ایک
قسم کا سوال کیا جاتا ہے "کیا تجھ کو بھروسا ہے کہ تیرے دل میں روح القدس
نے یہ تحریک کی ہے کہ تو اس عہدہ اور خدمت کو اختیار کرے؟" نیز کلیسیائی
اتحاد کی تجویزوں میں اکثر اس قسم کے جملے مندرج ہیں کہ "یہ اصول ضروری ہے
کہ جو شخص خادمِ دین ہونا چاہے اس کے دل میں الٰہی بلاہٹ کا احساس ہو۔"
کیونکہ جس کو خدا نے نہیں بُلایا اس کے بارے میں ہمارا خداوند یوحنا کی
انجیل کے دسویں باب میں فرماتا ہے "جو کوئی دروازہ سے بھیڑ خانہ میں داخل
نہیں ہوتا بلکہ اور کسی طرف سے چڑھ جاتا ہے وہ چور اور ڈاکو ہے . . . . دروازہ
میں ہوں" خُدا کی بُلاہٹ نہایت ضروری ہے بلکہ کلیسیا کے ہر عہدہ کے بارے
میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ کلیسیا میں ہر قسم کا اختیار خدا ہی کی طرف سے آتا ہے۔
اور درحقیقت وہی کلیسیا کے ہر عہدہ دار کو بُلاتا ہے۔ یہ بُلاہٹ بعض اوقات
کلیسیا کے ذریعہ سے ہوتی اور بعض اوقات اندرونی ہوتی ہے۔

بہرحال یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص غلطی سے سمجھے کہ خدا نے مجھے کلیسیا کا
عہدہ دار (خاص کر خادمِ دین) ہونے کے لئے بُلایا ہے۔ پس کلیسیا کو لازم ہے
کہ دُعا کے ساتھ بُلاہٹ کو جانچے۔ جب جانچنے کے بعد اُمیدوار لائق اور سچا
اور خدا کا بُلایا ہوا ثابت ہوتا ہے تو کلیسیا کے مقررہ نمائندے اُس پر ہاتھ
رکھ کر اس کا تقرر کرتے ہیں۔ اسقفی (بشپ والی) کلیسیاؤں میں بشپ کا اس
عبادت میں صدر ہونا ضروری ہے۔ پر تقرر کلیسیا کی طرف سے ہوتا ہے۔

اور دو باتوں کا نشان ہے (۱) کلیسیا پہچانتی ہے کہ خدا نے فلاں آدمی کو خادمِ دین ہونے کے لئے بلایا ہے (۲) کلیسیا خدا سے دعا کرتی ہے کہ وہ اُس شخص کو اپنی طرف سے مقرر کرے اور اُسے وہ فضل اور فضیلتیں عنایت کرے جن کی اُسے ضرورت ہوگی۔

[اکثر کلیسیاؤں میں صرف تقرر شدہ خادمانِ دین کو سکرامنٹوں کو عمل میں لانے کی اجازت ہے۔ (دیکھو باب ہفتم)]

چونکہ تقرر کلیسیا کا کام ہے اس لئے منقسم کلیسیا میں ہر خادم دین کا تقرر غیر مکمل ہوتا ہے لیکن اگر تقرر کے وقت نیت یہ ہو کہ خادم دین جس کا تقرر ہوتا ہے، کلیسیائے جامع میں مسیح کے کلام اور سکرامنٹوں کے لحاظ سے خادم دین ہو تو اس کا تقرر جائز ماننا چاہیئے۔

بعض مسیحی خاص کر کلیسیائے روم کے علما اسقفی تقرر کو لازمی مانتے ہیں۔ اور اور علما سمجھتے ہیں کہ یہ بہترین تقرر ہے حالانکہ وہ یہ نہیں کہتے کہ تمام دیگر تقرر ناجائز ہیں۔

۶ - کلیسیا کی حکومت کی تین خاص قسمیں ہیں۔ اسقفی (Episcopal) خادمی (Presbyterian) جماعتی (Congregational)۔ کلیسیائے روم اور بعض مشرقی کلیسیاؤں کو چھوڑ کر اکثر موجودہ کلیسیاؤں کے انتظام میں مذکورۂ بالا تینوں عناصر پائے جاتے ہیں۔

اسقفی انتظام یہ ہے کہ بشپ اپنے علاقہ میں منتظم ہو۔ وہ ہر بات کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ حالانکہ وہ دیگر عہدہ داروں کو اپنی مدد کے لئے مقرر بھی کر سکتا ہے۔

خادمی انتظام یہ ہے کہ مقامی کلیساؤں کے نمائندے مل کر کلیسیا کا انتظام کرتے ہیں اور فی زمانہ خادمانِ دین کے ساتھ کلیسیا کے دیگر عہدہ دار اس کام میں حصہ دار ہوتے ہیں۔

جماعتی انتظام یہ ہے کہ ہر مقامی کلیسیا یا جماعت خود اپنا انتظام کرتی ہے، اور بالکل خود مختار ہوتی ہے۔

بہرکیف اکثر موجودہ کلیساؤں کا انتظام مخلوط ہے، مثلاً ہند، پاکستان برما اور لنکا کی کلیسیا میں بشپ ہیں جن کا اختیار ان کے علاقوں میں وسیع ہے۔ اور بشپوں کا ایک صدر ہے (Metropolitan) نیز ہر علاقہ (Diocese) میں ایک مجلس ہے جس میں خادمانِ دین اور دیگر نمائندے شریک ہوتے ہیں اور تمام کلیسیا کے لئے ایک عام مجلس ہے۔ پھر ہر مقامی کلیسیا کی ایک کمیٹی ہے جو کلیسیا کے قواعد و قوانین کے دائرے کے اندر اور اپنے خادمِ دین اور خاص کر بشپ کی ہدایت سے مقامی انتظام کرتی ہے۔

علیٰ ہذا القیاس ہم اور کلیساؤں میں بھی ایسا انتظام پاتے ہیں، جس میں مذکورۂ بالا عناصر ملے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ حالانکہ ہر انتظام میں کسی نہ کسی عنصر پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

۷۔ بعض لوگ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ کلیسیا کے خادمانِ دین کا سلسلہ رسولوں سے چلا آیا ہے۔ پر اُن میں سے بعض بشپوں کے سلسلہ پر زور دیتے ہیں اور بعض سمجھتے ہیں کہ پریسبٹروں کا سلسلہ زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شروع میں پریسبٹروں کا ہاتھ رکھنا اہم تھا۔ تمیتھیس کا

تقرر ایسا ہی ہوا اور معلوم ہوتا ہے کہ جب انطاکیہ کی کلیسیا نے برنباس اور ساؤل کو بشارتی خدمت کے لئے مقرر کیا، تو بزرگوں نے ان پر ہاتھ رکھے (۱ تمتھیس ۴: ۱۴، اعمال ۱۳: ۳)۔ آخرکار تقرر کا کام بشپوں کے ہاتھ میں آگیا حالانکہ اکثر پریزبٹران کے ساتھ اس کام میں شامل ہوتے رہے۔

بہرحال اگرچہ یہ بات اہم ہے کہ شروع ہی سے تقرر کا سلسلہ چلا آیا ہے، تو بھی اس سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ کلیسیا کے ایمان، عبادت، بشارت اور خدمت کا سلسلہ قائم رہا کیونکہ اگر یہ منقطع ہو جاتا تو خادمانِ دین باطل کلیسیا کے خادم ہوتے۔ (دیکھو۔ باب ہشتم)۔ جب ہم کلیسیا کی متفرق شاخوں کو دیکھتے ہیں تو ہم پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ خدا نے سب کو اپنے کام میں استعمال کیا۔ سب گنہگاروں کو توبہ تک پہنچانے، مقدسوں کو ترقی دینے، دُنیا کی خدمت کرنے اور پاک کلام کو پھیلانے کے کام میں روح القدس کی مدد سے کامیاب ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ (حالانکہ انسان کلیسیاؤں کے فرقوں کو بڑا اور اہم سمجھتے ہوں تو بھی) خدا نے اِن کے سبب سے کسی کو اپنے فضل سے محروم نہیں رکھا۔ غالباً اگرچہ یہ فرق کسی قدر اہم ہے تو بھی ایسا اہم نہیں جیسا اکثر مسیحی خیال کرتے ہیں۔

۸۔ تمام ایمانداروں کی کہانت سے خادمانِ دین کے عہدہ اور کام کا کیا تعلق ہے؟ بعض لوگ اس مسئلہ کا یہ مطلب نکالتے ہیں کہ ہر ایماندار کلیسیا کے ہر عہدہ کے کام کو انجام دے سکتا ہے لیکن یہ نتیجہ غلط ہے۔ اول تو یہ تجربہ کے خلاف ہے۔ دوم یہ پاک کلام کی تعلیم کے بھی خلاف ہے۔ ۱۔ کرنتھیوں کے بارہویں باب سے صاف ظاہر ہے کہ کلیسیا کے اندر طرح طرح کے عہدے

اور کام ہیں۔ اور یہ سب ضروری اور سب قابلِ عزت ہیں۔ بے شک یہ درست ہے کہ دینِ عیسوی میں قومیت اور نسل کی کوئی تخصیص نہیں جس کے سبب سے بعض قوموں اور خاندانوں کے لوگ خادمانِ دین ہو سکتے اور بعض نہیں۔ ہر قوم اور نسل کے آدمی خادمِ دین ہو سکتے ہیں۔ (دینِ یہود میں صرف ہارون کی نسل کے مرد اور ہندو دھرم میں صرف برہمن یاجک ہو سکتے ہیں)

اگر یہ سوال کیا جائے کہ آیا عورتیں خادمانِ دین ہو سکتی ہیں تو غالباً جواب یہ ہے کہ از روئے علم الٰہی کوئی رُکاوٹ نہیں، لیکن دنیا کے اکثر ملکوں کی موجودہ حالت میں یعنی فی زمانہ ماحول کے سبب سے اب تک عملی رُکاوٹیں مانع ہیں۔ (کلیتیوں ۳: ۲۸ موزوں حوالہ ہے)

تمام ایمانداروں کی کہانت کا یہ مطلب ہے کہ کلیسیا کاہنوں کا شاہی فرقہ ہے اور اُس کا ہر شریک بوساطت یسوع مسیح کے خدا کے حضور آ کر انسانی کاہن کے بغیر اُس سے دعا کر سکتا ہے۔ ہر شریک کا حق ہے اور ہر ایک پر فرض ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنی دولت اور لیاقتوں کو زندہ قربانی ہونے کے لئے نذر گذارے اور نیز بشارتی خدمت میں حصّہ لے۔ پھر خدا نے اپنی خدمت کو تمام کلیسیا کے سُپرد کیا۔ اور اگرچہ تقرر شدہ خادمان دین خاص طور پر اُس کو اور اس کے چند حصّوں کو انجام دیتے ہیں تو بھی وہ نمائندوں کے طور پر ایسا کرتے ہیں، جو تمام کلیسیا کی طرف سے ہیں۔ اور خدمت خادمانِ دین ہی کی نہیں اور نہ وہ کلیسیا سے الگ ہو کر اُسے انجام دے سکتے ہیں۔

کلیسیائی خدمت جس میں سب اپنی اپنی لیاقت اور بلاہٹ کے موافق

حصہ دار ہو سکتے ہیں طرح طرح کی ہے۔ پاک کلام کی منادی اور بچوں اور بالغوں کو اس کی تعلیم دینا، کلیسیا کی حکومت اور انتظام میں حصہ لینا، غریبوں یتیموں، بیواؤں وغیرہ کی خدمت، تمدنی باتوں میں خدمت ("سوشل سروس")، نوجوانوں کی دیکھ بھال وغیرہ وغیرہ۔ نیز یہ سمجھنا کہ خادمانِ دین کی خدمت بذاتہٖ اعلیٰ اور افضل ہے پاک کلام کی تعلیم کے خلاف ہے۔ (۱-کرنتھیوں -۱۲، رومیوں -۱۲: ۳ سے ۸ تک + افسیوں -۴: ۱۱ سے ۱۳ تک)

نوٹ :- جن اشخاص کا ذکر اعمال کے چھٹے باب میں ملتاہے، حالانکہ وہ بعض وقت ڈیکن کہلاتے ہیں، توبھی ان کا کام اُسقفی کلیسیاؤں کے ڈیکنوں کی مانند نہ تھا یعنی پریزبٹر کی مدد کرنا، وعظ کہنا اور اپنے آپ کو پریزبٹر ہونے کے لئے تیار کرنا۔ بہرحال غیر اُسقفی کلیسیاؤں خاصکر بپٹسٹ اور کانگریگیشنل کلیسیاؤں کے ڈیکنوں کا کام اُن سات شخصوں کے کام سے ملتا جلتا ہے۔ یعنی کلیسیا کی مالی اور جسمانی خدمت کرنا۔ چنانچہ اُن سات خادموں کا تعیّن دورِ حاضرہ کے کسی قسم کے خادم دین کے تعیّن یا تقرر کی مثال نہیں ہے۔

فصل پنجم

کلیسیا کی تقسیم اور اتحاد

۱- اگرچہ مسیحی لوگ "ایک پاک عالمگیر کلیسیا (کیتھولک کلیسیا)" پر ایمان

رکھتے ہیں تو بھی فی الحال کلیسیا منتفرق بلکہ مختلف شاخوں میں منقسم ہے۔ بیشک بعض کلیسیائیں دعویٰ کرتی ہیں کہ ایک ہی حقیقی کلیسیا ہے۔ اور باقی تمام "کلیسیائیں" دراصل پھوٹ کے گناہ کی مرتکب ہیں اور کلیسیا سے خارج۔ خاص کر کلیسیائے روم اور "مشرقی" کلیسیا جو اپنے آپ کو اورتھوڈاکس کہتی ہے (یعنی صحیح تعلیم رکھنے والی) دعویٰ کرتی ہیں۔ بہر حال صحیح تعلیم یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ ایک ہی عالمگیر کلیسیائے جامع ہے جس کے اندر پھوٹ پڑ گئی ہے۔ یعنی کلیسیا کی وہ سب شاخیں جو رسولوں اور نکایہ کے عقائد ناموں کو مانتی ہیں، کلیسیائے جامع کے اندر ہیں۔

بہر حال حالانکہ از روئے تاریخ کلیسیا کی شاخوں کا برپا ہونا سمجھ میں آتا ہے، اور یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ ہر تقسیم میں طرفین سے غلطیاں ہوئی ہیں۔ تواریخ شاہد ہے کہ الٰہی حسن انتظام سے تقسیم کا یہ اچھا نتیجہ نکلا کہ سچائی کا کوئی ضروری پہلو مفقود نہ ہوا۔ بعض اوقات معمّا یہ درپیش تھا کہ اگر اتحاد کو قائم رکھیں تو حق کا خون ہوتا تھا۔ پس دو برائیوں میں سے کمتر برائی کو انتخاب کرنا امر ناگزیر تھا۔

جب یہ مانا جائے کہ پھوٹ کلیسیائے جامع کے اندر ہے تو یہ اُمید پیدا ہوگی کہ کلیسیا دوبارہ ایک ہو سکتی ہے۔ اگر یہ رسالہ ۱۸۵۲ء میں لکھا جاتا، تو اس میں کلیسیا کی شاخوں کا تو ذکر ہوتا، پر غالباً کلیسیا میں از سر نو اتحاد پیدا ہونے کی اُمید نہ کی جاتی۔ لیکن ۱۹۱۰ء سے لے کر جب ایڈنبرا (Edinburgh) میں بہت سی کلیسیاؤں کی ایک کانفرنس منعقد

ہوئی آج تک بہت ترقی ہوئی ہے۔ بہرکیف پہلے کلیسیا کی شاخوں پر نظر ڈالیں۔

۲۔ کلیسیا کے قائم ہونے کے تھوڑے برس بعد پھوٹ کا امکان پیدا ہوگیا (اعمال ۱۱-۱۵ سے ۱۸ تک ۱۵: گلتیوں ۱- کرنتھیوں) پر خدا کے فضل اور رسولوں کی مسیحی طبیعت کے سبب سے کلیسیا بچ گئی۔ اس کے بعد اگرچہ چند بدعتی کلیسیائیں قائم ہوئیں تو بھی کوئی بڑی پھوٹ واقع نہ ہوئی لیکن روم کا پوپ یعنی بشپ ہوتے ہوتے زیادہ اختیار کا دعویٰ دار ہوتا گیا۔ مغربی کلیسیا نے نکایہ کے عقیدے میں یہ الفاظ بڑھائے "اور بیٹے سے" (Filioque) یعنی اب وہ جملہ یوں ہوگیا۔

"وہ (روح القدس) باپ اور بیٹے سے صادر ہے" اس سے پہلے اور مشرق میں اب تک یوں پڑھا جاتا ہے "وہ باپ سے صادر ہے"۔ افسوس کا مقام ہے کہ پوپ اور مغربی کلیسیا کے علما نے مشرقی بشپوں اور علما سے مشورہ نہیں کیا۔ جھگڑا بڑھتا گیا۔ اور ۱۰۵۴ء میں پوپ لیو نہم (Leo IX) نے مشرقی کلیسیا اور اس کے بشپوں کو کلیسیا سے خارج کرنے کا حکم صادر کیا۔ اس وقت سے مشرقی کلیسیا روم سے الگ رہی ہے اور روم کے پوپ کے اختیار کی منکر ہے۔ جو شخص ان دونوں کلیسیاؤں میں سے کسی کا شریک نہیں غالباً یہ نتیجہ نکالے گا کہ اگر ان دونوں میں سے ایک کو اصلی کلیسیا ماننا پڑتا تو مشرقی کلیسیا کے لئے اپنا ووٹ دیتا۔

۳۔ پندرہویں صدی میں مغربی یورپ میں کلیسیا کی وہ بڑی پھوٹ شروع ہوئی جو اصلاحِ دین (Reformation) کے

نام سے مشہور ہے۔ کلیسیائے روم میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں، اور عرصہ سے ان کے انسداد کی کوشش کی گئی۔ لیکن یہ سب کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ بہت سے اصلاح کرنے والے بدعتی قرار دیئے گئے اور ان کو قید میں ڈالا گیا یا قتل کر دیا گیا۔ سولہویں صدی میں جرمنی کے ایک راہب مارٹن لوتھر نے ایک خاص خرابی کے خلاف منادی کرنا شروع کی۔ روم میں مقدس پطرس کے گرجہ کے بنانے کے لئے روپے کی اشد ضرورت ہوئی اور جو لوگ اس کے لئے روپیہ دیتے تھے، اس کے عوض میں معافی نامے (Indulgences) اُن کے ہاتھ بیچے جاتے تھے۔ لوتھر نے دیکھا کہ یہ بائبل اور کلیسیا کی تعلیم کے خلاف ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں لوتھر یہ سمجھتا تھا کہ پوپ اس "تجارت" کو موقوف کر دیگا پر ایسا نہ ہوا۔ بعد ازاں لوتھر کلیسیا کے رواجوں اور دستوروں کی چھان بین ازروے کلام الٰہی کرنے لگا۔ اور بہت جلد یہ تحریک غیر ممالک میں پھیل گئی۔ جرمنی، ہالینڈ، فرانس، انگلستان، اسکاٹ لینڈ، سوئٹزرلینڈ، ڈینمارک، سویڈن، ناروے اور چند اور ممالک میں یکے بعد دیگرے مذہبی پیشوا برپا ہوئے جنہوں نے کلیسیائے روم کی برائیاں دکھائیں اور اپنے اپنے ملکوں کی کلیسیاؤں کی اصلاح کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً سوئٹزرلینڈ میں جان کالون (Calvin) اسکاٹ لینڈ میں جان ناکس (Knox) وغیرہ۔ بعض ملکوں مثلاً انگلستان اور جرمنی کی بعض ریاستوں میں بادشاہوں نے اس میں بڑا حصہ لیا۔ اکثر ملکوں میں اصلاحِ

دین میں طرح طرح کے ملکی اور دُنیاوی مقصدوں کی آمیزش بھی تھی بہرحال اس کے چند نتیجے نہایت اہم اور عمدہ ہیں۔(۱) کلیسیا کا انتظام دُنیاوی حکومتوں کی مانند ہو گیا تھا مشہور بات ہے کہ روم میں پوپ کے دربار میں رشوت کے بغیر کام نہیں چلتا تھا۔(۲) پاک شراکت کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ خداوند یسوع مسیح کی قربانی دہرائی جاتی تھی۔(۳) نئے عہدنامہ کی یہ تعلیم کہ انسان کو ایمان کے ذریعہ سے نجات ملتی ہے نظر انداز کی گئی۔(۴) مقدس کنواری مریم مسیح اور انسان کے بیچ میں درمیانی ٹھہرائی گئی۔(۵) مُقدسوں سے دعا کی جاتی تھی کہ وہ انسان کے لئے مُناجات کریں۔ پر اس کی بنیاد یہ ہے کہ مقدسین ہماری دُعائیں سُن سکتے ہیں۔ یعنی اُن کی عقل عالمگیر ہے۔ لیکن یہ خدا ہی کی صفت ہے۔ چنانچہ یہ دستور شرک میں داخل ہے۔(۶) کلیسیا عام لوگوں سے روپیہ بہت وصول کیا کرتی تھی۔ (۷) خادمانِ دین شرکا اور خدا کے بیچ میں درمیانی بنائے گئے۔ عام شرکا کو بائبل پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔(۸) عبادت اور رسوم کلیسیا لاطینی زبان میں جس کو عام لوگ نہیں سمجھتے تھے ادا کی جاتی تھیں اور پاک عشا میں عام شرکا پیالے سے محروم کئے گئے۔ ان سب باتوں کی اصلاح ہوئی۔ بعد کو ٹرینٹ کی کونسل نے کلیسیائے روم کی بہت سی باتوں کی اصلاح کی۔ مگر زیادہ دیر میں۔ اُس اثنا میں مغربی دُنیا کی کلیسیا متفرق کلیسیاؤں میں منقسم ہوئی۔ زیادہ تر اس کی وجہ یہ تھی کہ لوتھر اور کالوِن کے کام کے شروع میں اُس زمانہ کے پوپ نے کسی قسم کی اصلاح منظور نہ کی۔

ملک ملک میں اصلاح نے ایک ہی صورت نہ پائی۔ یہاں تک کہ اُن ملکوں کی کلیسیاؤں میں غیر ضروری فرق پیدا ہوئے۔ اِن باتوں کا مفصّل بیان کلیسیائی تواریخ میں ملے گا۔

اصلاحِ دین کے سبب سے تین خاص قسم کی کلیسیائیں قائم ہوئیں۔ لوتھرن۔ انگلکانی۔ پریزبیٹرین۔ لوتھرن کلیسیاؤں میں سے بعض اُسقفی رہیں۔ مثلاً سویڈین کی۔ دیگر لوتھرن کلیسیائیں غیر اُسقفی رہیں۔ پریزبیٹرین کلیسیاؤں کا انتظام خادمی ہے (دیکھو فصل چہارم)

۴۔ بعد کو جماعتی انتظام کی کلیسیائیں انگلستان میں قائم ہوئیں۔ انگلستان کے بادشاہ ایڈورڈ ششم کے بعد اس کی بڑی بہن میری اوّل ملکہ ہوئی اور اس نے کلیسیائے روم کو دوبارہ قائم کیا۔ اور پراٹیسٹنٹ لوگوں کو ایذا پہنچائی۔ یہاں تک کہ متعدّد اشخاص جن میں چند بشپ بھی شامل تھے آگ سے جلائے گئے۔ بہت سے سوٹزرلینڈ اور ہالینڈ کو بھاگ گئے۔ اور اُن میں بعض یہ خواہش کرنے لگے کہ کلیسیا کی زیادہ بڑی تبدیلی ہو۔ یہاں تک کہ الزابتھ اوّل کے عہد میں کلیسیائے انگلستان میں گڑبڑی پیدا ہونے لگی۔ سترھویں صدی میں انگلستان میں جماعتی انتظام کی کلیسیائیں قائم ہوئیں اُس صدی کے درمیان ملک میں جنگ ہوئی۔ بادشاہ چارلس اول قتل ہوا اور شاہی خاندان بھگا دیا گیا۔ جب چارلس دوم واپس بلایا گیا۔ تو کلیسیائے انگلستان نے اور فرقوں کو ستانا شروع کیا بلکہ کوشش کی کہ اسکاٹ لینڈ میں بھی ایسی ہی کلیسیا قائم ہو۔

نیز بپٹسٹ کلیسیائیں قائم ہوئیں جن کا انتظام جماعتی ہے اور جو یہ مانتی ہیں کہ اطفال کا بپتسمہ غلط ہے۔ (دیکھو باب ہفتم۔ بپتسمہ)

۵۔ اٹھارویں صدی میں جب عام طور پر انگلستان کی تمام کلیسیائیں پژمردہ ہو گئی تھیں، چند لوگوں نے جن میں جان ویسلی، جارج وٹفیلڈ اور چارلس ویسلی (J. Wesley, G. Whitefield, C. Wesley) زیادہ مشہور ہیں اور یہی سب کے پیشوا تھے۔ وہ عام طور پر عبادت خانوں، بازاروں اور کھیتوں میں منادی کرنے لگے اور اس بات پر زور دیتے تھے۔ کہ خدا ہر ایک آدمی سے محبت رکھتا اور اس کی نجات چاہتا ہے۔ نجات ایمان سے ملتی ہے۔ نیز یہ کہ نجات کی دلیل نیک چلنی ہے۔ ان کے کام سے کلیسیائیں بیدار ہونے لگیں۔ کلیسیائے انگلستان پر بھی بڑا اثر پڑا لیکن عموماً اس زمانہ کے بشپ اور خادمانِ دین اس نئی تحریک کے خلاف تھے۔ ویسلی نے عبادت خانے بنوائے، تاکہ ان میں اس کے پیرو (علاقوں کے گرجوں میں ان کو موقع نہیں دیا جاتا تھا) عبادت کے لئے جمع ہو سکیں۔ یہ پیرو میتھوڈسٹ کہلاتے تھے۔ کیونکہ جب ان کے پیشواؤں نے آکسفورڈ میں "باقاعدہ" زندگی بسر کرنا شروع کی تو باقی طلبا ان کے اس طریقہ (Method) سے بیزار ہو کر ان کو طنزاً یہ لقب دیدیا۔ جان ویسلی خود کلیسیائے انگلستان سے جدا نہ ہوا۔ لیکن چونکہ اس کلیسیا کے گرجوں میں ان کو پاک شراکت میں شریک ہونے کا خاطر خواہ موقع نہیں دیا جاتا تھا، اور کلیسیائے انگلستان کے اکثر خادمانِ دین ان کے بشارتی کام کے خلاف رہے، اس لئے ویسلی کی موت کے بعد اس کے پیرو

اُس کلیسیا سے الگ ہو گئے۔

نیز جب جنگ کے بعد ۱۷۸۳ء میں امریکا کی ریاست ہائے متحدہ انگلستان سے الگ ہوئیں تو جان وسیلی نے کوشش کی کہ کینٹربری کے آرچ بشپ امریکا کے لئے بشپوں کی تقدیس کرے پر چند قانونی مشکلوں کی وجہ سے کامیاب نہ ہوا (بعد کو اسکاٹ لینڈ کی اسقفی کلیسیا کے بشپوں کی مدد سے یہ کام کیا گیا) چنانچہ یہ دیکھ کر کہ مسیحیوں خاص کر میتھوڈسٹوں کی پاسبانی اور دیکھ بھال کا کوئی انتظام نہ تھا اور کوئی شخص اُن کے لئے خادمانِ دین کا تقرر نہیں کر سکتا تھا، اور نیز یہ سمجھ کر کہ درحقیقت بشپ اور پریزبٹر میں کوئی ذاتی فرق نہیں۔ جان وسیلی نے ٹامس کوک (Thos. Coke) کو نگہبان یعنی (Superintendent) ہونے کے لئے مقرر کیا اور ہاتھ رکھ کر اُس کا تقدس کیا اور امریکہ کو بھیجا وہاں کوک نے فرانسس آسبری (Asbury) کو بھی نگہبان مقرر کیا۔ اس طرح سے اسقفی میتھوڈسٹ کلیسیا قائم ہوئی میتھوڈسٹوں کی بشارتی خدمت کے سبب سے اب تقریباً تمام دنیا میں میتھوڈسٹ کلیسیائیں قائم ہو گئی ہیں، اور اب پراٹسٹنٹ کلیسیاؤں میں یہ سب سے بڑی شاخ ہے۔ بہت جلد اُن میں اسقفی نظام قائم ہو گیا لیکن یہ نظام پُرانے سلسلہ کا نہیں تھا۔

انیسویں صدی میں ولیم بوتھ نے (Wm. Booth) اس بات سے ناراض ہو کر کہ وسلین میتھوڈسٹ کلیسیا جس کا وہ خادمِ دین تھا، بشارتی خدمت میں سُست ہو رہی تھی الگ فوج کو قائم کیا۔ اور وہ بھی اکثر ملکوں میں

پھیل گئی۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ مکتی فوج سکرامنٹوں سے غافل ہے۔ نیز دوستوں کی انجمن (Society of Friends) جو عام طور پر کویکرز (Quakers) کہلاتے ہیں، اوساٹھارھویں صدی میں جارج فاکس (Fox) کی کوشش سے قائم ہوئی۔ کویکر لوگ سکرامنٹوں کو محض روحانی طور پر مانتے ہیں اور کسی ظاہری رسم کے پابند نہیں۔

یہ کلیسیائی تقسیم کا نہایت غیر مکمل اور مختصر بیان ہے۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں میں لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں کی بنا پر اپنی آبائی کلیسیا سے جُدا ہو کر نئی کلیسیائیں قائم کرنے لگے۔ بلکہ یہ مرض انیسویں صدی تک جاری رہا۔ اسکاٹلینڈ میں پریزبٹرین کلیسیا منقسم ہوئی اور انگلستان اور امریکا میں میتھوڈسٹ کلیسیا کا بھی انقسام ہوا۔

۶۔ بہر حال تقریباً پچاس برس سے مسیحی لوگ جدائی کی بُرائی پہچاننے لگے ہیں۔ کلامِ الٰہی میں یہ بات مُسلّم ہے کہ کلیسیا کو ہر جگہ ایک ہونا چاہیئے اور یہ بھی پہچانا گیا ہے کہ تقسیم خدا کی مرضی کے موافق نہیں۔ چند مُلکوں میں اس کے بارے میں گفت و شنید ہوئی اور کسی قدر کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ ۱۸۷۰ء میں یہ دعویٰ کلیسیائے روم کی طرف سے کیا گیا کہ جب پوپ اپنے عہدہ کی حیثیت میں الٰہیات کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے ہیں، تو یہ غلطی سے محفوظ ہے۔ جب یہ کلیسیائے روم کا ضروری مسئلہ مانا گیا تو جرمنی اور ہالینڈ میں چند جماعتیں جُدا ہوئیں جو اولڈ کیتھولک چرچ کے نام سے مشہور ہیں (Old Catholic Church) کلیسیائے انگلستان

اور ان کے درمیان سمجھوتا ہوا یہاں تک کہ اب وہ ایک دوسرے کے خادمانِ دین اور سکرامنٹوں کو صحیح اور مستند مانتی ہیں۔ نیز سویڈن کی لوتھرن کلیسیا جو اُسقفی ہے اب کلیسیائے انگلستان سے خاص تعلق اور باہمی شراکت رکھتی ہے۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۳ء تک چند انگلکانی نمائندوں نے کلیسیائے روم کے ایک بشپ کارڈنل میرسئے (Mercier) سے گفتگو کی تاکہ معلوم ہو جائے کہ آیا کلیسیائے روم اور کلیسیائے انگلستان میں باہمی شراکت ہو سکتی ہے۔ یا نہیں لیکن اس امر میں کوئی کامیابی نہ ہوئی۔

ممالک متحدہ میں اور نیز امریکا میں میتھوڈسٹ کلیسیا کی چند شاخیں ایک ہو گئیں۔ اور اسکاٹ لینڈ میں پریزبٹرین کلیسیا کے زیادہ حصے ایک ہو گئے کناڈا میں پریزبٹرین، کانگریگیشنل اور میتھوڈسٹ کلیسیائیں مل کر کناڈا کی متحد کلیسیا بن گئیں شمالی ہند میں چند کلیسیائیں۔ پریزبٹرین اور کانگریگیشنل ایک ہو گئیں اور شمالی ہند میں ایک "متحد کلیسیا" قائم ہوئی۔

۱۹۴۷ء میں جنوبی ہند کی کلیسیا قائم ہوئی جس میں ہند، برما اور لنکا کی کلیسیا کے چند علاقے، جنوبی ہند کی متحد کلیسیا اور میتھوڈسٹ کلیسیا (جس کا تعلق انگلستان سے تھا) ایک ہو گئیں۔ اس نئی کلیسیا کے انتظام میں اُسقفی خادمی اور جماعتی عناصر سب پائے جاتے ہیں۔ شروع ہی میں بغیر کسی خاص رسم کے تمام موجودہ خادمانِ دین قبول کئے گئے۔ آئندہ تمام خادمانِ دین کا تقرر اُسقفی ہوگا لیکن تیس برس کے بعد یہ بات فیصل ہوگی کہ آیا آئندہ وہ باہر کے خادمانِ دین جن کا تقرر غیر اُسقفی ہے قبول کئے جائیں گے یا نہیں۔ اس انتظام

سے کلیسیائے انگلستان کے بعض لوگ خوش نہیں ہیں۔ اور اب تک اُس کلیسیا اور اس نئی کلیسیا میں پوری باہمی شراکت نہیں ہے۔

۷۔ فی الحال ایران اور شمالی ہند میں جس کے ساتھ پاکستان بھی شامل ہے، ایک متحد کلیسیا قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اتحاد کی تجویز (Plan of Union) شائع ہو چکی ہے اور اس کے زیادہ اہم حصّے اتحاد کی بنیاد (Basis of Union) کا چند زبانوں میں ترجمہ بھی ہو گیا ہے۔

اِسی کی بنا پر خادم دکھانے کی کوشش کرے گا کہ اتحاد میں کیا کیا خاص مشکلیں درپیش ہیں، اور اِن سے بچنے کے لئے کیا کیا تجاویز کی گئی ہیں۔ کیونکہ غالباً اسی سے تمام باتیں صاف دکھائی دیں گی۔ حالانکہ یہ گفت و شنید ایک محدود علاقہ کے متعلق ہے (اگرچہ وہ کافی وسیع بھی ہے) تو بھی جو اصول زیر بحث ہیں وہ تمام ایسے ایسے مباحثوں میں پیش آتے ہیں جو لوگ ان باتوں سے واقف نہیں وہ یا تو یہ سمجھتے ہیں کہ کلیسیاؤں کا ایک ہو جانا ممکن نہیں یا یہ خیال کرتے ہیں کہ ایسا کام جلد ختم ہو سکتا ہے۔

بعض رکاوٹیں علمِ الٰہی سے بہت کم تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً اُس بڑے عرصہ میں جس میں یہ کلیسیائیں الگ رہتی ہیں اُن کے دستور، اُن کا طرزِ عبادت غرض ان کا تمام اندرونی ماحول جُدا گانہ ہو گیا ہے۔ مثلاً پریزبٹرین گرجہ میں میتھوڈسٹ پاک عشا میں شریک ہوتا ہے تو اُس کو اچھا نہیں لگتا۔ وغیرہ۔ پھر کلیسیاؤں کے عام ممبر کا نہیں چاہتے کہ اُن کی مقامی کلیسیا کا انتظام یا طرزِ عبادت ذرا بھی بدل جائے۔

جو مشکلات علم الٰہی سے متعلق ہیں وہ زیادہ اہم ہیں۔

پہلا سوال عقیدوں کا ہے۔ یہ امر ضروری ہے کہ مسیحی دین کے بڑے بڑے مسئلوں کے بارے میں سب یک رائے ہوں۔ پاک ثالوث، خدا کی وحدانیت، یسوع مسیح کی الوہیت اور انسانیت اور اُس کا دُنیا کا نجات دہندہ ہونا، اس کی تصلیب، قیامت اور صعود، سزا و جزا، ابدی زندگی، گناہوں کی معافی، خُدا کی عدالت، الغرض جو مسائل رسولوں اور نکایہ کے عقیدوں میں مندرج ہیں، اور نیز پُرانے اور نئے عہد ناموں کے نوشتوں کا الہامی ہونا، یہ ایسے ایسے مسائل ہیں کہ وہ کلیسیائیں جو عام طور پر ان پر متفق الرائے نہیں، ایک کلیسیا بن نہیں سکتیں۔

چونکہ متفرق کلیسیائیں علم الٰہی کی نسبت پورے طور پر یکساں اصطلاحات نہیں استعمال کرتیں اس لئے شمالی ہند میں شروع شروع میں اس اتفاق رائے کی بابت کچھ کچھ شک تھا۔ لیکن زیادہ تفتیش پر یہ ظاہر ہو گیا کہ کوئی اصلی اختلاف نہیں۔ جو کلیسیائیں شمالی ہند اور پاکستان میں ایک ہونے کی کوشش کرتی ہیں حسب ذیل ہیں۔ ہند، پاکستان، لنکا اور برما کی کلیسیا (انگلکانی) وہ بپٹسٹ کلیسیائیں جو (انگلستان کی) بپتسمہ مشنری سوسائٹی سے متعلق ہیں، میتھوڈسٹ کلیسیائیں (۲) شمالی ہند کی متحد کلیسیا۔

دوم سکرامنٹوں کا سوال۔ کچھ مباحثہ اور موازنہ کے بعد یہ معلوم ہوا کہ پاک شراکت کے متعلق کوئی بات مانع نہیں حالانکہ بعض کلیسیائیں اور کلیسیاؤں کے اندر بعض لوگ کسی نہ کسی بات پر زیادہ زور دیتے ہیں —

سکرامنٹ کے ادا کرنے کے طریقوں میں خاص فرق ہیں۔ بہرکیف سب اس پر متفق ہیں کہ پاک شراکت کو مسیح نے خود مقرر کیا اور یہ فضل کا وسیلہ ہے، جس کے ذریعہ سے خدا ہم میں کام کرتا ہے اور نیز اس کے عمل میں لاتے وقت وہ اشیا استعمال ہوں جن کو مسیح نے خود مقرر کیا اور وہ الفاظ تقدیس کے وقت پڑھے جائیں جن کو خداوند نے خود استعمال کیا۔ نیز یہ بھی طے ہو گیا ہے کہ صرف وہ لوگ پاک شراکت کو عمل میں لائیں جن کو اس کام کے لئے تقرر ملا ہو۔

بپتسمہ کے بارے میں مشکل یہ ہے کہ بپٹسٹ کلیسیاؤں کے لوگ اطفال کا بپتسمہ ضروری خیال نہیں کرتے بلکہ صرف ایمانداروں کے بپتسمہ (دیکھو باب ہفتم) کو جائز سمجھتے ہیں۔ آخرکار یہ طے ہوا کہ متحدہ کلیسیا کے اندر دونوں طریقے منظور ہوں گے، اور ہر بپتسمہ یافتہ شخص بپتسمہ پانے کے بعد خاص تعلیم پا کر استحکام (یا کسی اور ایسی رسم) سے کلیسیا کی پوری شراکت میں لیا جائے گا۔ نیز انتظام کیا جائے گا کہ ہر مقام میں جو ماں باپ اپنے بچوں کو بپتسمہ دلانا چاہیں وہ ایسا کر سکیں گے۔

سوم۔ کلیسیائی حکومت میں اسقفی، خادمی اور جماعتی عناصر تینوں ہوں گے، اور مقامی کلیسیاؤں کا طرزِ حکومت نہیں بدلا جائے گا۔ جب تک کہ اس پر اتفاق نہ ہو۔ پھر مقامی کلیسیاؤں میں طرزِ عبادت صرف اس وقت بدل دیا جائے گا، جب مقامی کلیسیائیں اس کو منظور کریں۔

چہارم۔ ایک نہایت بڑی مشکل رہ گئی یعنی کس طرح سے تمام کلیسیاؤں کے خادمانِ دین اس لائق سمجھے جائیں کہ ہر جماعت میں پاک شراکت کو

عمل میں لاسکیں۔ اور ہر جماعت کی پاسبانی خدمت کے لئے تعینات ہوسکیں۔ فی زمانہ کلیسائے روم کسی اور کلیسیا کے خادمانِ دین کا تقرر نہیں مانتی اور اگرچہ مشرقی کلیسیا انگلکانی کلیسیا کے تقرر کو غالباً جائز مانتی ہے تو بھی یہ اس شرط کی بنا پر ہے کہ کلیسیائے انگلستان از روئے مسائل وہی باتیں ملنے جو مشرقی کلیسیا مانتی ہے۔ بہر حال کلیسیائے روم اتحاد کے تمام مباحثہ اور مشورہ سے کنارہ کش رہتی ہے۔

جو کلیسیائیں چند ملکوں میں کوشاں ہیں کہ اتحاد پیدا ہو ان میں سے بعض ایک دوسرے کے خادمانِ دین کو یوں ہی قبول کرنے کیلئے تیار رہیں لیکن کلیسیائے ہند، پاکستان، برما اور لنکا یہ کہتی ہے کہ اسقفی انتظام جو حسنِ اتفاق سے یا شاید خدا کی پروردگاری سے اُس میں قائم رہا ہے ایسا ضروری ہے کہ بغیر اس کے وہ دوسری کلیسیاؤں کے ساتھ ایک نہیں ہوسکتی۔ اُس کلیسیا کے تمام خادمانِ دین اور علما یہ نہیں بتلاتے کہ بغیر اس کے کلیسیا نہیں ہوسکتی حالانکہ بعض یہ بھی خیال کرتے ہیں پر سب اس کو متحد کلیسیا کا ضروری عنصر جانتے ہیں۔ ہمارا الفصیل ... یہ ہے کہ اتحاد قائم کرنے کے لئے ہر کلیسیا لازماً اپنی اچھی باتیں نئی کلیسیا میں لائے نیز یہ ظاہر ہے کہ وسیع متحد کلیسیا کے لئے اسقفی عنصر لازمی ہے۔ غرض یہ ہے کہ شروع ہی سے ایسا اسقفی انتظام ہو جو قدیم زمانہ کے اسقفی سلسلہ سے متصل ہو۔ سوال یہ ہے کہ سب خادمانِ دین کا نظام کیونکر ایک بنایا جائے۔

شمالی ہند اور پاکستان میں موجودہ کلیسیاؤں کے تقرر کی بنیاد یکساں نہیں۔ جیسا مشہور ہے انگلکانی کلیسیا میں تقرر اسقفی ہے یعنی تقرر کے وقت

بشپ نئے خادمِ دین پر ہاتھ رکھتا ہے۔ حالانکہ عموماً پریزبٹر بھی اُس کے ساتھ اس کام میں شریک ہوتے ہیں۔ شمالی ہند کی کلیسیا میں خادمانِ دین کا تقرر پریزبٹروں کے ہاتھ رکھنے سے ہوتا ہے اور بعض مانتے ہیں کہ یہ ایک سلسلہ وار نظام کے اندر ہے کیونکہ وہ پریزبٹر اور لشپ کا فرق نہیں مانتے میتھوڈسٹ کلیسیا میں یہ مانا جاتا ہے، کہ جب کسی کلیسیا کو اس لئے قائم کرنا پڑا کہ عقیدہ اور عمل کے ضروری عناصر محفوظ ہوں تو اس کلیسیا کو روح القدس کی ہدایت سے یہ حق حاصل ہے کہ خادمانِ دین کا نظام از سرِ نو قائم کرے۔ جماعتی انتظام ماننے والی کلیسیائیں یہ مانتی ہیں کہ خاص الخاص امر یہ ہے کہ مقامی کلیسیا خادم دین کو اس کا پاسبان ہونے کی دعوت دے۔ اِن سب نظاموں کو بغیر خاص انتظام کے ایک بنانا حقیقت کی نظر اندازی معلوم ہوتی ہے۔

پر ان تمام کلیسیاؤں میں تقرر کی نیت یہ ہے کہ ہر خادمِ دین عالمگیر کلیسیا کے اندر مسیح کے کلام اور ساکرامنٹوں کا خادم بنے۔ اس بنا پر یہ مانا گیا ہے کہ "متحد ہونے والی کلیسیائیں آپس میں ایک دوسری کے خادمانِ دین کی خدمت کو منظور کرتی ہیں کہ یہ مسیح کے کلام اور سکرامنٹوں کے لحاظ سے مسیح کی خدمت میں ہیں۔ حالانکہ ہمارے منقسم ہونے کے سبب سے یہ خدمتیں فی الحال تمام کلیسیا کی نمائندگی کے اعتبار سے غیر مکمل ہیں (دیکھو شمالی ہند اور پاکستان میں کلیسیائی اتحاد کی بنیاد" ملنے کا پتہ:۔ نارتھ انڈیا کرسچین ٹریکٹ سوسائٹی الہ آباد۔ ۱۹۵۱ء)

لیکن اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی ہے، کہ تمام خادمانِ دین کو

اُن کلیساؤں کے ذریعہ سے جن میں وہ اب تک شامل نہیں اختیار ملنا چاہیئے غیر اسقفی کلیساؤں کے خادمِ دین کو یوں اسقفی اختیار دیا جائے گا۔

۱۹۴۴ء میں کلیسا ہند، برما اور لنکا کی جنرل کونسل (General Council) نے تسلیم کیا کہ منقسم کلیسا میں کسی خادمِ دین کا تقرر کامل نہیں۔ پس یہ انتظام تجویز کیا گیا کہ اتحاد قائم کرتے وقت متحد ہونے والی کلیساؤں کے تمام بشپ اور دیگر خادمانِ دین (خاص کر پریزبٹر) دوسری کلیساؤں کے مقررہ نمائندوں کے ذریعہ سے زائد اختیار کے طالب ہوں، اور اُن پر ہاتھ رکھے جائیں۔ ہاتھ رکھتے وقت ذیل کے الفاظ استعمال ہوں گے "چونکہ تو (فلاں) کلیسا کے اندر خدا کی کلیسا کی خدمت کے لئے بلایا گیا اور مقرر ہوا، اور اب متحد کلیسا کے اندر خدا کی کلیسا کی خدمت کے لئے بلایا جاتا ہے، اس لئے خدا تجھکو روح القدس کی طاقت اور اُس کا فضل بخشے تاکہ پریزبٹر کے عہدہ میں زیادہ وسیع خدمت کرے اور اُس میں زیادہ وسیع اور مؤثر خدمت کرنے کے لئے خدا کے کلام کی منادی کرنے کا، میل ملاپ کی خدمت کو انجام دینے کا، اور جن جماعتوں میں تو آئندہ بلایا یا باقاعدہ مقرر کیا جائے اُن میں مسیح کے سکرامنٹوں کو عمل میں لانیکا اختیار ہے۔۔۔۔"
(حوالہ ماسبق)

اُمید کی جاتی ہے کہ اس طور پر "ایسی خدمت مہیا" کی جائے "جو متحد کلیسا کے تمام شرکا کی نظر میں اور جہاں تک ممکن ہو تمام دُنیا میں مستند مانی جائے"۔ یہ بھی صاف طور پر بتایا گیا ہے کہ یہ موجودہ تقرروں پر شک نہیں ڈالتا اور نہ نیا تقرر کرتا ہے۔ اگر اس انتظام پر خدا کی برکت رہے گی تو شاید تمام دُنیا کے

لئے نمونہ ہوگی۔

یہ نہ سمجھا جائے کہ ایسا انتظام محض یہ ہے کہ ہر دو غیر اسقفی کلیسیاؤں کے خادمانِ دین کو اسقفی تقرر مل جائے حالانکہ اُن کو اسقفی اختیار ملے گا۔ یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ اسقفی کلیسیاؤں کے خادمانِ دین کو غیر اسقفی کلیسیاؤں کے ذریعہ سے اختیار ملے۔ اگر یہ اختیار کوئی چیز نہیں تو وہ کلیسیائیں کیوں تقرر کرتی ہیں؟ اور کس بنا پر دعویٰ کر سکتی ہیں کہ ہمارے خادمانِ دین درحقیقت خادمانِ دین ہیں ؟

مذکورۂ بالا عبارت میں نہایت مختصر بیان ہے۔ آج کل بہت سی کتابیں کلیسیائی اتحاد پر لکھی گئی ہیں جن میں سے دو کے نام نیچے مرقوم ہیں۔ یہ رسالہ علم الٰہی کے بارے میں ہے۔ نہ فقط کلیسیائی اتحاد کی بابت۔ اس ایک مضمون کو زیادہ جگہ اور وقت دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

Rawlinson : *Problems of Reunion*
(Eyre and Spottiswode)
Newbigin : *The Reunion of the Church*
(S. C. M. Press)

باب ہفتم

سکرامنٹ اور فضل کے دیگر وسائل

فصل اوّل

تمہید

۱۔ شکرانۂ عام میں جو دعائے عام کی کتاب اور دعاؤں کی اور کتابوں میں درج ہے، جماعت کہتی ہے "ہم ...... فضل کے وسیلوں ...... کے لئے ..... تیرا شکر ادا کرتے ہیں۔" یہ وسیلے کیا کیا ہیں؟ بے شک سکرامنٹ ان میں شامل ہیں۔ اور اگر ہم کہیں کہ سکرامنٹیں وسائل فضل ہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ بہر حال فضل کے اور بھی وسائل ہیں جن سے غافل رہنا روحانی صحت کے لئے نہایت مضر ہے، کیونکہ یہ نہایت ضروری ہیں۔

۲۔ خلوتی دُعا۔ حالانکہ مسیحی دین انفرادی نہیں تو بھی شخصی ہے۔ اس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہر مسیحی برابر خُدا سے خلوت میں دُعا کرے۔" جب

تو دُعا کرے تو اپنی کوٹھری میں جا اور دروازہ بند کرکے اپنے باپ سے جو پوشیدگی میں ہے دُعا کر۔" (متی ۶-۶) شخصی خلوتی دُعا مسیحی زندگی کی ترقی بلکہ اُس کے قائم رہنے کی ایک بنیاد ہے۔ دُعا کرتے وقت دُعا کے ضروری عناصر مدِنظر رہیں اور عمل میں آئیں۔ یعنی۔

نیت :۔ تمہید کے طور پر اپنا دل خدا کی طرف اُٹھانا۔

عبادت :۔ اپنی ادنیٰ حالت اور خدا کی عظمت، محبّت، قدرت اور پاکیزگی کو ماننا۔

اقرار :۔ اپنی جانچ کرکے خُدا کے حضور اپنے گناہوں کو ماننا۔ اُن سے پھرنے کا مصمم ارادہ کرنا اور خدا سے معافی اور توفیق مانگنا۔

شکر گذار :۔ یاد کرکے اور تفصیل کے ساتھ۔

اوروں کے لئے مناجات، اور اپنے لئے مناجات۔

عموماً خلوتی دُعا میں لوگ کمی کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے وہ اُن شخصوں اور کاموں کی فہرست نہیں بناتے جن کے لئے دعا کرنا چاہیئے۔ پولس کا حکم تھا "بلا ناغہ دعا کرو۔" (۱۔ تھسلنیکیوں ۵-۱۷) اس کے لئے امر ضروری ہے کہ شخصی دعائیں مقررہ وقت پر کی جائیں تاکہ ناغہ نہ ہونے پائے۔

۳۔ خاندانی دعا بھی ضروری ہے اور اس کو ٹھیک طور پر عمل میں لانے کے لئے چاہیئے کہ مسیحی دُلہا دُلہن اپنی شادی کے پہلے ایّام سے ساتھ ساتھ پاک کلام کی تلاوت اور دعا کیا کریں۔ خاندانی دُعا کو دو باتیں

بگاڑدیتی ہیں۔ (۱) طول طویل دُعائیں جن پر بچے دھیان نہیں دے سکتے (۲) دُعائیں تکیہ کلام جس سے دعا محض ایک رسم معلوم ہوتی ہے۔ اچھا ہے کہ صاحبِ خانہ چھپی ہوئی دعائیں وقتاً فوقتاً استعمال کیا کرے تاکہ تکیہ کلام سے بچا رہے۔

۴۔ پاک کلام کی تلاوت۔ مسیحی تعلیم کی بنیاد بائبل ہے خاص کر نیا عہد نامہ۔ پر پُرانا عہد نامہ بھی ضروری ہے۔ اچھا ہے کہ ایسی بائبل استعمال ہو جس میں حوالجات ہوں تاکہ جس حصہ کو آدمی پڑھتا ہے بائبل کے جو اور حصے اُس سے متعلق ہیں۔ اُن کو بھی پڑھے۔ بائبل میں خاص بات یہ ہے کہ اس میں نہ فقط دینی تعلیم ہے بلکہ اُس میں خدا کے بڑے بڑے کاموں کا ذکر ہے خصوصاً خداوند یسوع مسیح کے کام، اس کی اذیتیں اور موت، اور اس کی قیامت اور صعود۔

۵۔ عام عبادت۔ اس میں ہم کلیسیا کے دیگر شرکا کے ساتھ مل کر دُعا کرتے، خُدا کی حمد کے گیت گاتے، پاک کلام کو سُنتے، اُس کے بارے میں وعظ سُنتے، اور اپنے مال میں سے کچھ خدا کے لئے نذر کرتے ہیں۔ جو مسیحی عام عبادت سے غفلت کرتا ہے وہ مسیحی شرکت سے بہت کچھ محروم رہتا ہے اور نیز عموماً خدا کے حضور وہ قربانی نہیں گزران سکتا جو گزرانی چاہیئے۔ اس کی روحانی زندگی میں اکثر خود بینی بلکہ خود غرضی پیدا ہو جاتی ہے۔

جب خدا کا کوئی بندہ اس کے کلام کے مطلب کو وعظ میں بیان کرتا ہے، تو اکثر سننے والوں کو ایسی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں یا یاد آجاتی ہیں، جو اُن کو معلوم نہیں یا جن کو وہ بھول گئے تھے۔ نیز خدا نے اپنے بعض بندوں کو یہ فضل عنایت کیا ہے کہ وہ مسیحیوں کو نیکی میں ترقی کرنے، ٹھیک ارادہ کرنے، اور خدا کے حکموں کو ماننے کی

موثر تحریک دے سکتے ہیں۔ بہت لوگ ہیں جن کو کسی وعظ کے ذریعہ نئی زندگی حاصل ہوئی ہے۔

عام عبادت میں دُعائیہ جلسے شامل ہیں۔ کلیسیا کے ایمانداروں کا اس لئے جمع ہونا کہ خاص طور پر خاص مقاصد حاصل کرنے کے لئے دُعا کریں، نہایت مفید ہے۔ اکثر مقامی کلیسیاؤں کی پژمردگی کا سبب یہ ہے کہ ان میں دُعائیہ جلسوں کا کوئی انتظام نہیں۔ فی زمانہ ہند کی کلیساؤں میں دُعائیہ مجلسیں کم ہوتی ہیں۔ کانونشنل کی کامیابی دُعا پر موقوف ہے۔ بہت سے لوگ ہیں جو خاص میٹنگوں کو پسند کرتے ہیں، مگر عام عبادت اور شخصی دعاؤں سے غفلت کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو خاص وعظ سُننے سے بہت کم فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

۴۔ عام عبادت میں ایسی دُعاؤں کو جو پہلے سے تیار کی گئیں اور چھپی ہوئی ہیں۔ استعمال کرنے میں دو فائدے ہیں (۱) اوّل جماعت اکثر زیادہ اچھی طرح سے دعاؤں میں شریک ہو سکتی ہے۔ (دوم) ہادی کی کمیوں کے سبب سے عبادت ناقص نہیں ہوتی۔ پر نقصان کا بھی امکان ہے۔ کیونکہ جس دعا کو ہم بار بار پڑھتے ہیں، اس کا محض ایک رسم ہو جانا آسان ہے۔ بہترین طریقہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ فی البدیہہ دعا کی جائے اور نیز تیار کی ہوئی دعائیں بھی استعمال ہوں۔

فصل دوم
سکرامنٹ

"سکرامنٹ" ایک لاطینی لفظ ہے، اور اس کے معنی شروع میں یہ تھے۔ (۱) وہ ضمانت جو مُدّعی اور مدعا علیہ کو کچہری میں داخل کرنا پڑتی تھی۔ (۲) وہ قسم جو رومی سپاہی بھرتی ہوتے وقت کھاتے تھے (۳) کوئی سنجیدگی کی قسم۔ مگر مسیحی اصطلاحات میں اس کے معنی دعائے عام کی کتاب میں یوں بیان کئے گئے ہیں "کسی اندرونی اور روحانی فضل کا جو ہمیں دیا جاتا ہے، بیرونی اور ظاہری نشان ہے۔ اور خود مسیح کی طرف سے اس لئے مقرر ہوا کہ اُس فضل کے حاصل کرنے کا وسیلہ اور اُس کے مل جانے کا باعث ہو" نیز یہ بتایا جاتا ہے (مسائل دین نمبر ۲۵) کہ یہ "یقینی گواہ اور مؤثر نشان ہے۔" اور یہ کہ اس کے وسیلے سے خدا ہم میں اثر ڈالتا ہے۔

۱۔ کتنے سکرامنٹ ہیں؟ مذکورۂ بالا تعریف کے لحاظ سے صرف دو ہیں۔ یعنی بپتسمہ اور عشائے ربانی۔ مگر کلیسیائے روم پانچ اور رسموں کو سکرامنٹ کہتی ہے یعنی استحکام۔ تنبیہ۔ تقرر۔ نکاح۔ آخری مسح (جو مرنے والے کو دیا جاتا ہے)۔ یہ تو بدیہی طور پر ظاہر ہے کہ سکرامنٹوں کا شمار سکرامنٹ کی تعریف پر منحصر ہے۔ پہلے دو سکرامنٹ یعنی بپتسمہ اور پاک شراکت کو بعض علما انجیل کے سکرامنٹ کہتے ہیں۔ اور دیگر پانچ کو کلیسیا کے سکرامنٹ۔ ہم تسلیم کر سکتے ہیں کہ کلیسیا کے یہ پانچ سکرامنٹ کسی اندرونی فضل کے نشان ہیں۔ لیکن خداوند یسوع مسیح نے

ان کو مقرر نہیں کیا اور نہ وہ ہر ایماندار پر فرض ہیں حالانکہ کم سے کم ان میں سے تین یعنی تقرر، نکاح اور استحکام (یا اس کی مانند اور کوئی رسم) اکثر کلیسیائیں مانتی ہیں۔ یہاں ہم بپتسمہ اور پاک شراکت ہی کو بحث کے دائرہ کے اندر شامل کرینگے۔

۲۔ ہر سکرامنٹ میں خدا مادی شے یا اشیا کو استعمال کرتا ہے۔ تاکہ اس کے ذریعہ سے ہم میں ان دیکھے طور پر اثر کرے سا انسان روح اور مادہ دونوں سے مرکب ہے۔ اس لئے نامناسب نہیں کہ خدا مادہ کو روحانی فضل کا وسیلہ ٹھہرائے "اُسے یاد ہے کہ ہم خاک ہیں۔" (زبور ۱۰۳۔۱۴) ہمارا خداوند بعض اوقات معجزہ کرنے میں مادی چیزیں یا اشارے استعمال کیا کرتا تھا مثلاً مٹی اور نہانا (یوحنا ۹۔۶۔ اور ۷۔ نیز دیکھو مرقس ۱۔۴۱۔ ۳۱۔ اور ۴۱، ۷۔۳۳۔۳۴)

بپتسمہ میں پانی استعمال ہوتا ہے اور پانی اور اس کا چھڑکاؤ یا انڈیلنا یا اس میں غوطہ دینا اُس سکرامنٹ کا مادہ ہے۔ اسی طرح سے پاک شراکت میں روٹی اور مے استعمال ہوتے ہیں اور یہ اشیا اور ان کا توڑنا اور لوگوں کو بانٹنا اور بعض کلیسیاؤں میں ان پر ہاتھ رکھنا اُس سکرامنٹ کا مادہ ہے۔ پر مادہ ہی کچھ نہیں وہ دُعائیں جو کی جاتی ہیں اور سکرامنٹ کے ادا کرنے کی نیت اس کا جوہر ہے۔ بغیر جوہر کے مادہ کا کوئی روحانی اثر نہیں ورنہ پرنالے کے نیچے بھیگنا بپتسمہ ہوتا۔ ممکن ہے کہ مادہ میں کمی ہو لیکن جوہر صحیح ہو۔ تاہم دونوں نہایت ضروری ہیں۔ کیونکہ بغیر مادہ کے رسم سکرامنٹ نہیں کہلا سکتی۔ اس واسطے بچے کو پانی کے استعمال کے بغیر خدا کے لئے مخصوص کرنا بپتسمہ نہیں۔

۳۔ سکرامنٹ پر غور کرتے وقت چاہیئے کہ ہم زیادہ تر کلیسیا یا خادمِ دین

یا مومنین کے کام کو مدِنظر نہ رکھیں بلکہ خدا کے کام پر ڈاکٹر کارنیگی سمسن (Dr. Carnegie Simpson) یوں لکھتے ہیں: "اگر سکرامنٹوں میں خاص بات یہ ہے کہ ہم کچھ کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہم مسیح کو یاد کرتے ہیں یا مسیحی ہونے کا اقرار کرتے ہیں، یا کلیسیا کی صحبت میں اپنے بھائیوں سے شراکت رکھتے ہیں تو سکرامنٹ پورے طور پر ضروری نہیں۔ یہ کام دوسرے طریقوں سے عمل میں آ سکتے ہیں۔" پس بپتسمہ میں نومرید کا اقرار یا بچے کو مخصوص کرنا خاص چیز نہیں بلکہ مسیح کا ایک شخص کو اپنے گھرانے میں شامل کرنا اور اس کی طرف اپنی خیرخواہی اور اس کو نجات بخشنے کا ارادہ ظاہر کرنا ہے۔ اسی طرح پاک عشا میں خاص بات یہ نہیں کہ ہم مسیح کی شفاعت کا واسطہ دیکر معافی مانگتے یا اپنے آپ کو خدا کے لئے مخصوص اور قربان کرتے ہیں، بلکہ یہ کہ اس سکرامنٹ میں مسیح ہمیں اپنے آپ کو دیتا ہے۔

۴۔ سکرامنٹ کے موثر ہونے کے لئے ایمان ضروری ہے (بالغ کے لئے اسی کا ایمان اور اطفال کے بپتسمہ میں کلیسیا کا ایمان) بے ایمان سکرامنٹ میں شریک نہیں ہو سکتا اور اگر وہ ظاہری طور پر سکرامنٹ میں شریک بھی ہو جائے تو اس سے اُس کو کوئی روحانی فائدہ نہیں بلکہ نقصان پہنچتا ہے۔ (دیکھو دعائے عام۔ مسائل نمبر ۲۹)

ممکن ہے کہ سکرامنٹ ادا کرنے والا خادم ایماندار نہ ہو۔ ایسا کبھی ہوا ہے کہ شریر آدمیوں نے خادمِ دین ہونے کا بہانا کیا اور پاک شراکت وغیرہ کو عمل میں لاتے رہے۔ تاہم اگر کلیسیا کے شرکا ایمان کے ساتھ اُس سکرامنٹ میں شریک

ہوتے ہیں تو وہ خدا کے فضل سے محروم نہیں رہتے حالانکہ کلیسیا پر فرض ہے، کہ بد آدمیوں کو خادمِ دین کے منصبی فرائض ادا کرنے سے روکے۔ بہر حال یاد رہے کہ سکرامنٹ کی تاثیر ادا کرنے والے کی خوبیوں پر نہیں، بلکہ خدا کے فضل پر موقوف ہے۔

پھر کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ سکرامنٹ کا اثر محض اس بات پر موقوف ہے، کہ وہ ٹھیک شخص کے ذریعہ ٹھیک اشیاء اور صحیح الفاظ کے ساتھ عمل میں لائی جائے (لاطینی زبان میں اس کے لئے یہ محاورہ ہے:

(ex opere operato) یعنی "کام کو عمل میں لانے ہی سے"۔ اس خیال میں یہاں تک سچائی ہے کہ جب سکرامنٹ ادا کی جاتی ہے تو واقعی کوئی کام کیا جاتا ہے بہر حال کلیسیا کی ہر شاخ میں یہ مانا جاتا ہے کہ جب ایمان نہیں تو کوئی تاثیر نہیں۔ بفرضِ محال اگر شریر اور بے ایمان خادمِ دین بے ایمان اور شریر لوگوں کو پاک شراکت کی اشیاء دے تو وہ صحیح سکرامنٹ نہ ہوگا کیونکہ وہاں ایمان بالکل نادارد ہے۔ بہر حال اگر اس جماعت میں ایک بھی ایماندار ہو تو وہ فضل اور سکرامنٹ کی تاثیر سے محروم نہ رہے گا۔

۵۔ سکرامنٹوں کو عمل میں لاتے وقت کلامِ الٰہی کی تلاوت اور اگر موقع ہو تو اس کی تشریح یعنی وعظ کا ہونا مناسب ہے۔ ایک معنی میں پاک کلام کا سنانا اور اس کی صحیح تشریح کرنا ایک طرح کا سکرامنٹ ہے جس میں الفاظ کے سنانے اور سننے سے انسان پر فضل ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ سے بپتسمہ میں کلامِ الٰہی پڑھا جاتا تھا (افسیوں ۵-۲۶) بعض لوگ سکرامنٹوں کی فضل کے

دیگر وسیلوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور یہ سچ ہے کہ دیگر وسیلوں کے استعمال میں ہم خدا
کے پاس آتے ہیں لیکن سکرامنٹوں میں خدا ہمارے نزدیک آتا ہے۔ بہر حال
ایسی ترجیح غلط ہے۔ جب کوئی مسیحی کلام کی تلاوت، خلوتی دُعا وغیرہ سے غفلت
کرتا ہے تو غالباً پاک شراکت سے چنداں فائدہ نہ اُٹھائے گا۔ یہ بھی سچ ہے، کہ فضل
کے دوسرے وسیلوں کو پاک شراکت پر ترجیح دینا یا بپتسمہ سے غفلت کرنا غلط
ہے۔ "خدا اپنے انتظام سے بندھا نہیں لیکن ہم بندھے ہیں۔" بعض لوگ اس
ترجیح کا بلند آواز سے اقرار کرنے کی جُرات نہ کریں گے۔ تو بھی اپنی عملی زندگی سے
دکھاتے ہیں کہ درحقیقت وہ ترجیح دیتے ہیں۔ بہت سے لوگ برابر عام عبادت
میں شریک ہوتے ہیں پر پاک عشا میں بہت کم۔ بعض پاک شراکت سے کبھی
غیر حاضر نہیں ہوتے پر دیگر عام عبادتوں کو ضروری نہیں جانتے۔ بعض اپنے بچّوں
کو بپتسمہ کے لئے پیش نہیں کرتے حالانکہ اُن کے لئے دُعا کرتے ہیں۔ پر فضل کے تمام
وسیلوں کو بلا امتیاز استعمال کرنا امر ضروری ہے۔

۶۔ سکرامنٹوں سے جو فضل ملتا ہے وہی فضل ہے جو اور وسیلوں سے
ملتا ہے۔ یعنی خدا کی حضوری اور دل میں روح القدس کی سکونت۔ جو لوگ فضل
کے وسیلوں سے غفلت کرتے ہیں اُن کو خداداد فضل و توفیق کیونکر مل سکتی ہے۔
سکرامنٹ اُس وقت سے مانے جاتے ہیں۔ جب کلیسیا روز پنتیکست روحانی
طاقت سے مُلبّس ہوئی۔ یہ دونوں خداوند یسوع کی موت اور قیامت کے
سب سے پُرانے گواہ ہیں۔

فصل سوم

بپتسمہ

اکثر دینوں میں پانی سے دھونا پاکیزگی اور طہارت کا نشان اور ذریعہ مانا جاتا ہے۔ یہودیوں کے درمیان ایسا ہی تھا (احبار۔ ۱۵۔ ۵۔ ۸۔ ۱۱ وغیرہ، مرقس۔ ۷۔ ۳ اور ۴)۔ یہ بات مشہور ہے کہ ہندو اشنان کرتے اور مسلم وضو کرتے ہیں پس تعجب کی بات نہیں کہ دینِ عیسوی میں بھی پانی سے بپتسمہ دیا جاتا ہے۔

۱۔ یہودیوں کے اسیری سے واپس آنے کے بعد اُن کے یہاں نومریدوں کو بپتسمہ دینے کا دستور مروج ہوا۔ مردوں اور لڑکوں کا ختنہ بھی ہوتا تھا۔ پر سب کا بپتسمہ ہوتا تھا اور یہ امر ضروری مانا گیا۔ غالباً اس کی بنیاد حزقی ایل نبی کی نبوت تھی کہ تب ہم پر صاف پانی چھڑکاؤں گا اور تم پاک صاف ہو گے۔ اور میں تم کو تمہاری تمام گندگی سے اور تمہارے سب بتوں سے پاک کروں گا اور میں تم کو نیا دل بخشوں گا۔ اور نئی روح تمہارے باطن میں ڈالوں گا (۳۶۔ ۲۵ اور ۲۶) حالانکہ اس نبوت میں چھڑکاؤ کا ذکر ہے اور جہاں تک پتہ چلتا ہے، یہودی مرید کے سارے جسم کو دھوتے تھے۔ شاید نومرید غسل کرتا تھا۔ (نیز دیکھو زکریاہ ۱۳۔ ۱۔)

۲۔ یوحنا کی انجیل میں لکھا ہے۔ (۱/۲۵) کہ بعض یہودیوں نے یوحنا کے اس عمل پر اعتراض کیا لیکن غالباً یہ اعتراض رسم بپتسمہ پر نہیں بلکہ اس پر ہے کہ یوحنا نے اس

رسم کے ادا کرنے کے اختیار رکھنے کا دعویٰ کیا۔

غالباً وہ اس بات پر ناراض تھے کہ یوحنا گویا اسرائیلیوں کو غیر قوم والے ٹھہراتا اور اُن کو بپتسمہ لینے پر مجبور کرتا تھا کہ گویا نو مرید ہیں۔ متی کی انجیل میں مرقوم ہے کہ اُس نے کہا "اپنے دلوں میں یہ کہنے کا خیال نہ کرو کہ ابرہام ہمارا باپ ہے۔ کیونکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا اِن پتھروں سے ابراہام کے لئے اولاد پیدا کر سکتا ہے۔" (۳-۹)

یوحنا کا بپتسمہ توبہ کے اقرار پر دیا جاتا تھا۔ اس غرض سے کہ بپتسمہ لینے والوں کے گناہ معاف ہوں (مرقس ۱-۴ ۔ لوقا ۳-۳) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض نے اسے محض ایک رسم سمجھا۔ کیونکہ اُس کے یہ الفاظ "میں نے تم کو ..... دیگا۔" میں نے تم کو پانی سے بپتسمہ دیا مگر وہ (یعنی آنے والا) تم کو روح القدس سے بپتسمہ دے گا۔"

خداوند یسوع مسیح نے خود آکر یوحنا سے بپتسمہ لیا اور متی کی انجیل میں ذکر ہے کہ یوحنا نے نہ چاہا کہ ایسا ہو۔ مگر یسوع نے کہا "ہمیں اسی طرح ساری راستبازی پوری کرنا مناسب ہے۔" (۳-۱۵) پاک نوشتہ کے یہ الفاظ یاد رہیں "وہ خطا کاروں کے ساتھ شمار کیا گیا۔" (یسعیاہ ۵۳-۱۲ + بعض پرانے نسخوں میں مرقس ۱۵-۲۸ میں اس کا اقتباس ہے)۔ اسی طرح سے وہ جو خدا کا بیٹا تھا ختنہ کے ذریعہ سے خدا کے چنے ہوئے لوگوں میں شامل ہوا۔ (لوقا ۲-۲۱)

تمام انجیلوں میں ذکر ہے کہ جب یسوع بپتسمہ پاکر پانی سے باہر نکلا تو روح القدس اُس پر نازل ہوا۔ اور آسمان سے یہ آواز آئی "کہ یہ میرا پیارا بیٹا ہے۔"

اس کے فوراً بعد خداوند کی آزمائش ہوئی۔ شیطان نے خداوند کے لئے وہی الفاظ استعمال کئے جو بپتسمہ کے وقت سنائی دیئے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ بپتسمہ خداوند کی زندگی کا ایک اہم موقع تھا۔

عام طور پر لوگ مانتے ہیں کہ یوحنا غوطہ دے کر لوگوں کو بپتسمہ دیتا تھا لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ لوگ پانی میں کھڑے ہو جاتے تھے اور یوحنا اُن کے اوپر پانی انڈیلتا تھا۔ بعض پُرانی تصویروں میں یسوع کا بپتسمہ اسی طرح سے دکھایا جاتا ہے۔ مگر یہ محض ایک خیالی بات ہے۔ قدیم کلیسیا میں بعض اوقات بپتسمہ کا حوض بہت کم گہرا ہوتا تھا۔ بپتسمہ پانے والا پانی میں کھڑا ہوتا تھا اور خادم دین اس کے سر کے اوپر لوٹے یا اور کسی برتن سے پانی انڈیلتا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ دستور یوحنا کے وقت سے چلا آیا ہو۔ ان الفاظ کے لکھنے کی غرض یہ ہے کہ لوگ غوطہ ہی کو بپتسمہ کا صحیح طریقہ نہ سمجھیں۔

۳۔ چوتھی انجیل میں مرقوم ہے کہ یسوع کے شاگرد بپتسمہ دیتے تھے اور وہاں جملہ ایسا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ یسوع کی اجازت سے ہوتا تھا۔ "فریسیوں نے سُنا کہ یسوع یوحنا سے زیادہ شاگرد بناتا اور بپتسمہ دیتا ہے۔ گو یسوع آپ نہیں بلکہ اس کے شاگرد بپتسمہ دیتے تھے۔ بہرحال اس بات کا ذکر نہیں کہ یسوع نے گلیل میں کسی کو بپتسمہ دیا۔ مگر ہم یاد رکھیں کہ گلیل میں یسوع مسیح نے بہت کام کئے اور ان میں سے تھوڑے ہی کاموں کا بیان انجیل میں پایا جاتا ہے۔ ہم کو نہیں معلوم کہ گلیل میں کام کرنے سے پہلے خداوند یسوع مسیح نے کتنے شاگردوں کو بلایا۔ یوحنا کے پہلے باب میں پانچ کا ذکر ہے۔ اندریاس

اور اس کے ساتھی کو یقیناً یوحنّا کا بپتسمہ مل چکا تھا۔ (یوحنّا ۔۱۔ ۳۵ سے ۳۹ تک) زیادہ تر بارہ رسول اور دیگر شاگرد ایسے لوگوں میں سے تھے جو یوحنّا کو ملتے تھے اور غالباً اُن میں سے چند بلکہ شاید اکثروں نے اُس کا بپتسمہ پایا ہو۔

متّی کی انجیل کے آخر میں ذکر ہے کہ خداوند نے بپتسمہ دینے کا حکم دیا۔ اس آیت کے الفاظ کے بارے میں شک کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ اس میں باپ بیٹے اور روح القدس کے نام سے بپتسمہ دینے کا ذکر ہے۔ لیکن اعمال کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں خداوند یسوع کے نام سے بپتسمہ دیا جاتا تھا۔ (متی ۔ ۲۸ ۔ ۱۹؛ اعمال ۔ ۲ ۔ ۳۸ + ۸ ۔ ۱۶؛ ۱۹ ۔ ۵ + نیز دیکھو ۱۔ کرنتھیوں ۔ ۱۳۱ سے ۱۵ ۔ تک)۔ ممکن ہے کہ خداوند نے جو حکم دیا تھا اس کا محض خلاصہ لکھا گیا ہو۔ لیکن اس آیت کا بیان ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ قدیم کلیسیا رسم بپتسمہ کی ادائیگی کو خداوند کے حکم کی تعمیل مانتی تھی۔ یہ بات تو ایسی ہے کہ اگر اس کا کہیں ذکر بھی نہ ہوتا۔ تو بھی ہم کہتے کہ خداوند نے ضرور ایسا کیا ہوگا۔ (۱) اُس نے خود بپتسمہ لینے سے اس رسم پر گویا مہر کی (۲) یوحنّا کی انجیل میں ذکر ہے کہ شروع میں مسیح کے شاگرد بپتسمہ دیتے تھے اور یہ اس کی اجازت کے بغیر کیونکر ہو سکتا تھا۔ (۳) روز پنتیکُست ہی سے کلیسیا نے برابر تمام مُریدوں کو بپتسمہ دیا۔ مسیح کے حکم کے بغیر ایسا ہونا ناممکن تھا۔

۴ ۔ یوحنّا بپتسمہ دینے والے کی منادی میں اور نیز اعمال کی کتاب میں پانی کے بپتسمہ اور روح کے بپتسمہ کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ یوحنا کی انجیل میں صاف ذکر ہے کہ دونوں ضروری ہیں (۳ ۔ ۵) اعمال کی کتاب میں مرقوم ہے کہ بپتسمہ پانے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اُس میں رُوح القدس کی بخشش کا وعدہ پایا جاتا ہے۔

(۲-۳۸) معلوم ہوتا ہے کہ جب بپتسمہ کے وقت روح القدس تو مزید پر نازل نہیں ہوتا تھا، تو اس کے سر پر ہاتھ رکھے جاتے تھے جیسا سامریہ میں ہوا (۸-۱۷)۔ یہ پاک روح کی بخشش بغیر ہاتھ رکھے مل سکتی تھی۔ کرنیلیس اور اس کے ساتھیوں پر پطرس کے وعظ کے وقت روح القدس نازل ہوا اور ان کو پھر بپتسمہ دیا گیا (۱۰-۴۴) ممکن ہے کہ پولس کو بپتسمہ کے وقت روح ملا، ملاحظہ ہو۔ (۹-۱۷، ۱۸ سے ۱۰ تک)

کچھ ایسے لوگ تھے، جن کو صرف یوحنا کا بپتسمہ ملا تھا (۱۸-۲۴ + ۱۹-۳) لیکن روح القدس نہ ملا تھا۔ ایسے لوگوں کو دوبارہ بپتسمہ دیا گیا لیکن مسیح کے نام سے اور ان کے سروں پر ہاتھ رکھے گئے (۱۹-۱ سے ۶ تک) لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ اپلوس کو دوبارہ بپتسمہ دیا گیا۔ شاید اس شخص کو بھی روح ملا تھا (۱۸-۲۵) پولس نے چند آدمیوں سے یہ سوال کیا "کیا تم نے ایمان لاتے وقت روح القدس پایا"؟ اس سے بعض لوگ یہ قیاس کرتے ہیں کہ بپتسمہ کے وقت روح القدس ملنے کی امید کی جاتی تھی۔ مگر یہ قیاس غلط ہے۔

۵۔ پولس بپتسمہ پر زور دیتا تھا۔ اول وہ بتاتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے گناہ اور بری عادتیں صاف ہو جاتی ہیں۔ کرپہ گناہوں کا ذکر کرنے کے بعد وہ فرماتا ہے "بعض تم میں ایسے ہی تھے مگر تم یسوع مسیح کے نام سے اور ہمارے خدا کے روح سے دھل گئے اور پاک ہوئے" (۱-کرنتھیوں ۶-۱۱) یعنی بپتسمہ گناہوں کی معافی اور اس سے رہائی پانے کا وسیلہ ہے۔

اسی خط میں یہ بھی آیا ہے "ہم سب نے خواہ یہودی ہوں خواہ یونانی

...... ایک ہی روح کے وسیلہ سے ایک بدن ہونے کے لئے بپتسمہ لیا، اور ہم سب کو ایک ہی روح پلایا گیا۔" یعنی بپتسمہ کلیسیا میں شراکت اور رُوح القدس پانے کا ذریعہ ہے۔

گلتیوں کو پولس نے لکھا کہ بپتسمہ یافتہ لوگ خدا کے فرزند ہیں۔ بلکہ یہ خاص بات بتاتا ہے کہ انھوں نے "مسیح کو پہن لیا" اور نیز یہ کہ بپتسمہ مسیح میں شامل ہونے کا بپتسمہ ہے (۳-۲۶ سے ۲۹ تک) اور رومیوں کو سمجھاتا ہے کہ بپتسمہ میں ہم مسیح کی موت اور قیامت میں شریک ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہمارے گناہ دور ہوجاتے ہیں۔" ہم گناہ کے اعتبار سے مردہ ہیں" نیز ہم راستبازی کرنے کے لئے نئی زندگی حاصل کرتے ہیں۔ رومیوں ۶-۱ سے ۱۱ تک) یعنی بپتسمہ کے ذریعہ سے ہم لیسوع مسیح کی موت اور زندگی کے فائدے حاصل کرتے ہیں۔ نیز کلسیوں کے نام کے خط میں یہ بتایا گیا ہے، کہ ہم مسیح کے ساتھ دفن ہوئے اور جی بھی اٹھے (کلسیوں ۲-۱۲) اس موقع پر بپتسمہ کے ساتھ ایمان کا خاص ذکر ہے۔

اس کا خلاصہ شمالی ہند اور پاکستان میں کلیسیائی اتحاد کی بُنیاد میں یوں بیان کیا گیا ہے۔" بپتسمہ ان تین باتوں کا نشان ہے۔ پاک صاف ہونا۔ مسیح میں وابستہ ہونا فضل کے عہد میں شامل ہونا لوگ جو اس سکرامنٹ میں بپتسمہ پاتے ہیں، سنجیدگی سے خدا کے گھرانے میں داخل کئے جاتے ہیں۔ اور.... وعدہ کیا جاتا ہے کہ وہ خدا کی ملکیت ہوں گے۔"

۶۔ بپتسمہ اور نئی پیدائش۔ جب بالغ سوچ سمجھکر ایمان کے ساتھ بپتسمہ

لیتا ہے تو اُس کا دل بدل جاتا ہے اور وہ نہ صرف پانی سے بلکہ روح سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جیسا ہم اعمال کی کتاب میں دیکھتے ہیں ویسا ہی آج کل بھی ہوتا ہے۔ بعض آدمیوں میں نئی زندگی اور دل کی تبدیلی پیشتر ہوتی ہے اور وہ بعد کو بپتسمہ پاتے ہیں، اور دیگر لوگوں میں دل کی تبدیلی بپتسمہ کے وقت ہوتی ہے۔ نیز بعضوں کو رفتہ رفتہ روح کی یہ پیدائش حاصل ہوتی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں، کہ جس طرح آدمی جسمانی پیدائش سے انسانی گھرانے میں پیدا ہوتا ہے اسی طرح سے وہ بپتسمہ کے ذریعہ سے خدا کے گھرانے میں شامل ہوتا ہے۔ بپتسمہ انسان کے لے پالک فرزند بننے کا سکرامنٹ ہے۔ اس معنی میں ہر بپتسمہ یافتہ کو نئی پیدائش حاصل ہوتی ہے۔ پر یہ کہنا کہ ہر بپتسمہ یافتہ کو روحانی پیدائش حاصل ہوتی ہے، تجربہ اور شاید پاک کلام کی تعلیم کے خلاف ہے۔ خاص کر جب آدمی میں پورا ایمان نہیں۔

۷۔ بپتسمہ مسیحی اُمت میں داخل ہونے کا سکرامنٹ ہے جیسا یہودی اُمت میں داخل ہونے کی رسم ختنہ تھا (رومیوں ۲)۔ اس معنی میں بپتسمہ ختنہ کا قائم مقام ہے۔ اس کے علاوہ پولس رسول نے کلسیوں کو بتایا کہ "اسی (مسیح) میں تمہارا ایسا ختنہ ہوا جو ہاتھ سے نہیں ہوتا یعنی مسیح کا ختنہ جس سے جسمانی بدن اُتارا جاتا ہے۔" یہاں تک یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ایمان کی طرف اشارہ ہے۔ پر پولس نے فوراً یہ بھی لکھا "اور اُسی کے ساتھ بپتسمہ میں دفن بھی ہوئے۔" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ لکھتے وقت بپتسمہ مدِ نظر رہا۔ پھر گلتیوں کو لکھتے وقت جہاں بپتسمہ کا ذکر ہوتا ہے تو پولس

لکھتا ہے "اگر تم مسیح کے ہو تو ابرہام کی نسل اور وعدہ کے مطابق وارث ہو" بپتسمہ یافتہ شخص اگر ایماندار ہو تو حقیقی اسرائیلی میں شامل ہے، اور جو جو وعدے اسرائیلیوں سے کئے گئے تھے، ان کا مصداق ہے۔

۸۔ عموماً مسیحی کلیسیاؤں میں بپتسمہ کا سکرامنٹ ادا کرنے کے تین طریقے مانے جاتے ہیں یعنی غوطہ دینا۔ پانی انڈیلنا۔ پانی چھڑکنا۔ بپٹسٹ کلیسیائیں صرف غوطہ کو جائز مانتی ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ شروع میں صرف یہی طریقہ استعمال ہوتا تھا۔ لیکن درحقیقت یہ ہم کو معلوم نہیں۔ ممکن ہے کہ پانی انڈیلا جاتا تھا اور یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ چھڑکانے کا طریقہ استعمال نہیں ہوتا تھا۔ بہرحال چونکہ پولس جیسا اوپر بیان ہو چکا لکھتا ہے کہ ہم بپتسمہ میں مسیح کے ساتھ دفن ہوتے اور پھر جی اٹھتے ہیں۔ غالباً جن کو وہ اس وقت لکھتا تھا، ان کے یہاں بپتسمہ غوطے سے ہوتا تھا۔ مگر یاد رکھیں کہ یہ محض ایک نتیجہ ہے، جو لوگ نکالتے ہیں کہیں یہ نہیں بتایا جاتا ہے کہ بپتسمہ کس طریقہ سے دیا جاتا تھا۔ یہ ترجیح ہے کہ بہت سی جگہوں میں یونانی مصنف لفظ (baptizein) (بپتسمہ دینا) نہانے اور ڈوبنے کے معنی میں استعمال کرتے تھے۔ بہرحال ایک حاصل مصدر جو اس فعل سے نکلتا ہے، دھونے کے معنی میں آتا ہے (مرقس ۷۔۴، عبرانیوں ۹۔۱۰)۔

(۱) یہ لفظ بپتسمہ مسیحی اصطلاح ہو گیا اور کسی اصطلاح کے معنی لفظ کے مصدر سے قائم کرنا مناسب ہے۔ مثلاً تقرر کے لفظی معنی مقرر کرنا ہے لیکن اصطلاحاً خادم دین کی تقدیس کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

(۲) اگر بغیر غوطہ دیئے بپتسمہ ناجائز ہوتا تو پاک کلام میں اس کے بارے میں صاف صاف بتایا جاتا۔

(۳) مسیح کی کل تعلیم کا ڈھنگ ایسا ہے جس سے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس کو رسموں کی تفصیل میں دلچسپی نہیں تھی۔ یہ خیال کرنا کہ خدا چھڑکاؤ یا انڈیلنے کے بپتسمہ کو رد کرتا ہے مسیحی اصول کے خلاف ہے۔

(۴) جان ولسلی نے بپتسمہ کے بارے میں ایک رسالہ لکھا۔ اس میں وہ یہ سوال کرتا ہے کیا ممکن تھا کہ یروشلیم میں جہاں اب بھی پانی کی قلت ہے اور اُس زمانے میں اور بھی مشکل سے ملتا تھا، روز پنتیکست تین ہزار آدمیوں کو غوطہ دیا جائے "(اعمال ۲-۴۱)

(۵) پوپ (Pope) صاحب مرحوم نے اس پر چند فقرے لکھے جو قابل غور ہیں*۔

"وہ اہم حقیقتیں جن کا بپتسمہ محض نشان ہے، چھڑکاؤ یا انڈیلنے سے بہتر طور پر ظاہر ہوتی ہیں۔ کفارہ کا خون لوگوں پر اور کفارہ کے سرپوش پر چھڑکا جاتا تھا اور روح القدس کی بخششیں اکثر انڈیلنے سے ظاہر کی جاتی ہیں۔ یہ بھی لکھا جاسکتا ہے کہ عہد کا خون لوگوں پر چھڑکا گیا (خروج ۲۴-۸) اور حزقی ایل کے صحیفے میں جہاں بپتسمہ کی پیشین گوئی ہے صاف پانی کے چھڑکنے

---

*A Compendium of Christian Theology.

کا ذکر ہے (حزقی ایل ۳۶-۲۵)

(۷) جہاں تک پتہ چلتا ہے، سولھویں صدی کے آخر تک مسیحی کلیسیا ر بپتسمہ کے تینوں طریقوں کو استعمال کرتی تھی۔ اُس وقت اسمتھ صاحب نے ایمانداروں کا بپتسمہ اور ڈباؤ کا بپتسمہ ہی جائز ٹھہرانا شروع کیا۔

بہر حال غوطے کا بپتسمہ نہایت اچھا ہے۔ لیکن اس کو ایک ہی جائز طریقہ ٹھہرانا زیادتی معلوم ہوتا ہے۔

۹۔ **اطفال کا بپتسمہ**۔ دو باتیں مشہور ہیں۔ اول زیادہ تر مسیحی کلیسیائیں بچوں کو بپتسمہ دیتی ہیں۔ دوم بعض کلیسیائیں جو عموماً بپٹسٹ کہلاتی ہیں، صرف ایمانداروں کا بپتسمہ مانتی ہیں۔ یہ تو ضرور ہے کہ تمام کلیسیاؤں میں بالغوں کو جن کو بچپن میں بپتسمہ نہیں ملا ایمان کے اقرار پر بپتسمہ دیا جاتا ہے۔

ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ بپتسمہ ختنہ کا قائم مقام ہے۔ غالباً یہ پولس کی تعلیم ہے اور کسی صورت ہیں جیسا ختنہ اسرائیلی اُمت میں داخل ہونے کی رسم ہے، ویسا ہی بپتسمہ کلیسیا میں داخل ہونے کا سکرامنٹ ہے۔ یہ بات مشہور ہے، کہ یہودی فرزندِ نرینہ کا ختنہ بچپن میں کرتے ہیں (لوقا ۱-۵۹، ۲-۲۱، فلپیوں ۳-۵) جب ہم اس بات کو مدِ نظر رکھتے ہیں، اور اس کو بھی کہ مسیحی کلیسیا اسرائیلی کلیسیا کی قائم مقام ہے تو یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کو بپتسمہ دیا جائے۔

نئے عہدنامہ میں اطفال کے بپتسمہ کا ذکر نہیں لیکن معلوم ہوتا ہے۔

کہ تمام گھرانوں کا بپتسمہ ہوتا تھا (۱-کرنتھیوں ۱-۱۶-اعمال ۱۶-۳۳) اور یہ نہیں بتایا جاتا ہے کہ صرف بالغوں کو بپتسمہ دیا گیا۔ نیز ظاہر ہے کہ پولس جس کے خطوط سے ظاہر ہے کہ وہ بپتسمہ ہی کو کلیسیا میں داخل ہونے کا ذریعہ سمجھتا تھا، بچّوں کو ایسا سمجھتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کو کلیسیا میں شریک سمجھتا تھا۔ (افسیوں ۶-۱، کلسیوں ۳-۲۰) دو آئتیں ہیں جن سے لوگوں نے متضاد نتیجے نکالے۔ "وعدہ تم اور تمہاری اولاد سے . . . . ہے" (اعمال ۲-۳۹) بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ بچّوں کو اسی وقت بپتسمہ دلانے کی تحریک ہے بعض یہ کہ مطلب یہ ہے کہ جب وہ سنّ تمیز تک پہنچیں تو بپتسمہ پائیں۔ پھر کرنتھیوں کے نام کے پہلے خط میں بتایا گیا کہ مسیحی کے بچّے پاک ہیں۔ (۷-۱۴) بعض اس بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہ پولس تمام بنی آدم کو گناہ آلودہ جانتا تھا یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ان کو بپتسمہ ملا ہوگا۔ اور بعض یہ کہ یہ بچّے چونکہ مسیحی کے ہیں اسی لئے پاک ہیں۔ خادم ان دو آیتوں میں سے پہلی پر کوئی رائے قائم نہیں کرسکتا پر دوسری کی نسبت یہ خیال کرتا ہے کہ غالباً بپتسمہ یافتہ بچّوں کا ذکر ہے۔

یہ سوال لازم آتا ہے کہ جب بچّہ ہنوز ایمان نہیں لاسکتا تو وہ بپتسمہ کے فائدے کیونکر اُٹھا سکتا ہے۔ ؟ یہ تو ماننا پڑتا ہے کہ جب تک بچّے بے سمجھ ہے وہ بپتسمہ کے سب فائدے نہیں اُٹھا سکتا۔ اور جب وہ سنِ تمیز تک پہنچے گا، تو اسے ایمان لانا پڑے گا۔ حالانکہ جو بچّے مسیحی گھرانوں میں پرورش پاتے ہیں وہ بچپن میں بھی ایمان لاسکتے ہیں۔ اور خدا کا شکر ہو کہ ان میں

سے بہتیرے ایمان لاتے بھی ہیں۔ لیکن بچہ خدا کے گھرانے میں شامل اور خدا کے فرزندوں میں شریک ہو سکتا ہے۔

نیز ہم بچوں کے لیئے دعا کرتے ہیں، کہ خدا ان کو نجات بخشے اور ان کو اپنا روح القدس دے۔ حالانکہ بچے ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے ہیں۔ ایمان کی ضرورت تو ہے، لیکن اطفال کا بپتسمہ کلیسیا کے ایمان پر دیا جاتا ہے۔ ناظرین کو یاد ہوگا، کہ مسیح نے مفلوج کے دوستوں کا ایمان دیکھ کر مفلوج سے فرمایا۔ "بیٹا، تیرے گناہ معاف ہوئے" (مرقس ۲-۵) بچے کا بپتسمہ اس کا پانی سے پیدا ہونے اور خدا کے گھرانے میں شامل ہونے کا سکرامنٹ ہے۔

یہ تو بے شک سچ ہے کہ بپتسمہ سے والدین اپنے بچوں کو خدا کے لئے مخصوص کرتے ہیں، پر ہم کو زیادہ تر یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس سکرامنٹ میں خدا کس بات کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ سکرامنٹ اس امر کی شہادت ہے کہ بچے کی پیدائش سے سینکڑوں برس پہلے مسیح نے اس کی نجات کو اپنی صلیبی موت سے تیار کیا (اور ہم سب کا یہی حال ہے) اور اس سے خدا کا یہ ارادہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس بچے سے محبت رکھے، اس کو گناہ سے بچائے، اور اس کو ابدی زندگی بخشے۔

ماں باپ بچے کی پیدائش ہی سے اس پر اثر ڈالنے لگتے ہیں۔ کیا خدا اثر نہیں کر سکتا؟ جو لوگ بپتسمہ کو سن تمیز تک ملتوی رکھتے ہیں گویا یہ دکھاتے ہیں کہ اس وقت تک خدا بچے کے لئے اور اس کے اندر پورا روحانی کام نہ کرے گا جب تک کہ وہ خود ایمان نہ لائے۔

یہ بھی ضرور ہے کہ ماں باپ اور کلیسیا ان بچوں کی نسبت جو بپتسمہ پاتے

ہیں۔ اپنے فرائض معلوم کریں یعنی یہ کہ بچے کی مسیحی تعلیم و تربیت کا انتظام کریں۔ بعض کلیساؤں میں دھرم ماں باپ ہوتے ہیں جو یہ ذمہ اٹھاتے ہیں، اور وہ سچ مچ اپنے فرائض کو پہچان کر پورا کرتے ہیں۔ یہ نہایت اچھا اور موزوں انتظام ہے، پر افسوس کی بات یہ ہے کہ بہت دفعہ وہ ان فرائض سے غافل رہتے ہیں اور ان کے وعدے بے معنی رسم بن جاتے ہیں۔ خادم کو زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ والدین یا سرپرست ہی یہ ذمہ اٹھائیں۔

بعضوں کا خیال ہے کہ بچے کے بپتسمہ کے وقت اس کے موروثی یا فطری گناہ نہ صرف معاف ہوتے بلکہ دُھل جاتے ہیں لیکن نہ تو پاک کلام میں اس کی طرف کوئی اشارہ ہے، اور نہ تجربہ سے ظاہر ہے کہ بپتسمہ یافتہ بچے فطری گناہ سے بری ہو جاتے ہیں۔

۱۰۔ استحکام۔ اکثر کلیساؤں میں جہاں اطفال کا بپتسمہ مروج ہے، یہ انتظام ہے کہ جب بچے سن تمیز کو پہنچ جاتے ہیں تو خاص تعلیم پانے کے بعد وہ کلیسا کی پوری شراکت میں خاص عبادت کے ذریعہ سے شامل کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ عبادت بعض کلیساؤں میں استحکام کہلاتی ہے۔ اکثر اسقفی کلیساؤں میں استحکام بشپ ہی کرتا ہے۔ [حالانکہ مشرقی کلیساؤں میں بپتسمہ ہی کے وقت خادم دین ایسے تیل سے جس کی بشپ نے تقدیس کی ہو بچے کو مسح کرتا ہے، اور بعض اوقات پاک شراکت کی پاک اشیا اس کے منہ میں ڈالتا ہے]

لازم ہے کہ آدمی کلیسا کی پوری شراکت میں داخل ہوتے وقت اپنی طرف سے اپنے ایمان کا اقرار کرے اور نیز وعدہ کرے کہ اس کا ارادہ یہ ہے کہ اپنے

آپ کو خدا کی اطاعت اور خدمت کے لئے نثار کرے۔ اس رسم کی تیاری میں معلّم کو کوشش کرنا چاہیئے کہ اُمیدوار اپنا دل خدا کو دے تاکہ روح سے پیدا ہو۔ (یوحنا ۳۔ ۵) نیز یہ امر ضروری ہے، کہ کلیسیا کی پوری شراکت میں داخل کرنے کی عبادت کے وقت دُعا کی جائے کہ روح القدس اُمیدواروں پر نازل ہو۔ ایک مناسب دُعا یہ ہے کہ وہ خاص انعام دیئے جائیں جن کا ذکر یسعیاہ نے کیا۔ (۱۱-۲) "حکمت اور خرد کی روح، مصلحت اور قدرت کی روح، معرفت اور خداوند کے خوف کی روح۔" نیز مناسب ہے کہ جو خادم دین اس رسم کو ادا کرے وہ ہر اُمیدوار کے سر پر ہاتھ رکھے۔ حالانکہ یہ امر ضروری نہیں اور بعض کلیسیاؤں میں یہ رسم نہیں مانی جاتی۔

فصل چہارم

پاک شراکت یعنی عشائے ربّانی

اسنئے عہدنامے میں اس سکرامنٹ کے قائم ہونے کے چار بیان ہیں۔ متی ۲۶-۲۶ سے ۲۹ تک جو مرقس ۱۴-۲۲ سے ۲۵ تک پر مبنی ہے، لوقا ۲۲-۱۷ سے ۲۰ تک ۱-کرنتھیوں ۱۱-۲۳ سے ۲۵ تک۔ نیز یوحنا کی انجیل کے چھٹے باب میں اس کی طرف اشارہ ہے (یاد رہے کہ چوتھی انجیل تواریخ کے سلسلے کے لحاظ سے نہیں لکھی گئی بلکہ مضامین کے موافقت کے بموجب) اور اعمال میں اس کا ذکر ہے (۱-۴۶ ۲۰-۷) اور پولس ۱-کرنتھیوں کے دسویں باب میں پھر اس کا

ذکر کرتا ہے (آیات ۱۶-اور ۱۷)۔

ان میں پولس کا بیان سب سے پہلے لکھا گیا اور پھر مرقس کا۔ چونکہ پہلی تین انجیلوں کا مقابلہ کرنے سے ظاہر ہے کہ پہلی اور تیسری انجیلوں کے لکھنے والوں نے مرقس کی انجیل کو استعمال کیا ہے۔ اس لئے یہ ضرور اُن سے پہلے لکھی گئی ہوگی۔ چنانچہ یہ دونوں بیان زیادہ اہم ہیں لیکن پولس کے بیان کو سب پر ترجیح دینا چاہیئے۔ اِن میں خاص فرق یہ ہے :۔ مرقس کے بیان میں یہ حکم نہیں ملتا کہ مسیحی لوگ اس کام کو بار بار ادا کریں۔ لوقا کا بیان اوروں سے جُدا گانہ ہے۔ اس لئے کہ اس میں دو پیالوں کا ذکر ہے۔ ان میں غالباً پہلے پیالہ کو پاک شراکت سے کوئی خاص تعلق ہے۔ لوقا نے (۲۲- ۱۹) دہرانے کا حکم قلم بند کیا۔ چند پرانے نسخوں میں جو عموماً زیادہ معتبر نہیں سمجھے جاتے ہیں، یہ آیتیں نہیں ملتیں جو ایک تعجب انگیز بات ہے۔ نیز سُریانی زبان کے ترجمہ میں آیات ۱۷- اور ۱۸ قلم انداز کی گئیں۔ اور پُرانے سُریانی ترجمہ میں ۱۹ ویں آیت کا کچھ حصہ ان میں ملا دیا گیا۔ فرانسیسی مفسّر لاگرانش (Lagrange) کا خیال بہتر معلوم ہوتا ہے کہ بعض نقل نویسوں اور مترجموں نے یہ نہ سمجھا کہ پہلا پیالہ محض یہودی قسم کی رسم کا حصّہ تھا اور متن کو غلط سمجھکر اس کی اصلاح کرنے کی کوشش طرح طرح سے کی۔

پر اس لئے کہ دو بیانوں میں دُہرانے کا حکم ہے اور نیز شروع ہی سے قدیم کلیسیا نے یہ سکرامنٹ ادا کیا ہم کو یقین ہے کہ اس کو خداوند یسوع مسیح نے نہ صرف قائم کیا، بلکہ دائمی یادگار ٹھہرایا۔ یہ تقریباً تمام مسیحیوں کا عقیدہ ہے۔ یاد رہے کہ مسیح نے یہ نہیں کہا کہ اس کے بارے میں فلاں فلاں باتیں ماننا یا اِس کی

فلاں تشریح صحیح ہے بلکہ یہ" ایسا ہی کیا کرو۔"

۲۔ اس رسم کو قائم کرتے وقت خداوند نے صاف طور پر دکھایا کہ اُس کی آنے والی موت نیا عہد قائم کرنے کے لئے قربانی ہوگی۔ عہد باندھتے وقت قربانی ہوتی تھی (دیکھو۔ پیدائش۔ ۱۵۔ ۸ سے ۱۸۔ تک • یرمیاہ ۔ ۳۴۔ ۱۸۔ ۱۹) نیز جب پرانا عہد قائم ہوا تو قربانی ہوئی اور موسیٰ نے قربانی کی بھینٹوں کا خون مذبح اور لوگوں پر چھڑکا اور یہودیوں کی روایت تھی کہ اُس نے اُسے عہد کے طومار پر بھی چھڑکا (خروج ۔ ۲۴۔ ۴ سے ۸ تک • عبرانیوں ۔ ۹۔ ۱۹) اس نئے عہد جس سے نام نیا عہد نامہ رکھا گیا وہی عہد ہے جس کی پیشین گوئی یرمیاہ نے کی (یرمیاہ ۔ ۳۱۔ ۳۰ سے ۳۴ تک) اس بہتر عہد کے بارے میں عبرانیوں کے خط میں بہت کچھ مرقوم ہے جس کا یہاں اقتباس کرنے کی ضرورت نہیں (ابواب ۷۔ ۹ تک)

لیکن قربانی ایک قسم کی عبادت ہے، اور ہم مسیح کے ساتھ اس عبادت میں شریک ہوتے ہیں جب ہم اُس پر ایمان رکھتے ہیں، اور نیز بپتسمہ اور پاک شراکت کے ذریعہ سے۔ پولُس لکھتا ہے " وہ برکت کا پیالہ جس پر ہم برکت چاہتے ہیں کیا مسیح کے خون کی شراکت نہیں ؟ وہ روٹی جسے ہم توڑتے ہیں، کیا مسیح کے بدن کی شراکت نہیں ؟" (۱۔ کرنتھیوں ۔ ۱۰۔ ۱۶) چنانچہ عشائے ربانی مسیح کی صلیبی موت کے فائدوں کو حاصل کرنے کا ایک خاص طریقہ ہے بشرطیکہ ہم ایمان کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ یوحنا کے چھٹے باب میں بتایا گیا ہے کہ " زندہ کرنے والی تو روح ہے، جسم سے کچھ فائدہ نہیں " (۶۔ ۶۳) جس سے

یہ نتیجہ لکالنا غلط نہیں کہ محض روٹی اور مے پر غور نہ کرنا چاہئے۔ بلکہ اُس روحانی فائدہ پر جو ان کے ایمان کے ساتھ کھانے پینے سے حاصل ہوتا ہے۔

غور کیجئے کہ مرقس کی انجیل میں خداوند کے خون کے متعلق یہ لفظ آئے ہیں۔ کہ وہ "بہتیروں کے لئے بہایا جاتا ہے" جس سے یہ اور بھی صفائی سے ظاہر ہوتا ہے کہ یسوع کی موت انسان کے فدیہ کے لئے قربانی ہے۔

۴۔ "یہ میرا بدن ہے..... یہ میرا خون ہے۔" اِن الفاظ پر بہت بحث ہوئی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کا مطلب یہ ہے کہ روٹی اور مے بدل کر سچ مچ مسیح کا بدن اور خون بن گئے اور نیز جب خادمِ دین تقدیس کے وقت یہ الفاظ دہراتا ہے۔ تو خدا اس کی دُعا سے روٹی اور مے کو تبدیل کر دیتا ہے۔ اس لئے کلیسیائے روم میں تقدیس شدہ روٹی کی تعظیم کی جاتی ہے، اور وہ ہیبنٹ کہلاتی ہے۔ (Host) لاطینی (*hostia*) یعنی ہیبنٹ) یہ مانا جاتا ہے کہ پاک اشیاء میں ظاہراً کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ روٹی اور مے کی مادّی صفات نہیں بدلتیں لیکن اُس کا جوہر یا ماہیت بدل جاتی ہے۔ یہ عقیدہ رفتہ رفتہ پیدا ہوا جس سے ظاہر ہے کہ یہ پاک کلام کے الفاظ کا کوئی باقاعدہ نتیجہ نہیں۔ بلکہ اُن پر غور کرنے کا نتیجہ ہے۔ یہ ماننا مشکل ہے کہ جب یسوع خود حاضر تھا تو روٹی اور مے حقیقتہً اس کا بدن اور خون کیسے بن گئے۔ وہ اب تک زندہ تھا، اور یہ الفاظ اس کی قیامت کے بعد نہیں فرمائے گئے، ورنہ ممکن تھا کہ رومی کلیسیا کا گمان درست ہوتا۔ یقیناً اِن الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ یہ میرے بدن اور خون کے نشان ہیں، جیسا کوئی شخص تصویر دکھا کر

کہتا ہے کہ یہ میرا بھائی ہے یا کوئی شخص شملہ میں ایک مورت کے بارے میں دریافت کرے" یہ کون ہے؟" اور جواب ملے" یہ لالہ لاجپت رائے ہیں۔"

بہرحال پاک اشیا اس معنی میں بھی مسیح کا بدن اور خون ہیں، کہ ہر ایماندار جو عشاء میں شریک ہونے کے ذریعہ خداوند کی حضوری حاصل کرتا ہے، وہ فضل جو پاک سکرامنٹوں کے ذریعہ سے ملتا ہے، اور وہ فضل جو خلوتی دعا، کلام کی تلاوت اور عام عبادت سے حاصل ہوتا ہے جداگانہ نہیں۔ کیونکہ فضل دل میں خدا کی حضوری ہے۔ کوئی خاص "سکرامنٹی فضل" نہیں ہے۔ سکرامنٹ فضل کا خاص وسیلہ ہیں۔ لیکن خدا کا فضل صرف انہی میں محدود نہیں۔

ہم کسی نے لکھا ہے کہ شراکت میں ہر شریک روٹی اور مے کا حصہ پاتا ہے پر خداوند یسوع مسیح کُلّیتہً سب کو ملتا ہے۔

پولُس نے ا۔کرنتھیوں کے دسویں باب میں بتوں کی قربانی سے پاک شراکت کا مقابلہ کیا۔ اور یہ دکھاتا ہے کہ جب آدمی بھینٹ کا گوشت کھاتا تھا تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ بھینٹ میں اور قربانی میں شریک ہوتا تھا۔ اسی طرح سے عشائے ربانی میں شریک ہوتے وقت مسیحی اپنے خداوند اور اُس کی قربانی میں شریک ہوتا ہے۔

۵۔ لوتھرن کلیسیاؤں میں ایک خاص تعلیم دی جاتی ہے۔ یعنی یہ کہ مسیح کا جلیل بدن ہر جگہ الٰہی اور آسمانی طور پر موجود ہے۔ پاک شراکت کے وقت جو کوئی روٹی اور مے کھاتا پیتا ہے اُس کو مسیح کا جلیل بدن ملتا ہے لیکن صرف ایماندار اس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں، بے ایمان مجرم ٹھہرتے ہیں۔ یہ بتایا جاتا ہے

کہ مسیح کا بدن اشیا میں اور ان کے ساتھ ہے۔ اگرچہ یہ خیال دل کش ہے۔ لیکن اس کو پاک کلام سے ثابت کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

زونگلی (Zwingli) کی یہ تعلیم تھی کہ پاک شراکت یادگاری ہے۔ پر ساتھ ہی اس نے یہ بتایا کہ شرکا مسیح کا آسمانی بدن کھا کر خاص فضل حاصل کرتے ہیں۔ لیکن ان کے پیروؤں میں سے بعض نے اس ضروری امر کو نظر انداز کیا، اور سکھایا کہ یہ محض یادگاری ہے۔ یوں انھوں نے عشائے ربّانی کو ایسا سمجھا کہ اس کو سکرامنٹ کہنا مشکل ہو گیا۔ یہ نہ صرف نشان ہے پر موثّر نشان ہے۔

پر عموماً پراٹیسٹنٹ کلیسیائیں مانتی ہیں کہ پاک اشیا نہ صرف مسیح کے کاموں کو دکھاتی ہیں، بلکہ مسیح کو اور جو کھاتا پیتا ہے وہ مسیح سے ملتا ہے اور اس کی روح مسیح سے روحانی تقویت پاتی ہے۔

۶۔ اس بات میں شک نہیں کہ خداوند یسوع نے ایک روٹی لے کر توڑی اور ایک پیالہ بانٹا۔ لیکن فی زمانہ بہت سی کلیسیاؤں میں الگ الگ پیالیاں استعمال ہوتی ہیں۔ اور بعض میں بے خمیری روٹی کے چھوٹے چھوٹے الگ الگ ٹکڑے (wafer) جو بسکٹ کی مانند ہوتے ہیں۔ خادم کا خیال یہ ہے کہ پاک شراکت کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ایک ہی روٹی کے ٹکڑے اور ایک ہی مشترک پیالہ استعمال ہو۔ بہر حال اس طریقہ پر اتنا زور نہ دینا چاہیئے کہ اور طریقے ناجائز ٹھہرائے جائیں۔ مسیحی دین رسموں کی باریکیوں پر زور نہیں دیتا ہے، بلکہ ایسا کرنا مسیحی دین کی خاصیت کے خلاف ہے۔

بعض کلیسیاؤں میں خادمِ دین پاک شراکت کو عمل میں لاتے وقت میز کے سامنے یا اس کے ایک سرے پر کھڑا ہوتا ہے، بعض میں میز کے پیچھے۔ کلیسیائے روم میں دونوں طریقے استعمال ہوتے ہیں۔ اگرچہ عموماً خادمِ دین میز کے سامنے کھڑا ہوتا ہے بعض کلیسیاؤں میں خادمِ دین آپ ساری رسم کو ادا کرتا ہے، بعض میں اس کے مددگار بھی ہوتے ہیں بعض میں خادمِ دین خود پاک اشیا بانٹتا ہے بعض میں چنے ہوئے عہدہ دار اس کے ہاتھ سے لیکر شرکا کو بانٹتے ہیں بعض کلیسیاؤں میں انگلکانی میتھوڈسٹ شرکا پاک میز کے سامنے گھٹنے ٹیک کر روٹی اور مے لیتے ہیں۔ بعض میں وہ اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہوئے لیتے ہیں۔ بعض کلیسیاؤں میں خادمِ دین سب سے پہلے پاک اشیا کھاتا اور پیتا ہے بعض میں دیگر شرکا کے بعد۔ اکثر کلیسیاؤں میں خادمِ دین کھڑے ہو کر تقدیس کی دعا پڑھتا ہے۔ اکثر میتھوڈسٹ کلیسیاؤں میں وہ گھٹنے ٹیک کر تقدیس کرتا ہے۔

یہ تمام باتیں ایسی ہیں جو اس سکرامنٹ کے جوہر کے باہر ہیں لہٰذا ان پر زور دینا مناسب نہیں۔

۷۔ پولس نے لکھا کہ جو کوئی نامناسب طور پر روٹی کھاتا اور مے پیتا ہے وہ خداوند کے بدن اور خون کے بارے میں قصوروار ہوگا۔ اور نیز یہ "جو کھاتے پیتے وقت خداوند کے بدن کو نہ پہچانے وہ اس کھانے پینے سے سزا اٹھائے گا" (۱۔کرنتھیوں ۱۱-۲۷۔ اور ۲۹) یقیناً یہاں اشارہ خداوند کے بدن کی طرف ہے۔ پر چونکہ اس خط میں اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ کلیسیا خداوند کا بدن

ہے اور کرنتھی مسیحیوں میں پھوٹ تھی، غالباً یہ خیال کہ بدن سے کلیسیا مراد ہے، نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کیونکہ شریک ہوتے وقت کلیسیا کی شراکت مدِنظر رکھنا چاہیئے۔ یہ پاک شراکت نہ صرف انفرادی ایماندار کی خداوند سے شراکت ہے، بلکہ تمام کلیسیا کے ساتھ۔ آسمانی کلیسیا بھی شامل ہے۔ جیسا دعائے عام کی کتاب میں مرقوم ہے "فرشتوں اور مُقرب فرشتوں اور کل آسمانی گروہ کے ساتھ ہم تیرے جلیل نام کی حمد و تعظیم کرتے ہیں۔"

۸۔ پاک شراکت کو عمل میں لانا کل کلیسیا کی کہانت کا کام ہے۔ اس لئے اکثر کلیسیاؤں میں صرف وہ اشخاص جو اس کام کے لئے کُل کلیسیا کی طرف سے اختیار پاتے ہیں، اس کی خدمت کرتے ہیں، اور عموماً یہ اختیار تقرر کے ذریعہ سے دیا جاتا ہے حالانکہ خاص بات یہ ہے، کہ اس سکرامنٹ کے خادم اس کے لئے مقرر ہوں۔ میز خادم ہی کی نہیں۔ کلیسیا کی نہیں بلکہ خداوند یسوع مسیح کی ہے بشپ مول (Moule) کے کہنے کے مطابق پاک شراکت میں مسیح "میز کے اوپر نہیں بلکہ میز پر ہے۔"

"Not on the Table, but at the Table"

۹۔ پاک شراکت کب کب عمل میں آئے؟ بعض کلیسیاؤں میں یہ ہر روز ہوتی ہے، بعض میں ہر اتوار کو اور نیز بڑے بڑے تہواروں پر، بعض میں ماہ میں ایک یا دو بار۔ فی زمانہ عشائے ربانی کی زیادہ قدر کی جاتی ہے۔ اور اس لئے زیادہ بار عمل میں آتی ہے۔ بعض کلیسیاؤں میں پاک عشا سال میں چار ہی بار منائی جاتی ہے۔ لیکن ان میں صحیح دستور یہ ہوتا ہے کہ چند دن تک خاص

عبادتوں میں اس کے لئے خاص تیاری کی جاتی ہے ۔

خداوند یسوع نے اس سکرامنٹ کو شام کے وقت مقرر کیا اور بہت سی کلیسیاؤں میں وہ شام کے وقت عمل میں آتی ہے لیکن بعض مسیحی اس کو نامناسب سمجھتے ہیں کیونکہ وہ بغیر کھائے پیئے اسے لینا بہتر جانتے ہیں اور یہ صبح کے وقت آسان ہوتا ہے ۔ خادم کی سمجھ میں یہ بھی بیرونی باتیں ہیں ۔ شرط صرف یہ ہے کہ توبہ کی جائے، اور رسم تعظیم کے ساتھ ادا کی جائے ۔

۱۰ ۔ پاک شراکت کس معنی میں قربانی ہے ؟ یہ تو مسیح کی قربانی کا دُہرانا نہیں ۔ یہ الفاظ مشہور ہیں "اُس نے اُس پر (صلیب پر) اپنے آپ کو ایک ہی بار نذر گذران کر کل جہان کے گناہوں کے لئے ایک پوری، کامل اور کافی قربانی چڑھائی ۔" لیکن کلیسیائے روم میں پاک عشا خداوند کی قربانی کو دُہرانا ہے ۔ یہ خیال بائیبل کے اعتبار سے بے بنیاد ہے ۔ بہر حال حالانکہ ہم خداوند کی قربانی کو دُہرا نہیں سکتے تو بھی پاک شراکت کے وقت ہم اُس کو پیش کرتے ہیں اور مسیح کی شفاعت پیش کر کے مسیح کی قربانی کے ساتھ اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں "ہم اپنے آپ کو یعنی روح و جسم دونوں کو تیرے حضور نذر گذرانتے ہیں تاکہ تیرے لئے ذی عقل، مقدس اور زندہ قربانی بنیں ۔"

باب ہشتم
عاقبت
فصل اوّل
موت

۱۔ کسی نے کہا ہے "موت بہت بڑی چیز نہیں۔ بُری بات یہ ہے کہ ہم کو مرنا پڑے گا"۔ خداوند یسوع مسیح نے اپنی مرضی سے اپنی جان دی (یوحنا ۱۰-۱۸) پر ہماری موت، خودکشی کو چھوڑ کر، ہماری مرضی پر موقوف نہیں۔ اس وجہ سے انسان کو موت کا ڈر رہتا ہے۔ تندرست آدمی جس کی عقل ٹھکانے ہے، اس کو ہر موقع پر نہیں سوچتا تو بھی جب سوچتا ہے تو اُسے خوف ہوتا ہے۔ ہمارے عزیز واقارب ہم سے الگ ہو جاتے ہیں، اور ہم ان کو پھر نہیں دیکھتے۔ الف لیلہ میں اکثر کہانیوں کے آخر میں یہ فقرہ آتا ہے "صحبتوں کو درہم برہم کرنے والی موت آپہنچی"۔ موت رنج اور ماتم کا ایک سبب ہے ـــ

آخرت کے بارے میں ہمارا کچھ بھی نظریہ ہو، مگر موت ہماری دنیاوی زندگی کو ختم کردے گی۔

۲۔ پیدائش کی کتاب میں نیک و بد کی پہچان کے درخت کا ذکر ہے اور یہ مرقوم ہے کہ خدا نے فرمایا" نیک و بد کی پہچان کے درخت کا پھل کبھی نہ کھانا کیونکہ جس روز تو نے اُس سے کھایا تو مرا" (۲-۱۷) پر پیدائش سے صاف ظاہر ہے کہ لکھنے اور مرتب کرنے والے کا یہ مطلب نہ تھا کہ اسی روز جسمانی موت آجائے گی۔ کیونکہ بتایا جاتا ہے کہ اس کے کھانے کے بعد آدم اور حوّا بہت برس تک زندہ رہے۔ لیکن وہ خدا سے ڈرنے لگے اور باغِ عدن سے نکال دیئے گئے۔ اور خدا کی صحبت سے محروم ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ پیدائش کی کتاب میں موت سے روحانی موت مراد ہے۔

رومیوں کے پانچویں باب میں پولس ایسے ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے، جن سے پہلی نظر میں معلوم ہوتا ہے کہ جسمانی موت گناہ کا نتیجہ ہے۔ پر دو ایک باتیں قابلِ غور ہیں۔ (اوّل) پولس کو ضرور معلوم تھا کہ بائبل کے بیان کے مطابق آدم و حوّا درخت کا پھل کھاتے ہی جسمانی موت کے لقمہ نہ ہوئے اور اس لئے اُسے معلوم تھا کہ اُس بیان میں جسمانی ہی موت ہی کا ذکر نہیں (دوم) پولس خود موت کی تلخی یعنی اُس کی وہ صفات اور اُس کے وہ نتیجے جن کے سبب سے وہ ہولناک معلوم ہوتی ہے گناہ سے منسوب کرتا ہے (۱۔ کرنتھیوں ۱۵۔ ۵۶)۔ (سوم) پولس کے خیال میں بنی آدم محض افراد کا مجموعہ نہیں بلکہ اُن میں یگانگی ہے۔ گناہ اور اس کے نتیجوں کے لحاظ سے آدم اپنی نسل کا سردار ہے۔ اور اسی طرح سے خداوند

یسوع مسیح نے موت کو فتح کر کے بنی آدم کا فدیہ دیا یعنی جیسے انسان آدم کے گناہ کے سبب سے گناہ اور روحانی یا اخلاقی موت کے ماتحت ہوئے ویسے ہی خداوند یسوع کے کام کے سبب سے زندگی میں داخل ہوئے۔

یہ فیصلہ کرنا کہ اگر انسان کبھی گناہ نہ کرتے تو جسمانی موت میں مبتلا نہ ہوتے ممکن نہیں بے گناہ تو ایک ہی شخص رہا یعنی مسیح اور اس نے دعویٰ کیا۔ کہ میرا مرنا میری مرضی کے بموجب ہے (یوحنا۔۱۰۔۱۸) ارتقا کے لحاظ سے بھی اگرچہ معلوم ہے کہ آدمیوں کے حیوانی باپ دادا سب مرتے تھے تو بھی ہم نہیں کہہ سکتے کہ بے گناہی آدمیوں کو موت پر غلبہ نہ دلاتی۔ مگر یہ نتیجہ نکالنا بہتر معلوم ہوتا ہے کہ گناہ کے سبب سے جسم کی موت پیدا نہ ہوئی۔ بلکہ وہ تمام باتیں جن سے موت ڈراؤنی چیز بنی رہی۔ اگر ہم کو دوسرے جہان میں پوری اور کامل زندگی بسر کرنے کا علم ہوتا جس میں ہم کو خدا کی صحبت ہمیشہ حاصل ہوتی رہے گی، تو موت کا ڈنک نہ رہتا۔

پرانے وقت میں قریب قریب سب آدمی مانتے تھے کہ موت کے بعد کس قسم کی زندگی رہے گی لیکن عموماً یہ سمجھتے تھے کہ وہ زندگی پژمردگی کے برابر ہوگی عبرانی بھی یہی مانتے تھے جیسے زبور سے ظاہر ہے (زبور۔۸۸۔۱۰ ۱۵-۱۷ ۶۰ ۵۰ وغیرہ۔ نیز ایوب۔۱۰۔۲۱ اور ۲۲)۔ یہ بات مشہور ہے کہ مسیح کے وقت میں بھی اسرائیلی مذہب کے عہدہ دار جو صدوقی تھے قیامت کو نہیں مانتے تھے۔ (مرقس۔۱۲۔۱۸ ÷ اعمال۔۲۳۔۸)۔ بعد کو بعض دینوں میں تناسخ (آواگون) سکھایا گیا یعنی یہ تعلیم تھی کہ آدمیوں کی روحیں بار ہا اسی زندگی میں پیدا ہوتی ہیں

اور یہ ہندومت اور بودھ مذہب دونوں میں ایک بوجھ اور بُرائی سمجھا جاتا ہے۔

۳۔ نئے عہدنامے میں یہ خیال قلم بند ہے کہ موت مسیح کے پاس جانے کا راستہ اور ذریعہ ہے۔ یہاں تک کہ پولس لکھتا ہے "زندہ رہنا میرے لئے مسیح ہے اور۔ اور مرنا نفع .... میں نہیں جانتا کہ کسے پسند کروں میں، دونوں طرف کھنچا ہوا ہوں۔ میرا جی تو یہ چاہتا ہے کہ کوچ کرکے مسیح کے پاس جا رہوں کیونکہ یہ بہت ہی بہتر ہے" (فلپیوں ۱-۲۱ سے ۲۳ تک) چنانچہ ایماندار مسیحی کو موت سے نہ ڈرنا چاہیئے اور بہت سے ایماندار اس خوف سے بچتے ہیں۔ عبرانیوں کے نام کے خط میں بتایا گیا ہے کہ یہ بےخوفی پیدا کرنا مسیح کی موت کا ایک مقصد تھا کہ وہ "موت کے وسیلہ سے اُس کو جسے موت پر قدرت حاصل تھی، یعنی ابلیس کو تباہ کردے اور جو عمر بھر موت کے ڈر سے غلامی میں گرفتار رہے، انھیں چھڑا لے۔"

۴۔ ہماری دُنیاوی وجسمانی زندگی میں ہمارا ہوش، ہماری عقل، ہمارے ارادے، ہماری محبت اور نفرت وغیرہ سب جسم پر موقوف ہیں۔ جب مغز کو سخت چوٹ پہنچتی ہے یا اُس کے اندر کوئی رگ پھٹ جاتی ہے تو آدمی بےہوش ہوجاتا ہے اور اس کی عقل بےکار ہوجاتی ہے۔ اس سے بعض دہریہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جب مغز جسم کے ساتھ مرجاتا ہے تو ہوش یعنی روح آدمی کی شخصیت اُس کے ساتھ فنا ہوتی ہے۔ لیکن نہ صرف جسم کا روح پر اثر پڑتا ہے، بلکہ جسم پر روح بھی تاثیر کرتی ہے۔ یہ بات مشہور ہے اور ڈاکٹر مانتے ہیں کہ عقل کا جسم پر اثر پڑتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ بیمار کسی بات کی فکر نہ کرے۔ جن کی انتڑیوں

میں پھریاں ہوجاتی ہے، اُن کے لئے جو ہدایتیں چھپکر انگلستان کے اسپتالوں میں ان کو دی جاتی ہیں، اُن میں ایک یہ ہے کہ فکر نہ کریں۔ نیز ارادہ سے جسم حرکت کرتاہے۔ مثلاً آپ کسی کمرہ میں جائیں اور دیکھیں کہ ایک شخص اس کے باہر کے دروازہ کی طرف چلتاہے۔ آپ کو دیکھکر وہ سلام کرتا اور بیٹھ جاتاہے۔ غالباً ادب کے خیال سے۔ آپ کہیں گے "کیا آپ کہیں جاتے ہیں" ؟ اگر وہ کہے کہ "نہیں کوئی ضروری کام نہیں۔" اور بیٹھ جائے تو نتیجہ نکلتا ہے، کہ ایک کام کے خیال اور ارادہ سے جو نہ ہوا اور شاید کبھی نہ ہوگا۔ اُس کا جسم منتقل ہوا یعنی ایک غیر موجود چیز سے جو ہمیشہ کے لئے غیر موجود ہوگئی۔ اس کا مادی جسم ایک جگہ سے دوسری جگہ محض اس کے ارادہ کے زور سے چلا۔ بے شک جسم اور روح کا تعلق گہرا ہے۔ اس زندگی میں اس تعلق کا ٹوٹنا موت ہے پر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ روح زندہ نہیں رہتی۔

۵۔ بعض لوگوں نے کوشش کی کہ اپنے آپ کو اس بات سے تسلی دیں۔ کہ اگرچہ فرداً فرداً آدمی مرتے ہیں، لیکن آدم زاد کی نسل قائم رہتی ہے۔ اور مرے ہوؤں کا اثر قائم رہتاہے۔ حالانکہ برائے بحث ہم اس بات کو تسلیم بھی کریں، کہ اس میں تسلی ہے تو بھی یہ بات معلوم ہے کہ وہ دن آئے گا، کہ یہ دنیا انسان کے رہنے کے قابل نہ رہے گی، جیسا تمام سائنس کے عالم مانتے ہیں۔ درحقیقت نہ محض ہر شخص بلکہ تمام بنی آدم کی ذات پر موت کا فتویٰ ہوگیا ہے۔

فصل دوم
قیامت

۱۔ جیسا فصل اوّل میں مرقوم ہے قدیم زمانہ کے لوگ اور فی زمانہ غیر شائستہ قوموں کے لوگ مانتے تھے اور مانتے ہیں کہ موت کے بعد انسان کو کسی قسم کی زندگی ملے گی۔ مصر کے لوگ قیامت کو مانتے تھے اور اس لئے مردوں کی لاشوں میں ادویات بھر کر اُن کو سڑنے سے بچا لیتے تھے۔ یہ کام اس ملک میں جہاں بارش تقریباً ہوتی نہیں اور سینچائی دریائے نیل کے پانی سے ہوتی ہے ممکن تھا۔ نیز بعض ملکوں میں اکثر لاشوں کے ساتھ اس زندگی کے اوزار قبر میں رکھے جاتے تھے، تاکہ دوسرے جہان میں اُن کی بھی روحیں کام آئیں۔ کیونکہ اکثر ایسے ایسے لوگ مانتے ہیں کہ ہر شئے میں روح ہوتی ہے۔ بعض ملکوں میں بڑے آدمیوں کے غلام قتل کئے جاتے تھے اور اُن کے ساتھ دفن ہوتے تھے تاکہ دوسرے جہاں میں اُن بڑے آدمیوں کے پاس نوکر ہوں۔

رفتہ رفتہ بعض ملکوں میں تناسخ (آواگون) کا عقیدہ پیدا ہوا خاصکر ہندوستان میں۔ نیز یونان کے بعض فلسفیوں مثلاً سقراط اور افلاطون نے دعویٰ کیا اور ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انسان کی روح غیر فانی ہے۔ اسرائیلی جیسا پہلی فصل میں مرقوم ہے، شروع میں دیگر کم پڑھی لکھی قوموں کی طرح مانتے تھے کہ کسی قسم کی زندگی جو پژمردگی کے برابر سمجھی جاتی تھی، انسان کو موت کے بعد حاصل ہوگی لیکن آخرکار قیامت کا ذکر ہونے لگا۔ جو خاک میں سو رہے ہیں اُن میں سے بہتیرے جاگ اُٹھیں گے

بعض حیات ابدی کے لئے اور بعض رسوائی اور ذلتِ ابدی کے لئے" (دانی ایل۔ ۱۲-۲ ، نیز دیکھو یسعیاہ ۔ ۲۹-۱۸)۔ خداوند یسوع مسیح کے زمانے میں لوگ ابدی حیات کی تلاش میں تھے اور فریسی قیامت کو مانتے تھے۔ (دیکھو مرقس ۔۱۰۔ ۱۷) درحقیقت قیامت کی تعلیم دینِ یہودیہ اور دین عیسوی اور دین اسلام میں دی جاتی ہے لیکن اور بڑے بڑے مذاہب میں نہیں۔ بائبل میں انسان کی روح کے غیر فانی ہونے کی تعلیم نہیں ملتی۔ حالانکہ اکثر مسیحیوں نے مانا کہ انسان کی روح غیر فانی ہے لیکن اگر انسانی روح کو بقا حاصل ہی ہے۔ تو بھی وہ بذاتہ غیر فانی نہیں۔ "بقا اُسی کو (خدا کی) ہے"۔ "جب سے (مسیح نے) موت کو نیست اور زندگی اور بقا کو...... روشن کر دیا"۔ (۱ تمتھیس ۔ ۶-۱۶ ؛ ۲ تمتھیس ۔ ۱-۱۰)

۳ ۔ خداوند یسوع مسیح نے سکھایا کہ قیامت ہے۔ جیسا پہلی تین انجیلوں میں مذکور ہے (متی ۲۲ ۔ ۲۳ سے ۳۳ تک ۔ مرقس ۔ ۱۲-۱۸ ۔ سے ۲۷ تک + لوقا ۔ ۲۰-۲۷ سے ۳۸ تک) یہ آیات دیکھنے کے قابل ہیں۔ خداوند نے فرمایا کہ خدا نے کہا کہ "میں ابرہام کا خدا اور اسحاق کا خدا اور یعقوب کا خدا ہوں۔" اور یہ بھی فقرہ خداوند کے منہ سے نکلا "وہ تو مُردوں کا خدا نہیں بلکہ زندوں کا ہے"۔

اس کا یہ مطلب ہے کہ جب خدا نے اُن بزرگوں کو اپنی رفاقت عنایت فرمائی، تو اُن کو زندہ بھی رکھا جس کو خدا کی نزدیکی حاصل ہوتی ہے وہ زندہ رہے گا۔ نیز خداوند نے فرمایا "جو کوئی بیٹے کو دیکھے اور اُس پر ایمان لائے...... میں اُسے آخری دن پھر زندہ کروں گا" (لفظی ترجمہ "اٹھاؤں گا")۔ (یوحنا ۔ ۲-۴۰ + نیز دیکھو ۱۱ ۔ ۲۵ اور ۲۶)

موت میں سب سے بُری بات یہ ہے کہ نیک لوگ اور وہ اشخاص جن سے ہم محبّت رکھتے ہیں نظر سے غائب ہو جاتے ہیں۔ اور اگر یہ خیال ہو کہ وہ بالکل جاتے رہتے ہیں تو ہم اور بھی بیزار ہوں گے۔ پر ہمارے خداوند کے مذکورۂ بالا قول سے اُمید پیدا ہوتی ہے کہ وہ جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں زندہ رہیں گے۔ مکاشفہ کی کتاب میں مرقوم ہے کہ "مبارک ہیں وہ مُردے جو اب سے خداوند میں مرتے ہیں"۔ (مکاشفہ ۱۴-۱۳)

۳۔ نیز ہم مسیح کے اُس قول پر اس لئے بھروسا رکھ سکتے ہیں، کہ اُس نے پیشین گوئی کی کہ میں جی اُٹھوں گا، اور وہ درحقیقت جی اُٹھا، اور یہ واقعہ اس کے قول پر گویا مہر ہے۔ اگر وہ محض معمولی شخص ہوتا تو اس کی قیامت کوئی بڑی بات نہ ہوتی، حالانکہ باعث حیرت ہوتی۔ پر وہ بھی جو مسیحی نہیں یہ مانتے ہیں، کہ یسوع دنیا کے نہایت بڑے پیشواؤں میں سے ہے۔

بہت کم لوگوں کو خواہش ہو گی کہ ایسی ہی زندگی جیسی ہماری دنیاوی زندگی ہے، دوبارہ بسر کی جائے۔ یا ابد تک جاری رہے کیونکہ اس میں درد، غم، گناہ مصیبت، ناکامیابی، وغیرہ ہوا کرتی ہیں۔ پر قیامت کا یہ مطلب نہیں۔ بلکہ یہ کہ نئی زندگی یا یوں کہیں دوسرے جہان کی زندگی ملے گی۔ مگر یہ اور بات ہے۔

بعض جو قیامت کا مطلب نہیں سمجھتے یہ کہتے ہیں کہ بے جسم روح ہونا کوئی اچھی بات نہیں لیکن پاک کلام انسان کی روح کو غیر فانی نہیں ٹھہراتا۔ بقا صرف خدا کی صفت ہے۔ اور مسیح نے انسان کو بقا اور ابدی زندگی بخشی۔ (۱۔ تمتھیس ۶-۱۶، ۲ تیمتھیس ۱-۱۰)

۴۔ قیامت کی تشریح کرنتھیوں کے پہلے خط کے پندرھویں باب میں ملتی ہے۔ اُس باب میں روحانی جسم کا ذکر ہے "جسم فنا کی حالت میں بویا جاتا ہے (یعنی دفن ہوتا ہے) اور بقا کی حالت میں جی اُٹھتا ہے۔......... نفسانی جسم بویا جاتا ہے۔اور روحانی جسم جی اٹھتا ہے۔" (۱۵-۴۲ سے ۴۴ تک) اس کے موافق پولس کا ایک اور فقرہ ہے جو کرنتھیوں کے دوسرے خط میں ملتا ہے "جب ہمارا خیمہ کا گھر جو زمین پر ہے گرایا جائے گا، تو ہم کو خدا کی طرف سے آسمان پر ایسی عمارت ملے گی جو ہاتھ کا بنا ہوا گھر نہیں بلکہ ابدی ہے...... کیونکہ ہم اس خیمہ میں رہ کر بوجھ کے مارے کراہتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ یہ لباس اُتارنا چاہتے ہیں، بلکہ اس پر اور پہننا چاہتے ہیں تاکہ وہ جو فانی ہے زندگی میں غرق ہو جائے۔ (۵-۱-اور ۴)

پولس سکھاتا ہے کہ قیامت میں ہم غیر مجسم روح نہ ہوں گے، بلکہ ہم کو ایک روحانی جسم ملے گا۔اور وہ یہ بھی فرماتا ہے کہ "گوشت اور خون خدا کی بادشاہی کے وارث نہیں ہو سکتے اور نہ فنا بقا کی وارث ہو سکتی ہے" (۱- کرنتھیوں-۱۵-۵۰)

روحانی جسم کیسا ہوگا؟ اس کو سمجھنے کے لئے پہلے ہم نفسانی جسم اور روحانی جسم کا مقابلہ کریں۔نفسانی جسم ایسا جسم ہے جس کا قاعدہ مادی ہے اس کی حالت غذا اور تندرستی پر موقوف ہے۔ اور یہ باتیں اکثر اُس کی صورت سے ظاہر ہوتی ہیں، اور آدمی کو دیکھنے سے ہم رائے قائم کرتے ہیں، کہ آیا وہ تندرست ہے یا نہیں۔ نفسانی جسم کا دار ومدار اس کی حیوانی جان پر ہے۔

علیٰ ہذا القیاس روحانی جسم کا انحصار روح پر ہے۔ وہ نفسانی صحت وبیماری پر موقوف نہیں۔ نفسانی جسم روح پر بہت کم موقوف ہے اور وہ روحانی حالت کو بہت کم ظاہر کرتا ہے۔ بعض خوبصورت اور قوی شخصوں کی روحانی حالت بہت ابتر ہے اور بعض بیماروں اور کمزوروں کی روحانی صحت نہایت اچھی ہے۔ لیکن یہ نیا جسم جو قیامت میں ملے گا، روحانی حالت کے مطابق ہو گا نیز ہمارا موجودہ جسم روح کا کامل ذریعہ نہیں لیکن روحانی جسم روح کا کامل ذریعہ ہو گا۔

ہم رسولوں کا عقیدہ سناتے وقت اقرار کرتے ہیں، کہ ہم بدن کی قیامت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس کا مطلب مذکورۂ بالا آیات کے موافق ہے یعنی ہم کو روحانی جسم ملے گا۔ یا یوں کہیں، انسان روح وجسم سے مرکّب ہے۔ اس کی شخصیت کے لیے دونوں درکار ہیں اور قیامت میں بھی انسان روح اور روحانی جسم سے مرکّب ہو گا۔ اُس کی شخصیت ناقص نہ ہو گی۔ جسم کام، بتاد لۂ خیالات اور شناخت کا وسیلہ ہے۔ دوسرے جہان میں ایسا ہی ہو گا۔

پولس بتاتا ہے کہ اس نئی زندگی کی اُمید خدا کی قدرت پر موقوف ہے۔ "اگر اسی کا رُوح تم میں بسا ہوا ہے جس نے یسوعؔ کو مردوں میں سے جلایا، تو جس نے مسیح یسوعؔ کو مُردوں میں سے جلایا وہ تمھارے فانی بدنوں کو بھی اپنے اُس روح کے وسیلہ سے زندہ کرے گا جو تم میں بسا ہوا ہے۔" (رومیوں ۸۔۱۱) یہاں قریب قریب سب باتیں ہیں۔ خدا کی قدرت، مسیح کی قیامت، روح القدس کی سکونت، جس نے روح القدس پایا وہ زندہ کیا جائے گا۔

یہ بے شک سچ ہے کہ ہم جو نفسانی جسم کے لوگ ہیں۔ ہمارا خیال نہیں

کر سکتے کہ روحانی جسم کیسا ہوگا۔ اس کی چند ضروری صفات بیان کی گئی ہیں۔ پولس اس بات سے بخوبی واقف تھا۔ "جو چیزیں نہ آنکھوں نے دیکھیں نہ کانوں نے سُنیں نہ آدمی کے دل میں آئیں وہ سب خدا نے اپنے محبت رکھنے والوں کے لئے تیار کر دیں (۱۔کرنتھیوں ۲۔۹) یہ گمان کرنا کہ گویا دوسرے جہان کی حدود اور اس کا کُل تشدید و فراز ایسے بتائے جا سکتے ہیں، جیسا ملک کی حالت جغرافیہ کی کتاب میں بتائی جاتی ہے احماقت ہے۔ پاک کلام کا یہ دعویٰ نہیں۔ حالانکہ اُس میں وہ سب باتیں بتائی گئی ہیں، جن کا علم ہماری نجات اور تسلی کے لئے درکار ہے۔ نیز بہت کچھ مثلاً مکاشفہ کی کتاب میں لکھا گیا ہے تمثیلی طور پر لکھا گیا ہے۔ اس جہان کی زبانیں جو اس جہان کے کاموں کے لئے اور اُن کے ذریعہ سے بنی ہیں وہ آنے والے جہان کے بیان میں قاصر ہیں۔

۵۔ جو کوئی اچھی شخصیتوں کے قائم رہنے میں شک کرتا ہے، وہ یا تو خدا کی یا انسان کی توہین کرتا ہے۔ یا تو وہ یہ خیال کرتا ہے، کہ خدا انسان سے محبت نہیں رکھتا یا شاید خدا کو اُسے زندہ رکھنے کی قدرت حاصل نہیں۔ یا وہ یہ سمجھتا ہے کہ بہترین شخص کی شخصیت ایسی ناقص ہے، کہ اُس کا باقی رہنا یا فنا ہو جانا دونوں برابر ہیں۔

فصل سوم

عدالت ۔ سزا و جزا

۱۔ اٹھارویں صدی کے انگریز مصنف ڈاکٹر سموئیل جالنسن سے کسی نے دریافت کیا کہ وہ موت سے کیوں بہت ڈرتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا۔ "میرے خالق نے فرمایا کہ وہ بعض لوگوں کو اپنی بائیں طرف کر دے گا۔" سچ ہے کہ بائبل اور خاص کر نیا عہدنامہ عدالت کا بہت دفعہ ذکر کرتا ہے۔ جب حساب لگایا جاتا ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمارے خداوند کی تمثیلوں میں سے تقریباً پچاس فی صدی عدالت کے بارے میں ہیں۔

عدالت کے بارے میں بہت سے سوال کئے جاتے ہیں مثلاً یہ کہ آیا نیک غیر مسیحی نجات پائیں گے۔ اس کی نسبت ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پولس رسول نے رومیوں کے خط کے دوسرے باب میں ایسے جملے لکھے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ سکھاتا ہے کہ ایسے لوگ اس شریعت کے موافق جانچے جائیں گے جو اُن کے دلوں میں لکھی ہے (۲: ۱۳۔ اور ۱۴) نیز جب شاگردوں نے پوچھا کہ آیا بہت کم لوگ نجات پائیں گے تو یسوع نے جواب دیا کہ "تنگ دروازہ سے داخل ہو" یعنی اپنی ہی نجات کی فکر کرو، اوروں کی بابت نہ پوچھو۔ ہم ایسی ایسی باتیں تو خدا پر چھوڑ سکتے ہیں، جیسا ابرہام نے کہا "کیا تمام دنیا کا انصاف کرنے والا انصاف نہ کرے گا" ؟ (لوقا ۱۳: ۲۴، پیدائش ۱۸: ۲۵)۔ خدا کا شکر ہو کہ ہم انسانوں کو ایسے ایسے معاملوں کو فیصل کرنا نہیں پڑے گا۔ عدالت کو پورے

طور پر سمجھنا انسانی عقل کے باہر ہے۔

لیکن یہ صاف ظاہر کر دیا گیا کہ تمام آدمیوں کو خدا کے تخت عدالت کے سامنے جانا ہے۔

۲۔ عدالت اسی زندگی میں شروع ہوتی ہے۔ "میں دنیا میں عدالت کے لئے آیا ہوں، تاکہ جو نہیں دیکھتے وہ دیکھیں اور جو دیکھتے ہیں وہ اندھے ہو جائیں۔" (یوحنا۔ ۹۔ ۳۹) یعنی خوشخبری کو جو لوگ قبول کرتے ہیں۔ حالانکہ خدا سے ناواقف ہوں تو بھی واقف ہو جائیں اور جو خدا سے کسی قدر واقف ہیں پر خوشخبری کو قبول نہیں کرتے ان کے دل تاریک ہو جائیں۔ نیز یہ بھی مرقوم ہے "سزا کے حکم کا سبب یہ ہے کہ نور دنیا میں آیا، اور آدمیوں نے تاریکی کو نور سے زیادہ پسند کیا اس لئے کہ ان کے کام برے تھے۔" (یوحنا۔ ۳۔ ۱۹) جو امتیاز آخر کار نیکوں اور بدوں، ایمانداروں اور بے اعتقادوں میں کیا جائے گا اُس کا شروع اس موجودہ زندگی میں ہوتا ہے۔ ہر شخص خود اس وقت اپنے آپ کو سزا یا جزا کے لائق ٹھہراتا ہے۔

۳۔ بہرحال عدالت ہونے والی ہے۔ وہ آئندہ میں ہے۔ "آدمیوں کے لئے ایک بار مرنا اور اس کے بعد عدالت کا ہونا مقرر ہے۔" (عبرانیوں۔ ۹۔ ۲۷) "جب ابنِ آدم اپنے جلال میں آئے گا ...... تب وہ اپنے جلال کے تخت پر بیٹھے گا" الخ (متی۔ ۲۵۔ ۳۱) "ابنِ آدم اپنے فرشتوں کو بھیجے گا۔ اور وہ سب ٹھوکر کھلانے والی چیزوں اور بدکاروں کو اس کی بادشاہی میں سے جمع کریں گے (متی۔ ۱۳۔ ۴۱) "ہم تو سب خدا کے تختِ عدالت کے آگے کھڑے ہوں گے۔" (رومیوں۔ ۱۴۔ ۱۰) یسوع مسیح ...... زندوں اور مردوں کی عدالت کرے گا۔"

(۲-تمتھیُس-۴-۱)

مذکورہ بالا چند آیات تمام نئے عہد نامہ کی تعلیم ظاہر کرتی ہیں۔ نیز دانی ایل کے صحیفہ میں عدالت کا ذکر ہے (۱۲-۲ ، ۷-۹-۱۰) یہ بھی غور طلب بات ہے کہ جہاں کہیں عدالت کا ذکر آتا ہے وہاں صرف دو قسم کے لوگوں کا ذکر ہے۔ وہ جن کو خدا قبول کرے گا، اور وہ جن کو وہ رد کر دے گا کسی درمیانی درجہ کا ذکر نہیں۔

۴۔ نیا عہد نامہ سکھاتا ہے کہ آخری عدالت میں انصاف کرنے والا خود خداوند یسوع مسیح ہوگا۔ "باپ کسی کی عدالت نہیں کرتا بلکہ اس نے عدالت کا سارا کام بیٹے کے سپرد کیا ...... بلکہ اُسے عدالت کرنے کا بھی اختیار بخشا اس لئے کہ وہ آدم زاد ہے" (یا "ابن آدم ہے") (یوحنا۔ ۵۔ ۲۲-۱ اور ۲۷) حتی کے ۲۵ ویں باب کی ۳۱ ویں آیت میں بھی یہی تعلیم ہے۔ پولس نے اتھینے میں کہا "اس نے (خدا نے) ایک دن ٹھہرایا جس میں وہ راستی سے دنیا کی عدالت اس آدمی کی معرفت کرے گا، جسے اس نے مقرر کیا" اعمال۔ ۱۷-۳۱۔ نیز دیکھو ۲-تمتھیُس-۴-۱)

اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ بیٹا اس لئے عدالت کرے گا کہ وہ انسان بنا کیونکہ (اول) وہ تمام بنی نوع انسان کا نمائندہ ہے، جس کو پولس دوسرا آدم ٹھہراتا ہے۔ (رومیوں۔ ۵-۱۲- سے ۱۹- تک) (دوم)۔ وہ حقیقی انسان بنا اور اپنی بشریت کے دنوں میں انسانی حیثیت کا تجربہ کیا۔ بلکہ "وہ سب باتوں میں ہماری طرح آزمایا گیا تو بھی بے گناہ رہا۔" (عبرانیوں۔ ۴-۱۵)۔ ہمارا انصاف کرنے والا وہ پُر محبت یسوع ہے۔" جو ہماری کمزوریوں میں ہمارا ہمدرد ہے۔ (عبرانیوں ۴-۱۵) اور جس نے ہم گنہگاروں کے لئے کوہِ کلوری پر اپنی جان دی۔

۵۔ عدالت کے کیا کیا اصول ہوں گے ؟ اول تو ہر ایک آدمی کا موقع مدِ نظر رہے گا۔" وہ نوکر جس نے اپنے مالک کی مرضی جان لی اور...... اُس کی مرضی کے موافق عمل نہیں کیا بہت مار کھائے گا۔ مگر جس نے نہ جان کر مار کھانے کے کام کئے وہ تھوڑی مار کھائے گا" (لوقا ۱۲۔ ۴۷۔ ۴۸)۔ اس جملہ سے یہ بھی ظاہر ہے کہ سب ایک ہی سزا میں گرفتار نہ ہوں گے۔ نیز اُسی آیت میں یہ بھی مرقوم ہے" جسے بہت دیا گیا اُس سے بہت طلب کیا جائے گا"

دوم۔ متی کے ۲۵ ویں باب سے بلکہ مسیح کی اور تعلیم سے ظاہر ہے کہ اس بات پر زور دیا جائے گا کہ آدمیوں نے کیا کیا اچھے کام کئے۔ بے وقوف کنواریوں کے بارے میں یہ نہیں لکھا گیا کہ انھوں نے جھگڑا کیا یا شراب پی' یا دلہا دلہن کو گالی دی پر فقط یہ کہ انھوں نے کپیوں میں تیل نہیں لیا۔ دولت مند کی بابت یہ نہیں بتایا جاتا ہے کہ وہ ظالم یا بددیانت یا بدنام کرنے والا تھا فقط یہ کہ ایک غریب لعزر اس کے پھاٹک پر رکھا جاتا تھا اور اس نے کوئی پروا نہ کی۔ آخری عدالت کی تمثیل میں یہ ظاہر کیا گیا کہ معیار یہ ہوگا کہ آیا آدمیوں نے بھلے کام کئے یا نہیں کئے۔ بدی سے پرہیز کرنے کا ذکر ہی نہیں۔

سوم۔ ہر انسان کو اس کے کاموں کے مطابق بدلا دیا جائے گا۔" وہ (خدا) ہر ایک کو اُس کے کاموں کے موافق بدلا دے گا" (رومیوں ۲۔ ۶)" ابنِ آدم اپنے باپ کے جلال میں...... آئے گا۔ اُس وقت ہر ایک کو اس کے کاموں کے موافق بدلا دے گا" (متی ۱۶۔ ۲۷ + نیز دیکھو زبور ۶۲۔ ۱۲ ' امثال ۲۴۔ ۱۲ ' یرمیاہ ۱۷۔ ۱۰) شاید پہلی نظر میں اس بات پر تعجب ہوگا کہ ان سب آیات

میں ایمان کا ذکر نہیں لیکن خداوند یسوع نے اس کا بھی ذکر کیا" خدا کا کام یہ ہے۔ کہ جسے اُس نے بھیجا ہے، اُس پر ایمان لاؤ" (یوحنا ۶-۲۹) اور پولس بھی لکھتا ہے " جو مسیح یسوع میں ہیں، اُن پر سزا کا حکم نہیں کیونکہ زندگی کے روح کی شریعت نے مسیح یسوع میں مجھے گناہ اور موت کی شریعت سے آزاد کر دیا" (رومیوں ۸-۱-۲) درحقیقت آدمی اپنے آپ کو اتنی آسانی سے دھوکا دیتے ہیں کہ اندیشہ ہے (جیسا تجربہ دکھاتا ہے) کہ بعض وقت اپنے آپ کو ایمان رکھنے والے سمجھیں جب کہ اُن کے کام اُن کے ایمان کے دعویٰ کو جھٹلاتے ہوں۔ (یعقوب ۲-۱۴ سے ۲۰ تک) اور یہ بھی لکھا گیا کہ" جو راستبازی کے کام کرتا ہے۔ وہی...... راستباز ہے" (۱-یوحنا ۳-۷) ایمان وہ وسیلہ ہے جس سے ہم مسیح میں شامل ہو جاتے اور نیکی کرنے کے قابل بنتے ہیں۔ اور نیکی یعنی راستبازی کے کام ایمان کا ثبوت ہیں۔ جو ایمان لاتا اور نیکی نہیں کرتا وہ مسیح سے الگ کیا جاتا ہے۔ (یوحنا ۱۵-۲)

چنانچہ فرماں برداری شرط ہے " جو مجھ سے اے خداوند، اے خداوند، کہتے ہیں، اُن میں سے ہر ایک آسمان کی بادشاہی میں داخل نہ ہوگا۔ مگر وہی جو میرے آسمانی باپ کی مرضی پر چلتا ہے" (متی ۷-۲۱- نیز دیکھو آیات ۲۲ سے ۲۷ تک)

۶۔ عدالت کب ہوگی؟ بہشت جغرافیہ کے کسی نقشہ میں نہیں ملتی اور عدالت آنے والے جہان اور ابدیت کا معاملہ ہے۔ ایسے معاملہ کی بابت یہ پوچھنا کہ کب ہوگا شاید غلط ہے۔ نئے عہد نامہ کے چند فقروں سے معلوم ہوتا ہے

کہ ممکن ہے کہ اُن کا مطلب یہ ہو کہ ہر شخص کی عدالت اُس کی موت کے وقت ہو گی۔
یسوع نے خود بتایا کہ "میرے باپ کے گھر میں بہت سے مکان ہیں" اور "اگر میں جا کر تمہارے لئے جگہ تیار کروں تو پھر آکر تمہیں اپنے ساتھ لے لوں گا کہ جہاں میں ہوں تم بھی ہو۔" (یوحنا ۱۴-۱- اور ۳) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایماندار موت کے وقت بہشت میں جائیں گے۔ نیز عبرانیوں کے خط میں مندرج ہے کہ ہم کو "صیّون کے پاس اور ...... کامل کئے ہوئے راستبازوں کی روحوں کے پاس آتے ہیں۔"
کیا راستبازوں کی روحیں اُن کی عدالت سے پہلے کامل کی جائیں گی ؟
بہرحال یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ نئے عہدنامہ کی عام تعلیم یہ معلوم ہوتی ہے کہ عدالتِ عام ہو گی اور وہ دُنیا کے آخر میں ہو گی۔ پر فیصلہ کرنا آسان نہیں۔ اگرچہ خداوند مسیح نے خود کہا کہ وہ ایمانداروں کو آخری دن زندہ کرے گا (عبرانیوں ۱۲-۲۲-۲۳، یوحنا ۶-۳۹-۵۴)

۷۔ یہ سوال لازم آتا ہے کہ آیا اُن لوگوں کو جو عدالت کے وقت خدا کی طرف سے منظور نہیں ہوں گے۔ دوسرا موقع ملے گا یا نہیں ؟ یہ صاف طور پر ظاہر ہے جیسا اوپر لکھا بھی گیا ہے کہ پاک کلام میں صرف دو قسم کے لوگوں کا ذکر ہے۔ وہ جو بہشت میں جائیں گے اور وہ جو سزا پائیں گے کہیں تیسرے درمیانی درجہ کے لوگوں کا ذکر نہیں۔ لیکن مندرجۂ بالا سوال کی مانند ایک اور سوال ہے۔ کیا اس زندگی کے بعد آخری عدالت سے پہلے اُن لوگوں کو جو اس زندگی میں راستباز نہیں ٹھہرائے گئے دوسرا موقع ملے گا ؟ دو جگہوں میں کچھ پتہ چلتا ہے۔ ایک میں بتایا جاتا ہے۔ کہ مسیح نے عالمِ ارواح میں جا کر قیدی روحوں کو خوشخبری سُنائی

یعنی اُن روحوں کو جو نوح کے وقت نافرمان تھیں نیز یہ بھی لکھا ہے " مُردوں کو بھی خوشخبری اسی لئے سنائی گئی تھی، کہ جسم کے لحاظ سے تو آدمیوں کے مطابق ان کا انصاف ہو لیکن روح کے لحاظ سے خدا کے مطابق زندہ رہیں"۔ (۱ پطرس ۳-۱۸ سے ۲۰ تک؛ ۴-۶) بعض کا خیال ہے کہ ہم اِن آیتوں سے یہ اصول نکال سکتے ہیں، کہ جن کو کافی موقع اس زندگی میں نہیں ملتا اُن کو عالم ارواح میں دوسرا موقع دیا جائے گا۔ اوّل تو ان آیتوں کا مطلب بہت صاف نہیں، اور یہ معلوم کرنا کہ پطرس کا کیا خیال ہے آسان نہیں۔ (دوم) پاک کلام کی دو آیتوں پر ایسا اہم مسئلہ قائم کرنا مشکل ہے۔

بہرحال جب ہم خدا کے انصاف اور راستی کو مدِ نظر رکھتے ہیں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس کسی کو انصافاً دوسرا موقع ملنا چاہیئے اُسے ملے گا نیز ماننا چاہیئے کہ یہ گنہگار روح توبہ کر سکتی ہے، اس نے توبہ کرنے اور ایمان لانے پر اُسے یقیناً نجات ملے گی۔ تو بھی اسی زندگی میں آدمیوں کی عادتیں ایسی پکی ہو جاتی ہیں کہ یہ اُمید رکھنا کہ موت کے بعد بدل جائیں گی آسان نہیں۔

۸۔ نئے عہدنامے کی یہ تعلیم ہے کہ راستباز خدا کی آسمانی بادشاہی میں داخل ہوں گے اور ہمیشہ خدا کی خوشی میں رہیں گے بہشت کی جو تمثیلیں مکاشفہ کی کتاب میں ملتی ہیں، اُن کی بابت یہ بات ہمیشہ مدِ نظر رہے کہ یہ تمثیلی طور پر اُن چیزوں کو بیان کرتی ہیں جو انسان کی سمجھ کے باہر ہیں۔ اُن کی تفصیلات پر زور دینا غلط ہے۔ ہم صرف اتنا نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ مرحوم مُقدّسین ازحد خوشی اور خرّمی حاصل کریں گے اور دنیا کی بُرائیوں سے محفوظ رہیں گے۔ مگر یقیناً روحانی

تجربہ میں ترقی کرتے رہیں گے۔ لاانتہا راستی حاصل کرنے کے لئے بہت زیادہ مدت کی ضرورت ہوگی۔

خداوند یسوع مسیح نے توڑوں اور اشرفیوں کی تمثیلوں میں سکھایا ہے کہ راستبازی اور اچھی خدمت کا صلہ اعلیٰ خدمت ہے "اے اچھے نوکر شاباش اس لئے کہ تو نہایت تھوڑے میں دیانتدار نکلا، اب تو دس شہروں پر اختیار رکھ" (لوقا۔ ۱۹۔ ۱۷، دیکھو متی ۲۵۔ ۲۱۔ اور ۲۳)۔ اسی لئے مسیحیوں کے یہاں یادگار کے پتھروں پر سالِ وفات بعض اوقات یوں دکھایا جاتا ہے "فلاں تاریخ اعلیٰ خدمت پر بلایا گیا۔

یہ جزا ابدی زندگی کہلاتی ہے۔ یہ ترجمہ "ہمیشہ کی زندگی" سے بہتر ہے۔ اس لئے کہ وہ یونانی لفظ "آئونیاس" (aionios) کو ادا کرتا ہے۔ یعنی وہ صفت جو آنے والے جہان اور ابدیت کے متعلق ہے۔ وہ زمانے کے انقلابوں سے محفوظ تو ہوگی پر خاص بات یہ ہے کہ وہ ابدیت کی زندگی ہوگی۔ یہ نہیں کہ وہ ختم نہ ہوگی، حالانکہ یہ بھی سچ ہے۔

۹۔ جو عدالت کے وقت سزا کے لائق ٹھہریں گے اُن کا کیا حال ہوگا؟

تمام نیا عہدنامہ سکھاتا ہے کہ وہ جہنم یعنی سزا کی جگہ یا سزا کی حالت میں پڑیں گے۔ ہمارے خداوند نے اس کو صاف طور پر دکھایا ہے۔ (اقتباس کی ضرورت نہیں دیکھو متی ۱۰۔ ۲۸، ۱۸۔ ۹، ۲۵۔ ۳۰۔ ۴۱۔ ۴۶، مرقس ۹۔ ۴۸، متی ۱۳۔ ۴۱۔ ۴۲) یہ سزا بھی ابدی یعنی دوسرے جہان اور ابدیت کے متعلق ہے۔ پاک کلام میں یہ نہیں بتایا جاتا ہے کہ گنہگار روحیں ابد تک ہوش رکھیں گی۔

اور زندہ رہیں گی کسی نے کہا " یہ مطلب نہیں ہو سکتا تعلیم تمثیل کے طور پر دی گئی ہے ورنہ وہ آگ جو نہیں بجھنے کی اس کیڑے کو کیوں نہ بھسم کرے " ؟ یہ فقرہ محض ہنسی کا معلوم ہوتا ہے لیکن وہ یہ حقیقت دکھاتا ہے کہ مسیح کے الفاظ تمثیل ہیں یعنی آگ اور کیڑا دونوں ایک ہی معنی رکھتے ہیں ۔

نئے عہدنامے کی چند آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شریر فنا ہو جائیں گے "۔ دوسری موت " کا ذکر ہے (مکاشفہ ۲۰-۱۴، ۲-۸) لیکن یاد رہے کہ یہ کتاب صنعتوں اور مثالوں سے بھری ہے ۔ نیز ہلاکت کا ذکر ہے (رومیوں ۹-۲۲، فلپیوں ۳-۱۹، ۲ تھسلنیکیوں ۱-۹، ۱ تمتھیس ۱-۹)۔ اگر آدمی ہلاک ہوں گے تو کیونکر زندہ رہیں گے ۔

اکثر مسیحیوں نے سمجھا کہ شریر تا ابد سزا کی مصیبت سہتے رہیں گے ۔ لیکن یہ کلام الٰہی میں صاف طور پر نہیں بتایا گیا ۔ ابدی زندگی خدا کی بخشش ہے ۔ لیکن ابدی موت اُس کی ضد ہے ۔ اور اس کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے ۔ کہ جن کو ابدی زندگی نہیں ملے گی وہ ابد تک کے لئے مریں گے ۔

(۱) غالباً انسان کی روح کا غیر فانی ہونے کا خیال جو بائبل میں نہیں سکھایا گیا ، یونانی فلسفے کا نتیجہ ہے ۔ اگر انسان کی روح بذاتہ غیر فانی ہوتی تو ازل سے ہوتی ۔

(۲) شریروں کا ہمیشہ عذاب میں رہنا خدا کی محبت کے خلاف معلوم ہوتا ہے ۔

(۳) آخرکار خدا سب میں سب کچھ ہوگا ۔ (۱ - کرنتھیوں ۱۵-۲۸)

اور اگر بدوں کی بدی ابدالآباد قائم رہے گی تو خدا سب میں سب کچھ نہ ہوگا یعنی بدی کا موجود رہنا خدا کی شان کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔

چنانچہ بعض عالموں نے سکھایا کہ شریر آخرکار سزا بھگتنے کے بعد نیست ہو جائیں گے۔ اوروں نے خیال کیا کہ اُن میں سے بہتیرے توبہ کر کے آخرکار نجات پائیں گے۔ اور بعض نے یہاں تک جرأت کی کہ یہ سکھایا کہ آخر میں سب آدمی نجات پائیں گے۔ پر اس کی طرف پاک کلام میں کوئی اشارہ نہیں ملتا بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بائبل کی تعلیم کے خلاف ہے۔

ہم کو اقرار کرنا پڑتا ہے۔ کہ خُدا نے ان باتوں کو صاف طور پر ظاہر کرنا گوارا نہیں کیا۔ یہ تو ضرور ظاہر ہوا کہ توبہ نہ کرنے والے شریروں کا حال نہایت ہولناک ہوگا۔ ہم ان باتوں کو خدا کے پُر محبت انصاف پر چھوڑیں اور خود تنگ دروازہ سے داخل ہونے کی کوشش کریں۔

۱۰۔ عالمِ ارواح۔ نئے عہد نامے میں دولت مند اور لعزر کی تمثیل میں اس کا ذکر آیا ہے۔ اور یہ بھی کہ اس میں آخری عدالت سے پہلے نیکوں اور بدوں میں فرق کیا جاتا ہے۔ وہ خوشی پائیں گے، اور یہ عذاب۔ ممکن ہے کہ یسوع نے اس تمثیل میں یہودیوں کے خیالات استعمال کئے تاکہ اُن ہی کو سبق سکھائے) کسی صورت میں مسیح وہاں ہوگا۔ "آج تو میرے ساتھ فردوس میں ہوگا" لوقا ۲۳۔ ۴۳) پولس نے لکھا۔ میرا جی یہ چاہتا ہے کہ کوچ کر کے مسیح کے پاس جا رہوں" (فلپیوں ۱۔ ۲۳)۔ بعض نے خیال کیا کہ اب عالمِ ارواح بہشت اور دوزخ میں داخل ہو گیا، پر بائبل میں اس کا ذکر نہیں۔

کلیسیائے روم سکھاتی ہے کہ بہت سے لوگ نہ تو بہشت کے قابل ہیں نہ دوزخ کے اور یہ اس غرض سے تکلیف پائیں گے تاکہ ان کے گناہ دور ہو جائیں۔ یہ تعلیم خلافِ عقل نہیں مگر پاک کلام سے نہیں نکلتی۔ اس لئے اس کو سکھانا غلط معلوم ہوتا ہے نیز اس کے ساتھ یہ سکھایا جاتا ہے کہ مقدسوں کے زائد نیک کاموں سے نیکی کا ایک خزانہ ہے اور اس خزانہ میں سے مرے ہوؤں سے نیکی منسوب کی جا سکتی ہے۔ یہ تعلیم نئے عہدنامہ کے خلاف ہے۔ (مثلاً یعقوب۔ ۴۔ ۱۷)

فصل چہارم

مسیح کی دوسری آمد

۱۔ مسیحیوں کے عقائدناموں میں یہ مسئلہ مرقوم ہے "جہاں سے وہ زندوں اور مردوں کی عدالت کے لئے آنے والا ہے"

پرانے عہدنامے میں خداوند کے دن کا بار بار ذکر ہے۔ یہ وہ دن ہے۔ جب خدا دنیا میں اپنی قدرت خاص طور پر دکھائے گا۔ اکثر اسرائیلیوں نے اس کا یہ مطلب سمجھا، کہ خداوند اسرائیل کو بچانے کے لئے اور قوم کو وسیع بادشاہی بخشنے کے لئے خاص کام کرے گا۔ اور نبیوں کو بتانا پڑا کہ خداوند کا دن جو وہ دن بھی کہلاتا تھا عدالت کا دن ہوگا "تم خداوند کے دن کی آرزو کیوں رکھتے ہو۔ وہ تو تاریکی کا دن ہے روشنی کا نہیں۔" (عاموس۔ ۵۔ ۱۸) "خداوند..... ناگہاں اپنی ہیکل میں آموجود ہوگا...... پر اس کے آنے کے دن کی کس میں تاب ہے؟"

...... کیونکہ وہ سُنار کی آگ ..... کی مانند ہے۔" (ملاکی ۳۔ ۱۔ اور ۲)

خداوند یسوع مسیح نے عدالت کے لئے اپنے آنے کا ذکر کیا اور اس کے کلام سے ظاہر ہے کہ یہی وہ دن یعنی خداوند کا دن ہوگا (متی ۲۵۔ ۱۹۔ ۳۱۔ سے ۳۳، مرقس ۱۳۔ ۲۶۔ ۳۵۔ وغیرہ) نیز نئے عہد نامے کی اکثر کتابوں میں خداوند کے دوبارہ آنے کا ذکر ہے مثلاً اعمال ۱۔ ۷، ۳۔ ۲۰۔ اور ۲۱ وغیرہ۔

۲۔ یہ بات غور طلب ہے کہ خداوند یسوع نے بتایا جیسا یوحنا کی انجیل میں مرقوم ہے کہ وہ ایماندار کی روح کو قبول کرنے کے لئے آئے گا۔ (یا کم از کم رسولوں کی) "اگر میں جا کر تمہارے لئے جگہ تیار کروں تو پھر آ کر تمہیں اپنے ساتھ لے لوں گا۔ تاکہ جہاں میں ہوں تم بھی ہو" (یوحنا ۱۴۔ ۳) یہ فقرہ ہم کو یہ بات ماننے کے لئے تیار کرتا ہے کہ مسیح کی ایک سے زیادہ آمدیں ہیں۔ اپنی موت کے بعد جی اٹھ کر وہ بہت جلد آ کر اپنے شاگردوں پر ظاہر ہوا (یوحنا ۱۴۔ ۱۸) ۔ وہ پھر روح القدس کے نزول میں آ موجود ہوا کیونکہ روح کی حضوری بیٹے کی حضوری ہے

جب ہم مرقس کے تیرھویں باب کو غور سے پڑھتے ہیں تو ظاہر ہوتا ہے، کہ اُس میں دو باتوں کا ذکر ہے یعنی یروشلیم کی بربادی جس کی بابت شاگردوں نے پوچھا (آیات ۳۔ اور ۴) اور مسیح کی دوسری آمد (دُنیا کا آخر) ہمیں پہچاننا چاہیئے کہ جب کبھی روح القدس کا کام بدیہی طور پر ظاہر ہوتا ہے اور جب انسان کی بدی بڑی آفتیں اور جنگیں برپا کرتی ہے تو ان موقعوں پر مسیح کی آمد برکت کے لئے یا سزا کے لئے ہوتی ہے۔

۳۔ علاوہ اِن کے نیا عہدنامہ صاف طور پر بتاتا ہے کہ خداوند یسوع کی ایک آخری آمد ہوگی۔ ممکن شاید اغلب ہے کہ بعض آیات جن کو لوگ اس آمد کے متعلق سمجھتے ہیں درحقیقت اور ہی بات بتاتی ہوں مگر نئے عہدنامے سے مسیح کی آخری آمد کو نکال دینا ناممکن ہے۔ ساری کتاب عاقبت، عدالت، اور خداوند کی آمد سے پُر ہے۔

یہ بے شک ماننا پڑتا ہے کہ خداوند کی آمد کا طریقہ سمجھ سے باہر ہے۔ اور یہ اس بات سے ظاہر ہے کہ بہت سی باتیں تشبیہی طور پر بتائی گئی ہیں۔ مثلاً بادلوں کے ساتھ مسیح کا آنا۔ پر تو بھی تمام بنی آدم پر یک لخت ظاہر ہونا۔ اجرام فلک، سورج، چاند اور ستاروں کا تاریک ہونا وغیرہ۔ (اعمال ۲-۲۰ میں جو ذکر ہے وہ شاید مسیح کی تصلیب کے دن کی تاریکی کی طرف اشارہ کرتا ہے)۔ نیز ذرا غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسا واقعہ جس کی کوئی مثال نہیں اُس کا بیان تشبیہہ کے سوا اور کسی طرح سے نہیں ہو سکتا۔

۴۔ اس آمد کے دو خاص مقصد بتلائے گئے ہیں۔ اوّل۔ عدالت (متی ۲۵-۳۱ والخ۔ ۱۳-۴۱۔ ۲-تھسلنیکیوں ۱-۷ وغیرہ۔) دوم۔ نجات پوری کرنا اور ایمانداروں کو بہشت میں داخل کرنا۔ (عبرانیوں ۹-۲۸ رومیوں ۱۳-۱۱، ۱-کرنتھیوں ۱۵-۴۹ اور ۵ وغیرہ۔ ۱-تھسلنیکیوں ۴-۱۶-۱۷ اور ۱۷) وہ بدی کو نیست کرنے، تمام بنی آدم کا انصاف کرنے، اور راستبازوں کو اپنے ساتھ لینے کے لئے بڑے جلال کے ساتھ آئے گا۔ ہمارے لئے اتنا جاننا کافی ہے۔

۵ - خداوند یسوع مسیح نے فرمایا کہ اُس کے آنے سے پہلے تمام دُنیا میں انجیل کی بشارت کی جائے گی (متی ۲۴ - ۱۴) یہ پیشین گوئی مرقس کی انجیل میں تو نہیں ملتی۔ مگر یاد رہے کہ اُس انجیل میں مسیح کی تعلیم بہت مختصر طور پر مرقوم ہے۔ نیز خداوند نے بتایا کہ اُس کے آنے سے پہلے بہت سے لوگوں کا ایمان کمزور ہو جائے گا۔ (متی - ۲۴ - ۱۲ ، لوقا - ۱۸ - ۸ ، ۲ - تھسلنیکیوں - ۲ - ۸)۔ لیکن مسیح کے ایک قول سے ظاہر ہے کہ انسان اس کی آمد کا وقت نہیں دریافت کر سکتا ہے: "اُس دن (یعنی آخری دن - خداوند کا دن) یا اُس گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا نہ آسمان کے فرشتے نہ بیٹا مگر باپ" (مرقس ۱۳ - ۳۲) یہ غور کرنے کے لائق ہے کہ اپنے جی اُٹھنے کے بعد یسوع نے کہا "ان وقتوں اور میعادوں کا جاننا جنہیں باپ نے اپنے اختیار میں رکھا تمہارا کام نہیں۔" (اعمال - ۱ - ۷) لیکن اس وقت یہ نہیں فرمایا کہ مجھے علم نہیں جس بات کا پتہ مسیح خود اپنی بشریت کے ایام میں نہیں جان سکتا تھا، اُس کو کوئی آدمی یقیناً نہیں معلوم کر سکتا بہتیروں نے کوشش کی، مگر اب تک کوئی کامیاب نہ ہوا۔ اور یقیناً کوئی کبھی کامیاب نہ ہوگا۔ ہمارے خداوند نے خود فرمایا کہ اس کی آمد ناگہاں ہوگی۔ (متی - ۲۴ - ۴۳ + دیکھو ۱ - تھسلنیکیوں - ۵ - ۲)

ہزارویں صدی عیسوی میں یورپ کے چند ممالک میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جب مسیح کی پیدائش سے ایک ہزار برس گذر جائیں گے تو اس کی آخری آمد ہوگی۔ اور بعض جگہوں میں لوگوں نے ہل جوتنا اور بیج بونا چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ بعض اطراف میں کال پڑ گیا۔

۶۔ مکاشفہ کی کتاب کے بیسویں باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ مسیح ایک ہزار برس تک بادشاہی کرے گا، اور شیطان بندھا رہے گا۔ اس کی نسبت یہ لکھنا لازم ہے کہ چونکہ مکاشفہ کی کتاب تشبیہوں سے بھری ہے اس لئے اُس کے کسی مضمون پر کوئی مسئلہ قائم کرنا جس کا نئے عہد نامے میں اور کہیں ذکر نہیں خطرہ سے خالی نہیں۔ یہ بات مشہور ہے کہ مکاشفہ نہایت مشکل کتاب ہے۔ جس زمانے میں وہ لکھی گئی اور بہت سی کتابیں تھیں جن میں اُسی قسم کے محاورے اور تمثیلیں استعمال ہوتی تھیں یہاں تک کہ اُس زمانے کے پڑھنے والے ہم سے بہت زیادہ مکاشفہ کی کتاب سمجھ سکتے تھے۔ یہ دیگر کتابیں گذرے سو برس سے پہلے مشکل سے دستیاب ہو سکتی تھیں۔ اس لئے اس کتاب پر جو رائے عالموں نے چھٹی صدی سے لیکر انیسویں صدی تک قائم کی وہ معتبر نہیں ہو سکتیں۔ یہ بات مشہور ہے کہ ہر زبان، ہر ملک، ہر زمانے میں خاص خاص تشبیہات مروّج ہوتی ہیں اور ان کا سمجھنا دوسری زبانوں کے بولنے والوں اور دیگر ماحول کے لوگوں کے لئے مشکل ہے۔ پھر نہ تو انجیلوں میں اور نہ رسولوں کے خطوط میں کہیں مسیح کی اس ہزار برس والی بادشاہی کا ذکر ہے۔

مکاشفہ کی کتاب میں غالباً شیطان سے مسیح کی تمام جنگ کا حال تمثیلی طور پر بیان کیا گیا ہے اور اس کی تفصیلات میں سے کسی ایک پر کوئی مسئلہ قائم کرنا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ خاص کر ایسا مسئلہ جس کا اور کہیں کلام الٰہی میں ذکر نہیں۔

(۱) یہ غور طلب بات ہے کہ کسی بڑی کلیسیا نے کبھی اس ہزار برس والی بادشاہی کا مسئلہ اپنے کسی عقائدنامے میں داخل نہیں کیا۔ اکثروں کا عقیدہ یہی

ہے جو انگلکانی کلیسیائے مسائل دین میں مرقوم ہے کہ مسیح آسمان پر چڑھ گیا، اور جب تک کہ آخری روز تمام بنی آدم کی عدالت کرنے نہ آئے گا وہیں جلوس فرما ہے۔ لیکن ہزار برس والی بادشاہی کے ماننے والے کسی قدر تمام کلیسیاؤں میں ملتے ہیں۔

۲۔ اس مسئلہ کے ماننے والے اس کے مطلب پر متفق نہیں۔ بعض کا یہ خیال رہا ہے کہ مسیح دوبارہ آئے گا۔ ایک بار بادشاہی کرنے سے پہلے اور پھر آسمان پر جا کر دوبارہ آئے گا۔ بعض کا یہ عقیدہ ہے، کہ مسیح ایک ہی بار آئے گا۔ بعض بتاتے ہیں کہ مسیح کی یہ بادشاہی آسمانی ہو گی۔ بعض یہ کہ زمین پر ہو گی۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ بادشاہی ہو چکی اور فی زمانہ (غالباً قریب قریب سو برس سے) شیطان پھر کھل گیا (پر کیا وہ اب تک کبھی بندھا رہا ؟)

یہ بات بھی غور طلب ہے کہ یوحنا کی انجیل اور خطوط میں جہاں مسیح کی دوسری آمد کا ذکر ہے اس بادشاہی کا ذکر ہی نہیں (یوحنا۔ ۲۔ ۲۲، ۱۔ یوحنا۔ ۲۔ ۲۸، ۳۔ ۲) ممکن ہے کہ مکاشفہ کا لکھنے والا یوحنا رسول نہ تھا۔ مگر کوئی دوسرا یوحنا۔ بائیبل اس کے بارے میں کچھ نہیں بتاتی۔ پر اس میں شک نہیں معلوم ہوتا کہ یہ تمام مکتوبات ایک شخص سے نکلیں۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ مکاشفہ کے لکھنے والے کا وہ خیال نہ تھا جس کو اس مسئلہ کے ماننے والے سمجھتے ہیں۔

۷۔ آخرت۔ مذکورہ بالا مضمون سے ظاہر ہے کہ آخرت کا وقت یا تاریخ دریافت کرنا ممکن نہیں۔ اکثر وہ لوگ جو پاک کلام کو غور سے نہیں پڑھتے کہتے ہیں کہ چونکہ فی زمانہ بدی بہت بڑھ گئی اور لڑائیاں اور تکلیفیں

بہت ہیں، اس لئے آخرت نزدیک آگئی۔ لیکن (۱) غالباً موجودہ زمانے کی بدی قدیم زمانوں کی بدی سے صرف اس لئے زیادہ معلوم ہوتی ہے کہ اُس کی خبریں فوراً ملتی ہیں اور (۲) دورِ حاضرہ کے سائنس کے سبب سے بُرے آدمی زیادہ نقصان کرسکتے ہیں۔ پر ساتھ ہی اس کے نیکی اور روحانی اور اخلاقی باتوں کی پہچان بھی بڑھ گئی۔ نیز ہمارے خداوند نے فرمایا کہ جب ہم جنگوں وغیرہ کی خبریں اور افواہیں سُنیں تو نہ گھبرائیں اور دھوکا نہ کھائیں !! ان باتوں کا واقع ہونا ضرور ہے لیکن اُس وقت خاتمہ نہ ہوگا" (مرقس ۱۳۔ ۷)

(۱) سائنس کی تعلیم ہے کہ عالمین ابدی نہیں۔ کروڑوں برس کے بعد وہ نوبت آئے گی کہ تمام عالمین میں پھر کسی تبدیلی یعنی کسی نئے واقعہ کا امکان نہ ہوگا۔ اُس وقت سے بہت پہلے یہ دُنیا جس میں ہم رہتے ہیں زندگی کے لائق نہ رہے گی۔ سورج تاریک اور سرد ہوجائے گا۔ اور دنیا کی تمام رقیق اشیاء بلکہ ہوا بھی جم جائیں گی۔

(۲) جیسا خادم اوپر کسی جگہ بیان کرچکا ہے دینِ یہود اور دینِ عیسوی (بلکہ دینِ اسلام بھی) بتلاتے ہیں کہ تواریخ کا خاتمہ ہوگا۔ یہ نہیں کہ یکے بعد دیگرے گردوں جن کو ہندو یگ کہتے ہیں بار بار پھر آئیں گے۔ مسیحی دین کی تعلیم یہ ہے کہ دنیا اور اس کے واقعات کا ایک منزل مقصود ہے اور یہ کہ زمانہ ابدیت میں جذب ہوجائے گا۔ اور یہ اپنے آپ نہ ہوگا، بلکہ خدا اس کو وقوع میں لائے گا۔

(۳) پاک کلام خدا کا یہ مقصد بتاتا ہے کہ تمام دنیا میں اُس کی پہچان

پھیل جائے، تمام آدمی نجات اور عرفان حاصل کریں، اور جو کچھ خدا کی مخالفت کرتا ہے مغلوب ہوجائے (یسعیاہ ۱۱-۹ اتھسلنیکیوں ۲-۴ وغیرہ)۔
خدا نے انسان کو بہت کچھ خود مختاری اور قوتِ ارادی بخشی اور ممکن ہے کہ خود مختار روحیں آخر تک خدا کی مخالفت کرتی رہیں۔ لیکن جیسا اوپر بیان ہوچکا یہ مغلوب ہوں گی۔ پولس رسول نے اس کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ مسیح کی آمد کے بعد "آخرت ہوگی۔ اُس وقت وہ ساری حکومت اور سارا اختیار اور قدرت نیست کرکے بادشاہی کو خدا یعنی باپ کے حوالے کرے گا ...... تاکہ سب میں خدا سب کچھ ہو۔" (ا۔کرنتھیوں۔۱۵-۲۴ اور ۲۸)
۴ سزمانے کا ابدیت میں جذب ہونے سے یہ مراد نہیں کہ پھر کوئی واقعہ وقوع میں نہ آئے گا۔ مگر یہ کہ دنیا کی تواریخ ختم ہوگی۔ زمانہ بھی جیسا ہم اس کو پہچانتے ہیں ختم ہوگا۔ زمانہ کی قیود سے جو خرابیاں اور کمزوری پیدا ہوتی ہیں موقوف ہوجائیں گی۔ خدا کی مرضی پورے طور پر پوری ہوجائے گی۔ جو کوئی خدا کو قادرِ مطلق مانتا ہے، اُس کو ضرور یہ ماننا پڑتا ہے کہ آخرکار خدا کی مرضی پوری ہوگی، اور اس کے تمام مقاصد برآئیں گے۔ تب ساری برائی نیست ہوگی۔ تمام ارواح خدا کے تابع ہوں گی۔ پاک ثالوث بدیہی طور پر ہر شے اور ہر روح پر حکومت کرے گا۔ اور خدا کا جلال، اُس کی قدرت محبت قدوسیت اور حکمت ہر کہیں اور ہر ایک میں ابدالآباد ظاہر ہوگی، اور مانی جائے گی۔"
"اور روح اور دلہن کہتی ہیں آ اور سننے والا بھی کہے آ۔" (مکاشفہ۔۲۲-۱۸)
اے خداوند یسوع اسی طرح سے آ۔ آمین ثم آمین۔